زمامِ ابلقِ ایام در دستِ ہمایوں شد
نویدِ دورِ خوشکامی انیسِ طبعِ موزوں شد

بیادگارِ علامۂ فصیح آنربیل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء ایڈیٹر۔
مولینا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائینٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق مینجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹائل پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔

فہرستِ مضامین بابت ماہ جنوری ۱۹۲۳ء

جلد ۲	حصۂ نثر			حصۂ نظم			نمبر ۱

محمد انور کاتب چوک متی لاہور بیٹھک کاتباں

بزمِ ہمایوں

آج ہمایوں کی سالگرہ ہے! یہ ننھی ہستی جو ایکسال ہُوا حضرتِ ہمایوں مرحوم و مغفور کی علمی و ادبی یادگار بن کر دُنیا کے سامنے آئی تھی، خدا کا شکر ہے کہ آج پھُولتی پھلتی نظر آتی ہے۔ ہر چند والدِ مرحوم کی ہمہ گیر شخصیت اس قابل تھی کہ اُنکی یادگار ایک وسیع پیمانے پر قائم کیجائے جس سے قوم و ملک کو عمومی فوائد حاصل ہوں اور لوگ اُس ترقی و تہذیب کی طرف قدم بڑھائیں جو مرحوم کا مطمحِ نظر تھا لیکن اس کام کے لئے میری محدود قابلیت اور کم ہمتی سدِ راہ تھیں اور چونکہ کچھ نہ کر سکنے سے کچھ نہ کچھ کرنا بہتر سمجھا گیا میں صرف وہی کام کر سکا ہوں جس کے کرنیکا مجھے دلی شوق تھا اور جو والدِ مکرم کے عناصرِ طبع میں صرف ایک لیکن ایک دلکش و نمایاں عنصر کی حیثیت رکھتا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر مرحوم زندہ ہوتے تو اپنے خیالات کی بنا پر ادبی دائرہ میں اس طور سے میری رہنمائی کرتے کہ اس ماہوار رسالے کی شان موجودہ حالت کی نسبت یقینی طور پر زیادہ بلند ہوتی۔ لیکن۔ لیکن مجھے اتنی تسلی ضرور ہے کہ ہر قدم پر میں نے کم ازکم یہ محسوس کرنیکی کوشش کی ہے کہ ہمایوں کی خدمات جنابِ ہمایوں کے احساسات کے خلاف نہ ہوں۔ غلطیاں سرزد ہُوئی ہیں۔ اور بعض اوقات ایسی فروگذاشتیں ہُوئیں جن سے میں جی ہی جی میں شرمندہ بھی ہُوا۔ ہمایوں اتنا بلند پایہ بھی نہیں جتنا میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن خیر جائے تسکین ہے کہ ترقی کی خواہش قائم تو رہی۔ اک اعلٰے معیار پانے کی آرزو بھی رہی اور اُس کے پالینے کے لئے جہاں تک ہوسکا کوششیں بھی کی گئیں ◆

یہ مشہور ہے کہ زبان اظہارِ خیالات کا ذریعہ ہے اور اظہارِ خیالات ہی سے اُس تبادلۂ خیالات کی بنا پڑتی ہے جس پر قوموں اور مُلکوں کی بلکہ انسانیت کی ترقی کا انحصار ہے۔ اس کے برعکس اسی مفید شئے کے غیر مناسب استعمال سے بُرے نتائج بھی مرتب ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا ایک لکھنے والا لکھنے میں جتنی احتیاط بھی کرے کم ہے۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں لوگوں کے دلوں کی کنجیاں ہیں وہ اگر کچھ بھی علمی قابلیت رکھتا ہے تو اُن کے دل پر بُرا یا بھلا اثر کرنا اس کے لئے ایک لازم امر ہے جو بلا ارادہ ظہور میں آتا رہتا ہے۔

حتی المقدور ہمایوں کی کوشش رہی ہے کہ اخلاق سوز خیالات سے بچے، سیرت کو ربط و ضبط دینے والے احساسات دلوں میں پیدا کرے، ایسی باتیں پیش کرے جن سے کوئی نہ کوئی ذہنی یا اخلاقی، قومی یا مُلکی فائدہ حاصل ہوسکے خالص ادبی تحریروں کو بھی اپنے دامن میں جگہ دے، لیکن فقط لفظی ہیر پھیر میں مشرقی جادو کے کرتب ہی نہ دکھاتا ہے

موجودہ سیاسی اُلجھنوں میں گرفتار نہ ہو لیکن یہ بھی نہ ہو کہ تاریخ قدیم و حاضرہ سے ایسے موتی چننا بھی گناہ سمجھے جن کی آب و تاب خوابیدہ قوموں کو اُنکی غفلت و عشرت سے جاگ اُٹھنے کی ترغیب دیا کرتی ہے۔ یہ سمجھے رہے کہ ملکِ ہند ہندوؤں اور مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں، عیسائیوں اور جینیوں سے آباد ہے اور اردو ہندوستان کی مشترک زبان ہے جسے اِن سب کی خواہشات و تصورات کا لحاظ رکھنا اور کسی کے جذبات کو ٹھیس لگانا ملکی مفاد کے خلاف سمجھنا چاہیئے +

ہمایوں کا مطمحِ نظر کسی خاص شعبۂ ادب و فن کے ساتھ وابستہ ہو جانا نہیں بلکہ اک ایسا گلدستۂ ادب آراستہ کرنا ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول اور طرح طرح کی خوشبوئیں ہوں۔ اک ایسا نظامِ عمل تیار کرنا ہے جس سے قلبی تفریح و دماغی ترقی کے ساتھ ساتھ ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا جس قدر آسان معلوم ہوتا ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔ اس سے ممکن ہے کہ قسم قسم کی دلفریبیوں کا اک مجموعہ پیدا ہو یا پھر عامیات کا اک دفترِ بے معنی بن جائے +

جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں ہمایوں کی سعی سعیِ لاحاصل نہیں رہی۔ اہلِ قلم اور اہلِ ہمایوں کی رائیں اس بارے میں تسلی بخش ہیں۔ ہمایوں مقبول ہے اور نہ صرف مقبول ہے بلکہ پڑھنے والے اس کی ترقی میں اک گہری دلچسپی لیتے ہیں جو امر کارکنانِ ہمایوں کے لئے باعثِ صد افتخار رہے +

ہم اُن اہلِ قلم کے ممنون ہیں۔ جو سال بھر ہماری اعانت کا دم بھرتے رہے۔ دُنیائے اُردو کی وہ آوازیں جو ہارہا گنبدِ شہرت سے ٹکرا کر ہندوستان بھر میں پھیل چکی ہیں گذشتہ سال زیادہ تر بزمِ ہمایوں میں سُنائی دیتی رہی ہیں۔ سید سجاد حیدر۔ خواجہ حسن نظامی۔ مرزا محمد سعید۔ ضیاء الدین شمسی۔ جناب بیدرتنا۔ مرزا اعجاز حسین۔ مولانا گرامی۔ ڈاکٹر اقبال۔ شیخ عبدالقادر۔ حضرات بیخود۔ سائل۔ یاس وحشت۔ شوق و طباطبائی۔ ان مشاہیر کی تحریریں گزشتہ سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ ناظرینِ ہمایوں کے سامنے آچکی ہیں۔ حسرت۔ شرر۔ نیرنگ۔ آزاد (مرحوم)۔ چکبست۔ محروم۔ ناظر۔ حشر۔ احسن۔ شرف۔ ریاض۔ عزیز۔ جوش۔ اطہر۔ برق۔ یہ بھی گاہے گاہے اپنے نغموں سے ہمیں دلشاد کرتے رہے ہیں۔ میر افضل علی۔ مرزا احسان احمد۔ منشی پریم چند۔ جناب خلیقی۔ سلطان حیدر صاحب جوش پنڈت شیو نرائن شمیم۔ میاں سر محمد شفیع۔ سر ذوالفقار علی خاں۔ یہ لوگ بھی کبھی کبھی بزمِ ادب کو رونق بخشتے رہے ہیں۔ ہمایوں کو فخر ہے کہ اُس نے بعض ہونہار طلباء مثلاً ہادی حسین۔ عبدالحی صدیقی وغیرہ کی قابلیت کو نمایاں کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی ہے + بعض نیم گمنام ہستیاں جو اپنے اندر نہایت لطیف جوہر پنہاں رکھتی ہیں پہلی بار یا مدت کے بعد نقاب اُٹھا کر ادبی دنیا میں آئی ہیں۔ ان میں میرے دوست میاں عبدالعزیز صاحب

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اور سب اصحاب بھی مساوی طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کی مسیحائی سے ہمایوں زندہ ہے۔ ہمیں قوی اُمید ہے کہ سالِ رواں میں بھی یہ لوگ اور دیگر حضرات ہمایوں کی طرف اپنی گرانبہا توجہ مبذول فرمائیں گے۔

چونکہ ہمایوں اک ماہوار رسالہ ہے۔ اور پبلک کی توجہ فرمائی سے ہر دلعزیز ہو رہا ہے لہٰذا اس میں اتنی گنجایش نہیں کہ ہر مضمون کو آنے پر یا اگلے ہی نمبر میں ضرور شایع کر دے۔ اس لابدی تاخیر کے سبب سے ہمارے بعض مضمون نگار ہم سے ناراض ہیں۔ اور بعض تو علانیہ طور پر برگشتہ ہو کر ہمیں بُرا بھلا کہتے ہیں۔ وہ خدارا بتائیں کہ اس تنگ دامانی کا کیا علاج ہو؟

مقامِ شکر ہے۔ کہ رسالہ وقت پر شائع ہوتا رہا ہے۔ اور کتابت و طباعت کی دشواریاں بھی جوں توں کر کے آسان ہوتی رہیں۔ ڈاک کا انتظام ہمارے بس میں نہیں اور اس سے زیادہ ہم کیا کر سکتے تھے کہ رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں اپنے اوپر دوبارہ بھیجنے کی ذمہ داری عائد کر لیں۔ اس کے متعلق ہم مزید احتیاط کے طریق پر عمل کر رہے ہیں۔ لیکن نہیں کہہ سکتے کہ کہاں تک کامیاب ہونگے۔ بدقسمتی سے بعض مہینوں کے پرچے مثلاً جنوری ستمبر و اکتوبر قطعی طور پر ختم ہو چکے ہیں۔ اور ان کے متعلق ہم کسی طرح خریداروں کے مطالبات کو پورا نہیں کر سکتے۔

گذشتہ سال میں ہمایوں کے نکلنے کے بعد بیسیوں نئے اردو ادبی رسالے جاری کئے گئے ہیں۔ ان نوواردوں میں نگار۔ نقاش اور ہزار داستان ممتاز نظر آتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ رسالوں کی یہ بھرمار اچھی نہیں اور ان میں بہت کم پائدار ہونگے ممکن ہے ایسا ہی ہو کیونکہ ایسا اکثر ہوتا آیا ہے لیکن کیا زبان اردو کی وسعت کا خیال رکھتے ہوئے انہیں حقارت سے انبوہِ کثیر پکارا جا سکتا ہے؟ اردو میں اس وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ دس اچھے رسالے ہونگے۔ اور یہ بھی اپنی مالی حالت کے ہاتھوں نالاں ہی رہتے ہیں۔ پھر قصور کس کا ہے؟ جلد بند ہو جانیوالے جرائد کے بارے میں تو پبلک راستی پر ہے کہ اعتماد جمانے سے پہلے پہلے انہوں نے دم توڑ دیا لیکن سخت جان رسالوں کا کیا حال ہے۔ وہ بھی دوسروں ہی کی طرح بے اعتنائی کا شکار رہتے ہیں۔ حوصلہ شکنی کی وجہ محض پبلک کی بے نیازی اور علمی قدردانی کا قحط ہے جو خاص کر اردو والوں کے ہاں زیادہ نمایاں ہے۔

سخت ضرورت ہے کہ اہلِ ملک اس طرح توجہ کریں کیونکہ ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد میں زبان اردو کو بہت کچھ دخل ہے اور آنے والے وقتوں میں اہلِ ہند اس کمی کو اگر خدانخواستہ یہ کمی پوری نہ ہوئی شدت کے ساتھ محسوس کرینگے۔

بشیر احمد

جہاں نما

دُنیا کدھر جارہی ہے؟ امن وامان کی جانب یا کشت وخون کی طرف؟ کیا دُنیا کا مستقبل اُس کے ماضی سے زیادہ شاندار ہوگا؟ کیا آنیوالا زمانہ گذرے ہوئے وقتوں کی نسبت کم پُرسکون کم بے غرض اور کم صُلح جُو ہوگا؟

وہ لوگ جو یاس پسند ہیں خیال کرتے ہیں کہ حال و مستقبل میں ہماری دنیا کے لئے تباہی ہی تباہی ہے۔ پُرانے وقت اچھے وقت تھے۔ اب وہ باتیں کہاں کہ ایک ہمجنس دوسرے کا ہی خواہ ہو ایک قوم دوسری کی پشت پناہ بنے اور انسانیت مِل جُل کے کام کرنے میں زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو تلاش کرے۔

دُنیا کس حال میں ہے؟ کیا تہذیب کی عمارت منہدم ہونیکو ہے یا کیا تمدن کا قصرِ عالیشان تھوڑی ہی مدت میں آسمان سے باتیں کرنے لگیگا؟ کیا اسکی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہے یا کیا یہ صرف انسانوں کا کمزور ضمیر ہی ہے جو مذہبی دور کی بچی کھچی یادگار بن کر دُنیا کو جرأت کی برکتوں سے محروم کئے دیتا ہے؟

جو لوگ اُمید افزا خیالات کے دلدادہ ہیں کہتے ہیں کہ حال کچھ ہی کیوں نہ ہو مستقبل ہمیشہ بہتر سے بہتر صورت اختیار کرتا رہیگا۔ ظاہرہ خرابی چھپی ہوئی نعمت ہے کہ عالمِ کون و مکان کو منزلِ ارتقا کے مرحلے طے کرا کے اُس کے صحیح مقدر کی طرف لیجا رہی ہے۔ ہر تکلیف کے اندر کوئی نہ کوئی آرام ہر مصیبت کے بطون میں کسی نہ کسی راحت کا موتی مستور ہے۔ دُنیا کبھی مائلِ تنزل نہیں ہوتی کہ اُسکے بعد ترقی اُس کا دامن نہ پکڑلے۔ ہر گرنا اسلئے ہے کہ گرنیوالا اُٹھے اور اُٹھ کر زیادہ توانائی کے ساتھ شاہ راہِ ترقی پر گام زن ہو۔

بیشک دُنیا اگر رہنے کے قابل ہے تو انہیں لوگوں کے لئے، زندگی اگر بسر کرنیکے لائق ہے تو ایسے ہی خیالات کے ساتھ۔ ورنہ زیست سے خودکشی تعمیر سے تخریب اور اُمید افزائی سے یاس انگیزی بدرجہا بہتر ہے!

دُنیا کدھر جارہی ہے؟ بلاشبہ امن و امان کی طرف، لطف و مسرت کی طرف، سکون و اطمینان کی طرف!

تو کیا ہر شخص اور ہر قوم خوش ہے اور مطمئن ہے؟

افراد خوش و خرم ہوں نہ ہوں، قومیں مغموم و مقہور ہوا کریں لیکن یہ اُنکا فطری فرض ہے کہ وہ امن و امان کیلئے لطف و مسرت کیلئے اور سکون و اطمینان کیلئے اپنی امکانی کوشش صرف کردیں۔ زندگی کا صحیح مطمحِ نظر حصول مسرت ہے ایسی مسرت جو زندگی کی سکونت کے لئے بنیاد دخیر پر اپنا رفیع الشان محل تعمیر کرے۔

گذشتہ سال میں دنیا نے کیا کیا؟ تاریخِ کائنات میں ہمارے سالوں کی کچھ حقیقت ہو نہ ہو یہ امر یقینی ہے کہ زیست کا ہر سال نہ صرف ہمارے لئے بلکہ ہماری دنیا کے واسطے اک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گذشتہ سال پر نگاہ دوڑائیے تو عیاں ہو جائیگا کہ جنگِ عظیم کے ختم ہو جانے کے باوجود واقعات کی سرگذشت زیادہ ہی زیادہ دلچسپ ہُوئی جاتی ہے۔

ہمارے اپنے وطن **ہندوستان** میں گذشتہ سال کا شروع اک طوفانِ سیاسی کو پہلو میں لئے ہُوئے ظاہر ہُوا۔ عدم تعاون کی تحریک جس میں حقیقی یا ظاہرہ طور پر مُلک کا بیشتر حصّہ شامل ہو چکا تھا حکومت کے لئے زیادہ خوفناک صورت اختیار کر رہی تھی۔ حکومت نے صلح کا ہاتھ بڑھایا لیکن عدم تعاون والے اُسے ایک فریب کا صلح کہہ کر پیچھے کو ہٹ گئے۔ ملک میں بے چینی پھیلتی گئی۔ رہبرِ تحریک نے اپنے ہی بعض پیرووُں میں آثارِ تشدد کو دیکھ کر تحریک سے دست برداری کا مشورہ دیا۔ حکومت یہ موقع پا کر تحریک پر جھپٹی اور جہاں کہیں شور ش سُنی حُریت پسندوں کے منہ خاک سے بھر دیئے۔ سال کے شروع میں آزادی کا بول بالا تھا اور قریب تھا کہ یہ مہم ایک حد تک سر ہو جائے۔ لیکن سال کے اخیر میں شور و غل بند ہو گیا، مُلک کے شیدائی آپس میں لگے اختلاف کرنے، وفاداروں نے حکومت سے کہا ہم آپ سے یہی تو کہتے تھے + آج اِس ملک میں اک متین و مستقل سیاسی تحریک کی جتنی ضرورت ہے شاید پہلے کبھی نہ تھی!

تُرک شروع میں ایک نہ ٹلنے والی لڑائی میں مصروف تھے۔ یقین کئے ہُوئے تھے کہ غنیم کی پسپائی کا دن قریب ہے لیکن وہ دن ابھی آیا نہ تھا۔ مصطفےٰ کمال تاک میں تھا، اگست کے اخیر میں قوم پرستوں کو لے کر اُٹھا اور غنیم کے قلب پر ٹوٹ پڑا۔ تھوڑے ہی دنوں میں برسوں کے ظلم و ستم کا خاتمہ ہو گیا اور ترکی قوم پھر سے آزادی کی گود میں جھولا جھولنے لگی۔ اس انقلابِ عظیم نے دنیا کی سوئی ہُوئی قوموں کو جگا دیا کہ ہمت کا حامی خدا کیونکر بنتا ہے۔ نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا اور کرتے رہنے سے بہت کچھ سرانجام ہو سکتا ہے مشرق نے مغرب کو یا رُوسی جاپانی جنگ میں پچھاڑا تھا یا اب تُرکی یُونانی جنگ میں پسپا کیا۔ اُس وقت مشرقی ایشیا نے اپنی بیداری کا ثبوت دیا تھا، اب مغربی ایشیا نے اپنی تیاری کا ڈنکا بجا دیا۔ دنیا والے کانپ اُٹھے، یورپ خوف و حیرت سے ایشیا اضطرابِ مسرت سے اپنے گرد و پیش دیکھنے لگا کہ کیا ہونے والا ہے!

رُوس عظیم الجثہ رُوس کو اتحادی ابھی ناتراشیدہ ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ مگر وہ خون میں لتھڑا ہُوا کچھ پروا نہیں کرتا کہ دُنیا کے سرمایہ دار اُس پر آوازے کستے ہیں۔ اسے یہی ضد ہے کہ جب تک ساری متمدن دنیا مجھے اپنے سے زیادہ تمدن یافتہ نہ مان لے میں ایک قدم پیچھے کو نہ ہٹوں گا۔ کہتے ہیں طبقۂ اسفل کے احساسات نے یہاں اک خوفناک صورت اختیار کر لی ہے۔ اس سے یہ ضرور ہوگا کہ اگر دنیا اس رُوٹھے ہُوئے طبقے کو منا سکیگی تو یہ طبقہ دنیا کو کچھ عرصہ کے لئے تباہ و برباد کر دیگا۔ یہ بھی سُنا ہے کہ وہاں اب مسلمانوں کی خاص طور پر خاطر مدارات کی جاتی ہے۔ خدا کی شان کہ وہ سلطنت جو کبھی اسلام کی سخت ترین دشمن تھی آج ٹکڑے ٹکڑے ہوکر اسلامیوں کی جانب داری کا دم بھرتی ہے!

جرمنی عارضی طور پر یورپ کا مُرد علیل بن رہا ہے۔ فرانسیسی انتقامی جذبہ سے بھرے ہُوئے مغلوب غنیم سے اُس کا سارا اثاثہ مانگتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ہمسایہ کی کمزوری اُن کی کمزوری اور اُس کی تباہی اُن کی ہلاکت کا موجب ہوگی۔ اقتصادی تعلقات کے تار جہاں ایک جگہ ڈھیلے ہوئے دوسرے مقامات میں بھی گفت و شنید کا سلسلہ بند ہو جائیگا۔ جرمن سکے کی قیمت مٹی کے ڈھیلے سے زیادہ ارزاں ہو گئی ہے اور نہیں معلوم اس انحطاط کا انجام کیا ہوگا۔ بعضوں کے نزدیک تو جرمنی صرف تاک میں بیٹھی موقع ڈھونڈھ رہی ہے!

آئرلینڈ۔ کو اپنی حکومت تو مل گئی لیکن خانہ جنگیاں دم نہیں لینے دیتیں۔ انتہا پسند کہتے ہیں کہ جو آزادی دشمن کے ہاتھوں سے قبول کی جائے اس میں کبھی برکت نہ ہوگی۔ اجنبی دُور سے تماشا دیکھ رہے ہیں آزادی بڑی نعمت ہے لیکن اس قدر گراں قیمت کہ جب تک مول لینے والا خود نہ بک جائے دام ادا نہیں کر سکتا۔

انگلستان کا حقیقی فرمانروا وہ جو مدت سے اس کی قسمت کو اپنی مضبوط گرفت میں قابو کئے ہوئے تھا چل دیا۔ لائڈ جارج جو فی لفظ ایک پونڈ کے حساب سے اپنی کارستانیوں کی داستان لکھ رہا ہے مشرقِ قریب کے دھکے سے ایسا ڈگمگایا کہ پھر نہ سنبھل سکا۔ اہلِ انگلستان نے قدامت پسندوں کو میدانِ وزارت دے دیا لیکن قابلِ غور ہے کہ انتہا پسند طبقہ اب کی بار پہلے سے بہت زیادہ قوی ہو کر میدان

میں اُترا ہے + ایک ہندی نژاد بھی دارالعلوم میں جا ڈٹا اور اپنے مُلک کے دُکھ درد کی رام کہانی سنانے لگا!

چین خانہ جنگیوں کا شکار ہو رہا ہے۔ کیا یہ در آمد کے مال کی ایک قسط ہے جو کسی بیرونی ہی نے چینیوں کو مصروف رکھنے کے لئے بھجوا دی ہے یا حقیقت میں یہ جمہوری ملک اپنی آزادی اور جمہوریت کی قر پر بھینٹ چڑھ رہا ہے؟

افغانستان دنیا کا وہ بے ساحل اور دور دراز مُلک ہے جس کا نام اُسکے ہمسائے بھی کبھی مشکل سے تھے۔ وہ بھی اُٹھ کر آنکھیں مل رہا ہے اور اپنے نوجوانوں کو مغرب کی طرف نئے علوم کی تحصیل کے۔ مقامِ مسرت ہے کہ وہ اپنی عورتوں کی تعلیم سے بھی غافل نہیں۔ حال ہی میں حکومت افغانیہ نے چند لڑ کے کوئین میری کالج میں بغرضِ تعلیم بھیجا ہے۔ دُنیا واقعی بیدار ہو رہی ہے!

حبشیوں نے باوجود اپنے سیاہ رنگ کے سفید لوگوں کے عین درمیان اپنی ہوئی ہے۔ وہ اپنے حقوق مانگتے ہیں جن میں سب سے زیادہ ہولناک حق حقِ آزادی ہے، آزادی طلبی بھی کتنا متعدی

عورتیں مُلک مُلک میں با اختیار ہوتی جاتی ہیں۔ اب وہ فقط مغربی مردوں کی ناز برداری سے نہیں ہوتیں۔ نرے حسن و عشق کی داستانیں اُنکو مرغوب نہیں ہیں۔ وہ زر اور زور کی طالب ہیں جس سے آدھی دُنیا اُنکی ملکیت شمار ہونے لگے۔ وہ "نصفِ بہتر" بننے کی خواہشمند نہیں رہیں وہ صرف نصفِ کامل ہونے پر مُصر نظر آتی ہیں۔ انگلت کے دارالعلوم میں اور لنڈن کی عدالتوں میں۔ مجلسِ انگورہ کی قومی حکومت میں۔ ممالکِ متحدہ امریکہ کے دفتروں میں ہندوستان کے قومی جلسوں جلوسوں میں یہ نرم طبع ہستیاں اپنی حق طلبی کا اعلان بڑے زور شور کے ساتھ کر اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ دُنیا آزادی کی طرف جلد جلد قدم نہیں بڑھا رہی ہے!!

بشیر احمد

ہمایوں

جلد ۳ جنوری ۱۹۲۳ء نمبر ۱

طلسمِ زندگی

"بس یہی تھی زندگی"؟ بوڑھے انسان نے زندگی کے ساحل پر بیٹھے ہوئے اپنی تمناؤں کی کشتی کو دیکھ کر اک لمبی سانس کھینچی اور یہ بات اُس کے دل کی گہرائیوں سے اِس طرح نکلی جیسے پانی میں کسی شئے کے ڈوب جانے کے بعد چند بلبلے سطح پر پیدا ہوا کرتے ہیں!

شام کا وقت تھا اور اِدھر زندگی کی شام تھی!!

آسمان پر پہلی کا چاند نمودار تھا اور پکھیرو، دور اڑتے ہوئے، اپنے بسیرے کی طرف جا رہے تھے، سورج غروب ہو چکا تھا، ابھی یہ ننھا چاند بھی جو تاریکی کے ابتدائی لمحوں پر اک ہلکی سی کرن ڈالنے کے لئے دنیا میں آیا چھپ جائے گا اور ہر شئے پر گھُپ اندھیرا ہوگا!

بوڑھے کے دل میں بھی اک ننھے سے احساس کی شعاع تھوڑی دیر کے لئے چمکی، اُسکی رنگین جوانی کے دن بیت چکے تھے، ابھی یہ پیری اور اس کے احساس بھی دم توڑ دیں گے اور پھر اُس کی روح اپنے آخری بسیرے کی طرف اڑ چلنے کے لئے اپنے پر کھول دے گی!

"اے زندگی! کیا تو یہی تھی"؟ اُس نے پھر سر ہلا کر کہا، "تو دھوکا ہو نہ ہو لیکن جوانی دھوکا ضرور ہے"!

یہ کہا اور بوڑھا انسان خاموش ہو گیا۔ پھر کوئی بات اُسکے مُنہ سے نہ سُنی گئی۔ بڑھاپا دہ عمر ہے جب

عقلِ سلیم رکھنے والا بجائے زیادہ بولنے کے زیادہ سوچتا ہے اور اپنے گذرے ہوئے شباب کے گفتار و کردار پر غور کرتا ہے +

بوڑھے نے ٹکٹکی لگا کر اُس پانی کی طرف دیکھنا شروع کیا جو کشتی کے کناروں کو چھوڑ رہا تھا۔ اُس کا ساز، وہ رفیقِ مسرت جو ہر صبح و شام تمام عمر اُسکی تمناؤں کا ہمنوا بنا رہا، ہاتھ سے چھوٹ کے نیچے گر پڑا!!

کشتی چلنے کو تھی۔ بوڑھا غمگین و مضمحل تھا لیکن کشتی والے مسرور و شاداں!

یہ صورتیں کون تھیں؟ بوڑھے کے سوا کوئی نہ جانتا تھا کہ یہ کہاں سے آئی ہیں اور کہاں کو جارہی ہیں؟ ہاں کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ صورتیں اُس کے نہاں خانۂ دل سے نکلی ہیں اور اب اُس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمیشہ کے لئے اُس سے رخصت ہو رہی ہیں!

تو کیا وہ چاہتا ہے کہ یہ لوٹ آئیں، باقیماندہ عمر یا کچھ دِنوں اَور اُس کے پاس رہیں؟ کیا وہ یہی چاہتا ہے؟ —— نہیں نہیں! وہ چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے یہ اُسکی نظروں کے سامنے سے دُور ہو جائیں، چلی جائیں جہاں سے اِن کا پھر آنا نہ ہو سکے! کیوں؟ کس لئے؟ ——

اِسی لئے کہ یہ وہ فریب کاریاں ہیں جو جوانی کے مخمور دنوں میں اُس کے دل میں روز و شب تیر اکیں، اُس کی آنکھوں پر پردہ پڑا رہا، وہ سمجھے ہوئے تھا کہ میری نظریں حقیقت کی تصویر کھینچتی ہیں، جو کچھ دیکھتا ہوں وہی دراصل موجود بھی ہے، اُس نے دُنیا کی رنگینیوں سے اپنے جی کو رنگ لیا اور اس رنگ آمیزی کو حُسنِ زندگی سے تعمیر کیا + دُنیا نے خوشیوں کا اِک سلسلہ قائم کر دیا۔ پہلے دھوکے کی صُبح نے اپنا جعلی نُور بکھیرا، پھر تمازت ہُوئی تو عشرت کے بادل نے فضا میں اپنا سائبان پھیلا دیا! بادل پھٹ گیا تو رنگِ مستی کی قوسِ قزح نے آسمان پر اپنا جھولا ڈالا، زندگی کا دِن انہیں رنگ رلیوں میں گذر گیا، مطلع صاف ہُوا تو دیکھا کہ شام ہونے کو ہے، پھر معلوم ہُوا کہ وہ دلفریبیاں فی الحقیقت جوانی کی فریب کاریاں تھیں کہ تھیں کچھ اَور اور نظر آئیں کچھ اَور!!

صحت جو جسمانی طاقت کی شکل میں ظاہر ہُوئی آخر کار سینہ زوری ثابت ہُوئی!

آسائش و آرائش جو صالح بشریت اور تکمیلِ فن کے لباس میں جلوہ گری کرتی تھیں معلوم ہُوا کہ وہ عیش و عشرت تھیں کہ جسم کی فرمانبردار کنیزیں بن کر دراصل اپنے آقا کو سادگی

کے سیدھے رستے سے بھٹکاتی رہیں!

صُورت جو حُسن کے سانچے میں ڈھل کر سامنے آئی محض اک سطحی و اضافی حیثیت رکھتی تھی!

دولت جس کے چمکتے ہوئے سکّوں کی جھنکار نے فرزانوں کو دیوانہ کر دیا وہ سنگ و خشت کے انبار کی طرح اک بے معنی اُفتادگی تھی اور بس!

ترقی نام رکھنے والی دیوی جس کے پُجاری مُلک مُلک میں پائے جاتے تھے کس قدر صریح ثابت امر ہے کہ وہ ہر پھر کے جہاں تھی وہیں رہی!

تسکین کی حقیقت اِس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ کتابِ زندگی کے لمبے لمبے فقروں میں فقط الفاظ کی حرکات میں سکون کا درجہ رکھتی تھی!

عشق کو اہلِ عشق نے زندگی کا کشتی بان کہا تھا، وہ اب زندگی کی فریب کاریوں کی ناؤ کو کھینے والا نظر آیا!

عقل جمع و تفریق کے مختلف طریق ایجاد کرتی رہی لیکن جو دیا گیا تھا اُس میں کچھ گھٹا بڑھا نہ سکی؛ اُس نے حل طلب سوالوں کا جواب اِک ایسے معمے کی صورت میں دیا کہ سُننے والے پہلے سے بھی زیادہ حیران و ششدر رہ گئے!

علم عقل کے بل بُوتے پر کام کرتا تھا، اُس نے صرف عقل کی اُلجھی ہوئی گتھیوں کو جُوں کا تُوں محفوظ رکھا!

خود اعتمادی کبھی خودسری ہوگئی اور کبھی خود بینی و خود نمائی بن کر اپنی ہی موسیقی کے ساتھ رقص کرنے لگی!

مشغولی جسے دُنیا نے "زندگی" پکارا وہ فی الحقیقت غفلت شعاری کا پردہ تھا جو فقط موت ہی کے ہاتھوں سے اُٹھتا ہے!

بشیر احمدؐ

فنِ خطابت

فطرتِ انسانی کو مبداء فیاض نے جو مختلف اور گوناگوں قوتیں عطا کی ہیں، اگرچہ اِن میں سے ہر ایک بجائے خود قدرت کی نیرنگیوں کا اک حیرت انگیز مرقع ہے، تاہم اِنسان کے جبروت و اقتدار کا اصلی منظر اس وقت نظر آتا ہے، جب وہ ایک خطیب کے لباس میں منصۂ عام پر نمودار ہوتا ہے، اور چند لمحوں میں زمین سے آسمان تک آگ لگا دیتا ہے، دُنیا ہمیشہ تلوار کی قوت پر ناز کرتی رہی ہے، اس نے تلوار کے ذریعہ سے بڑی بڑی با جبروت حکومتوں کو ڈھاکر برباد کر دیا ہے، سکندر اور نپولین کی شاندار فتوحات کو تاریخ اب تک حیرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے، لیکن ان فاتحین عظام کا قصر جلالت صرف حوصلہ مند فوجوں کے بل پر قائم تھا، لیکن خطیب ایک فاتح بے سلاح ہے، اس کو اپنی فتوحات کے لئے فوج و عسکر کی ضرورت نہیں، وہ صرف چند پُر جلال فقروں سے قوموں کی تاریخ بدل دیتا ہے، اس کی آنکھیں جب نشۂ خطابت سے مخمور ہو جاتی ہیں تو ایک ایک اشارہ اوامر سلطانی بن جاتا ہے، اس کی زبان جب فخر و غرور کے لہجہ میں آوازۂ حق بلند کرتی ہے۔ تو بڑے بڑے کج کلاہوں کی گردنیں خم ہو جاتی ہیں،

قدیم زمانہ میں فوجی باجے اور بگل نہ تھے، لیکن جب خطبائے عرب رزمگاہ میں رجز پڑھتے ہُوئے نکلتے تھے، تو میدانِ جنگ کا ہر ذرہ مشتعل ہو جاتا تھا، سیزر اعظم کی سطوت وجلال کے سامنے دنیا کی کوئی قوت سر نہیں اُٹھا سکتی تھی، لیکن جب سسرو (Cicero) اسکی مخالفت میں کھڑا ہو جاتا تھا، تو اس کے اقتدار و عظمت کی شاہنشاہی دفعتہً خاک میں مل جاتی تھی، ایک دفعہ سیزر ایک شخص کے قتل کا مصمم ارادہ کر چکا تھا، لیکن سسرو کی پر زور خطابت کے سامنے اس کا غرور و تمرد کامیاب نہ ہو سکا، ناچار سیزر کو چھوڑ دینا پڑا، یہ صرف ڈیماس تھینز (Demos Thenes) کے پُر جوش الفاظ تھے، جنہوں نے تمام یونان کو فلپ (Phillip) فرمانروائے مقدونیہ کے خلاف دفعتہً تیغ بکف کر دیا تھا، فلپ کے سامنے جب اس کی ایک تقریر کا اعادہ کیا گیا، تو اس نے کہا، کہ اگر میں تقریر کے وقت موجود ہوتا، تو میں خود اپنے خلاف تلوار کھینچ

لیتا،" اڈمنڈ برک (Edmond Burke) نے جب ویرن ہیسٹنگس (Warren Hastings) کے مظالم کے خلاف تقریر کرنی شروع کی، تو سامعین کے جذبات کا یہ عالم تھا، کہ ہر شخص کا دل خوف و عبرت سے تھرا رہا تھا، یہاں تک کہ بہت سی لیڈیاں غش کھا گئیں، خود ہیسٹنگس کا بیان تھا کہ تقریر ختم ہونے پر میں نصف گھنٹہ تک حیرت و استعجاب کے عالم میں خطیب کا منہ تکتا رہ گیا، اور مجھکو یہ محسوس ہو رہا تھا، کہ میں دنیا میں سب سے زیادہ گنہگار انسان ہوں" قدیم روم میں سود کا قانون بہت زیادہ سخت تھا، جس کی وجہ سے طبقۂ عوام روز بروز تباہ حال ہوتا جاتا تھا لیکن حکومت کو کچھ پروا نہ تھی، بالاخر ایک دفعہ ایک ضعیف شخص جو اس قانون کا ستم زدہ تھا اُٹھا اور اس موثر پیرائے میں تقریر کی، کہ ارکانِ سلطنت کے دل ہل گئے، اس نے کہا، کہ میں اٹھائیس لڑائیوں میں شریک رہا، لیکن میری تمام جانبازیوں کا صلہ آج مجھکو یہ دیا گیا ہے، کہ چند روپیوں کے لئے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈالدی گئیں ہیں" ان دردناک فقروں کا یہ اثر ہُوا کہ وہ جابرانہ قانون منسوخ ہو گیا، اور وہ اور اس کے تمام ساتھی قید سے آزاد کر دئے گئے،

غرض کسی ملک، کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھو، اس قسم کے واقعات بکثرت ملیں گے، جن سے اندازہ ہوتا ہے، کہ زبان کی قوت تلوار کی قوت سے کسی طرح کم رتبہ نہیں ہے، اگر آج جنرل ہنڈنبرگ کو اس پر ناز ہے، کہ اس کی تلوار دنیا کو آگ اور خون کے سمندر میں جھونک سکتی ہے، تو ابو الکلام کی زبان بھی اس کا دعوے کر سکتی ہے، کہ وہ چشم زدن میں قوموں کا منظرِ حیات بدل سکتی ہے،

عام خیال ہے، کہ تقریر اور خطابت میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن یہ سخت غلطی ہے، ممکن ہے، کہ ایک شخص سلجھے ہوئے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہو، لیکن اس کا انداز بیان خطیبانہ شکوہ سے خالی ہو، موتی لعل نہرو نہایت صاف، سادہ اور شیریں تقریر کر سکتے ہیں، لیکن ابو الکلام کی طرح سامعین کے جذبات پر حکمرانی نہیں کر سکتے، حقیقت یہ ہے، کہ خطابت ایک مستقل فن ہے، جس کے لئے مختلف اوصاف درکار ہیں، ان خصوصیات کی تشریح حسب ذیل عنوانات میں کی جا سکتی ہے،

دُنیا کے مختلف فنون میں کمال پیدا کرنے کے لئے مخصوص قابلیتوں کی ضرورت

ہوتی ہے، ایک فلسفی کو صرف دماغ سے کام لینا پڑتا ہے، ایک شاعر کے لئے صرف قوتِ تخیل کافی ہے، ایک مغنی صرف آواز کے ذریعہ سے سامع کو مسحور کر سکتا ہے، ایک ایکٹر کے لئے صرف حرکات و سکنات کا لحاظ ضروری ہے، لیکن ایک خطیب کو اپنی تمام قوتوں سے کام پڑتا ہے، تخیل، حافظہ، جوش، احساس، منطق، آواز، حرکات و سکنات، وسعت نظر، اصابت رائے وغیرہ ان تمام خصوصیات کا جامع ہونا ایک کامل الفن خطیب کے لئے ضروری ہے، ورنہ اس کی تقریر کامل طور پر مؤثر نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر خطیب کے لئے جسمانی اور دماغی دونوں قسم کی قوتیں درکار ہیں۔

اب ہم اس اجمال کو کسی قدر تفصیل سے لکھتے ہیں،

خطیب کے لئے قوی الجثہ ہونا ضروری ہے۔ خطیب کا اصلی مطمح نظر سامعین کے جذبات کا متاثر کرنا ہے، اس لئے تقریر کو موثر بنانے کے لئے اس کو علاوہ زبان کے دیگر اعضاء و جوارح سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، غرض خطیب کا ہر عضو تقریر کے وقت سرتا پا عمل بن جاتا ہے، اور چونکہ ہر عضو پر ایک خاص زور پڑتا ہے۔ اس لئے اس بار کو برداشت کرنے کے لئے خطیب کا تنومند اور پُر اندام ہونا ضروری ہے، ایک نحیف الجثہ شخص ممکن ہے کہ تھوڑی دیر تک جوش کے ساتھ بول لے، لیکن دیر تک اس کا زور بیان قائم نہیں رہ سکتا، دنیا میں جو بڑے بڑے خطیب گذرے ہیں، وہ عموماً قوی الجثہ ہوتے تھے، برک، فاکس (Fox) نہایت قوی ہیکل اشخاص تھے، یہی وجہ تھی، کہ یہ لوگ گھنٹوں یکساں زور کے ساتھ تقریر کرتے تھے، اور اسی طرح تازہ دم رہتے تھے، میرابو (Merebeu) جسکی ہیبت انگیز آواز سے فرانس کے ایوان حکومت میں زلزلہ پڑ جاتا تھا، نہایت پُر اندام اور تنومند شخص تھا۔ ڈینیل وبسٹر (Daniel Webster) اپنے غیر معمولی قوی کی وجہ سے لوگوں کو اپنی طرف فوراً متوجہ کر لیتا تھا، عرب میں بھی جو اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو عجم کہتا تھا، جسمانی قوت خطیب کے لئے نہایت ضروری خیال کی جاتی تھی، چنانچہ جو خطیب نحیف الجثہ اور کمرو ہوتا تھا، اسکو اہل عرب حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے،

وجاہت صوری۔ علاوہ قوی الجثہ ہونے کے خطیب کے لئے وجاہت صوری

نہایت ضروری شرط ہے، اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ بہت زیادہ حسین یا پری پیکر ہو، بلکہ کم از کم بدمنظر نہ ہو اور وجیہ ہو، سامعین پر وجاہت کا ایک خاص اثر پڑتا ہے، جس سے ایک بدصورت خطیب کی تقریر خالی ہوتی ہے جام سفال بادۂ گلگوں کی لذت میں کوئی فرق پیدا نہیں کرسکتا لیکن بادہ کشوں پر عالم نشاط اسی وقت طاری ہوتا ہے، جب اس آتش سیال کے شرارے کسی ساغر زرنگار کے آغوش میں رقص کرنے لگتے ہیں، لعل و گوہر کی آب و تاب خاک میں بھی مل کر قائم رہتی ہے، لیکن جب تاج شاہانہ میں چمکتے ہیں تو نگاہیں خیرہ ہوجاتی ہیں، اسی طرح ممکن ہے، کہ ایک بدصورت شخص پرزور تقریر کرے اور سامعین اس سے متاثر بھی ہوجائیں، لیکن جب ایک حسین اور وجیہ شخص تقریر کے لئے کھڑا ہوتا ہے، تو زبان کے ساتھ اسکی صورت بھی سحر اندازی کرتی ہے، جس سے اس کی تقریر کا اثر بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے، اور سامعین ہمہ تن محو ہوجاتے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد کی خطیبانہ سحرکاریوں کا ایک بڑا راز ان کی غیر معمولی وجاہت صوری ہے، جس سے سامع کے قلب پر ایک خاص اثر پڑتا ہے، جن لوگوں نے مولانا کی تقریریں سُنی ہیں، وہ اس کا صحیح طور پر اندازہ کرسکتے ہیں، کہ وجاہت صوری خطابت کو کس حد تک مُؤثر بنادیتی ہے،

عرب میں جو خطیب بدمنظر اور کم رو ہوتا تھا، اس کو عموماً لوگ حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، ان کے نزدیک وجاہت صوری خطیب کے لئے بہت ضروری تھی، زمل بن زید نہایت کم رو تھا، اس نے ایکبار جبلۃ النسانی کے سامنے نہایت فصاحت کے ساتھ تقریر کی تو جبلہ نے کہا "شہد اچھا ہے، لیکن برتن اچھا نہیں"[1]

آواز - خطیب کے اظہار خیالات کا خاص ذریعہ آواز ہے، سامعین پر آواز کا مخصوص اثر پڑتا ہے، اس لئے خطیب کی کامیابی کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ اس کی آواز بلند صاف اور موسیقیت سے لبریز ہو، کرخت اور ناہموار نہ ہو، تاکہ جذبات کی نوعیت کے مطابق لب و لہجہ میں بھی تغیر ہوتا رہے، خوشی، رنج، غصہ، استعجاب، غرض ہر قسم کے جذبات کے حدود سے خطیب کو گذرنا ہوتا ہے، اس لئے جیسا موقع ہو اس کے لحاظ سے آواز بھی

[1] اس واقعہ کو میں نے مولانا عبدالسلام ندوی کے ایک مضمون "خطابت العرب" سے لیا ہے جو معارف ستمبر ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا ہے صفحہ ۱۴۹

فوراً بدل جانا چاہیئے ورنہ اس کی تقریر ایک نغمۂ بے آہنگ ہو کر رہ جائیگی، یہی وجہ تھی کہ قدیم زمانہ میں خطباء آواز کی اصلاح و تربیت کا بہت زیادہ لحاظ رکھتے تھے، ڈیماس تھینیز کی آواز کمزور تھی، اور کسی قدر زبان میں لکنت بھی تھی، اس لئے وہ ان عیوب کو رفع کرنے کے لئے مختلف قسم کی تدبیروں میں مصروف رہتا تھا۔ چنانچہ کبھی بولتے وقت منہ میں کنکریاں بھر لیتا، کبھی پہاڑیوں کے نشیب و فراز میں دوڑتا اور بولتا جاتا، کبھی سمندر کے کنارے کھڑا ہو کر طوفان کی شورش میں زور سے چلاتا اور تقریر کرتا، عرب میں بھی بلند آواز خطیبوں کو خاص قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

لارڈ چیتھم Chenhem نے اپنی پر رعب آواز کی بدولت تمام پارلیمنٹ کو اپنے قبضہ اقتدار میں کر لیا تھا، ولیم پٹ (Pitt) اکیس برس کی عمر میں انگلستان کا وزیر اعظم مقرر ہوا تھا، یہ غیر معمولی عظمت و اقتدار محض اس کی پر جلال آواز کا رہین منت تھا، جس سے اس کے مخالفین ہمیشہ تھراتے رہتے تھے برک دماغی قابلیت کے لحاظ سے پٹ سے کہیں زیادہ تھا، لیکن چونکہ اس کی آواز زیادہ خوش آئند نہ تھی، اس لئے بحیثیت خطیب کے اس کا اثر بہت کم پڑتا تھا، وہ جب تقریر کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص شور کر رہا ہے میرابسو کی آواز اس قدر بلند اور پر شکوہ تھی کہ فرانس کے اعیان حکومت لرز اٹھتے تھے، گلیڈسٹون Gladstone کی آواز میں اس قدر موسیقیت تھی، کہ گھنٹوں تقریر کرتا تھا لیکن آواز میں کوئی ناہمواری یا کرختگی پیدا نہیں ہوتی تھی، امریکہ کے خطباء بھی اس وصف میں ممتاز تھے، ہنری کلے Clay کی آواز میں ایک ناممکن البیان سحر تھا، جو فوراً سامعین کے قلوب کو مسخر کر لیتا تھا، "وہ دن جو گذر گئے" ان الفاظ کو وہ اس قدر درد انگیز لہجہ میں ادا کرتا تھا، کہ سننے والوں پر رقت طاری ہو جاتی تھی، ڈیبسٹر (Webster) کی آواز میں غیر معمولی قوت اور زور تھا، چنانچہ ایک تقریر کے دوران میں اس نے "آگے بڑھو" کے فقرے کو اس زور کے ساتھ ادا کیا کہ حاضرین میں سے اکثر اپنی جگہ سے دفعتہً اٹھ کھڑے ہوئے، موجودہ زمانہ میں مسز سیروجنی نائڈو کی خطیبانہ کامیابیوں کا سب سے بڑا راز ان کی آواز ہے، جو سرتاپا موسیقیت سے لبریز ہے مولانا ابو الکلام آزاد کی بھی کامیابی بہت زیادہ ان کی پُرشکوہ آواز کی رہین منت ہے ✦

زور۔ زور در اصل خطابت کی جان ہے، بغیر اس کے خطیب کی تمام صناعیاں بالکل بیکار ہیں، ممکن ہے، کہ ایک تقریر عبارت آرائی، صفائی بیان، اور منطقی استدلالات کے لحاظ سے شاندار اور دلچسپ ہو، لیکن اگر زور سے خالی ہے، تو سامعین پر اس کا نہایت معمولی اثر پڑیگا بخلاف اس کے معمولی اور سطحی خیالات بھی اگر پر زور طریقہ پر ادا کئے جائیں، تو تمام مجمع دفعتہً متاثر ہو جاتا ہے، لارڈ بروہم کی تقریر علمی اور ادبی حیثیت سے ہمیشہ پست ہوتی تھی، لیکن محض اپنے غیر معمولی جوشِ بیان اور زورِ کلام کی بنا پر وہ سامعین کو مرعوب کر لیتا تھا، اور لوگ عموماً اس کو ایک زبردست خطیب کی حیثیت سے دیکھتے تھے، لارڈ چیتھم کی خطابت کا بھی وصف امتیازی یہی تھا، کہ اس کا ایک ایک حرف جوش سے معمور ہوتا تھا، میرابیو کے جوش کا یہ عالم تھا، کہ بولتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا، کہ بجلیوں کا طوفان امنڈا ہوا چلا آرہا ہے،

تقریر میں زور پیدا کرنے کے مختلف ذرائع ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ تمکو بعض خطیب ملیں گے، جو بغیر اشارات وحرکات کے موثر تقریر کر سکتے ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ جب چشم و ابرو کی جنبش، ہاتھ کا اشارہ، شانہ و سر کی حرکت تقریر کے اجزا میں شامل ہو جاتی ہیں، تو کلام کے زور میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، اشارات وحرکات جذبات کے اظہار میں بہت زیادہ معین ہوتے ہیں، ایک مرتبہ ایک جرمن پادری نے دوران وعظ میں اس موثر طریقہ پر اشاروں سے کام لیا، کہ ایک امریکن پادری جو اس مجمع میں موجود تھا، اور جرمن زبان سے ناواقف تھا، بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، یہانتک کہ وہ اس موضوع کو بھی سمجھ گیا جس پر جرمن پادری تقریر کر رہا تھا، چنانچہ جب باہر نکلا، تو دریافت سے معلوم ہوا کہ اس کا قیاس صحیح تھا، قدیم خطبار اشارات وحرکات کو خطابت کا ضروری جزو سمجھتے تھے، کوئن ٹیلین (Quintilene) کا قول ہے کہ اشارہ بہ نسبت آواز کے زیادہ پُر معنی ہوتا ہے، پھر کہتا ہے کہ

"بغیر ہاتھ کے اشاروں کے تقریر یا انداز بیان بالکل کمزور ہوگا، جسم کے دیگر اعضا خطیب کو بولنے میں مدد دیتے ہیں، لیکن ہاتھ خود بولتے ہیں، ہم ان کے ذریعہ سے پوچھتے ہیں، وعدہ کرتے ہیں، بلاتے ہیں، دھمکی دیتے ہیں۔ نفرت کا اظہار کرتے ہیں، خوف دلاتے ہیں، سوال

کرتے ہیں، انکار کرتے ہیں، ہم ان کے ذریعہ سے رنج، خوشی، شبہ، افسوس، اعتدال، کثرت، دقت، تعداد کا اظہار کرتے ہیں، کیا باوجود زبانوں کے اختلاف کے دنیا کی تمام قوتوں اور انسانوں کی یہ مشترک زبان نہیں ہے"

اشارات وحرکات در اصل فطری چیز ہیں، جن سے کوئی خطیب بے نیاز نہیں ہو سکتا خطیب پر جب جوش کا عالم طاری ہوتا ہے، تو اس کے جسم کا ہر جزو دفعتہً متحرک ہو جاتا ہے لیکن اس موقع پر خطیب کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اس کے اشارات وحرکات بالکل فطری معلوم ہوں، یعنی تکلف اور تصنع سے خالی ہوں، ورنہ تقریر کا اثر بہت زیادہ گھٹ جائیگا، کیونکہ مصنوعی اور غیر فطری چیزوں کا اثر بہت کم پڑتا ہے، علاوہ تکلف وتصنع کے خطیب کو افراط وتفریط سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے یعنی نہ بالکل بازیگر بن جائے اور نہ ہمہ تن بُتِ خاموش، بلکہ مقتضائے حال کے مطابق جہاں جہاں ضرورت ہو، اشارات وحرکات سے کام لے، غرض اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ اشارہ زور کلام کا ایک ضروری عنصر ہے، جس سے کم وبیش ہر خطیب کام لیتا ہے ۔

سوالیہ فقروں سے بھی تقریر کا زور بہت بڑھ جاتا ہے، عام بول چال میں بھی جب کسی بات پر خاص زور دینا ہوتا ہے، تو عموماً اس کو سوالیہ شکل میں ادا کرتے ہیں، جس سے سامع پر خاص اثر پڑتا ہے، اسی طرح دورانِ تقریر میں جب خطیب سوالیہ جملوں سے کام لینے لگتا ہے تو اس کی تقریر میں دفعتہً خاص زور پیدا ہو جاتا ہے، اور سامعین ہمہ تن توجہ بن جاتے ہیں، سسرو اور ڈیماس تھینیز عموماً اپنی تقریروں کا آغاز سوالیہ فقروں سے کرتے تھے، فلپ کے خلاف ڈیماس تھینیز اپنی ایک تقریر کا آغاز ان الفاظ میں کرتا ہے،

"کیا تم لوگ ایک دوسرے کے پاس جا کر یہی پوچھتے رہو گے، کہ خبر کیا ہے، کیا اس سے زیادہ اور کوئی تازہ بات ہو سکتی ہے، کہ مقدونیہ سے ایک شخص نے آکر یونان کو اپنا غلام بنالیا ہے"

گریکس (Graichus) اپنی حسرت وبیچارگی کا سماں ان الفاظ میں کھینچتا ہے،

"مجھ غریب اور بیکس کا ٹھکانا کہاں ہے؟ میں کدھر کا رخ کروں؟ دار السلطنت کا؟ لیکن وہاں میرے بھائی کا خون بہ رہا ہے! کیا میں اپنے گھر جاؤں؟ کیا میں وہاں اپنی خستہ حال ماں کو مصروف ماتم نہیں دیکھونگا"

سسرو (Cicero) کا بیان ہے، کہ ان الفاظ کا یہ اثر ہوا کہ گرگیس کے دشمن بھی رو پڑے،
زورِ کلام کا دارومدار بہت کچھ الفاظ کے حسن انتخاب پر بھی ہوتا ہے، یعنی جہانتک ممکن ہو، فقرے مختصر، اور الفاظ جامع و مانع ہوں، نپولین نے بورڈو (Bordeaux) میں صرف پندرہ منٹ تک تقریر کی، لیکن اس قدر بلیغ اور پُرجوش تھی، کہ تمام دنیا اس کے غلغلہ سے گونج اُٹھی، چیتھم ہنری (Henry) اور دیگر خطباء ہمیشہ اختصار کا لحاظ رکھتے تھے، یہی وجہ تھی، کہ ان لوگوں کی تقریریں نہایت پرزور ہوتی تھیں،

تقریر کے طریقۂ آغاز و انجام کا بھی زورِ کلام پر بہت کچھ اثر پڑتا ہے، خطیب جب کھڑا ہو، تو اس کی شکل و شباہت، وضع وقطع، طرز و انداز سے یہ ظاہر ہو، کہ وہ سامعین سے کوئی اہم بات کہنا چاہتا ہے، تقریر کا آغاز نرم لہجہ میں کرنا چاہیئے، کیونکہ اس سے سامعین کی توجہ بہت جلد مبذول ہو جاتی ہے، کچھ لوگوں میں بے شبہ اس کی صلاحیت ہوتی ہے، کہ وہ شروع ہی سے سامعین کے جذبات میں غیر معمولی ہیجان پیدا کر دیتے ہیں، لیکن اس جوش کو آخر تک قائم رکھنا نہایت مشکل ہے، اس لئے مناسب یہ ہے، کہ تقریر کی رفتار کے ساتھ ساتھ جوش میں بھی تدریجی ترقی ہوتی جائے، یہاں تک کہ آخری فقرہ اس قدر بلند اور پرجوش ہو، کہ سامع کا قلب دہل اُٹھے، موجودہ زمانہ میں اس کی بہترین مثال مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت ہے،

اعتماد علی النفس۔ تقریر کے زور اور روانی کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے، کہ خطیب کو اپنے نفس پر اعتماد کامل ہو، یعنی وہ جو کچھ کہے، اس یقین کے ساتھ کہے، کہ لوگوں کو یہ محسوس ہو، کہ اس کی زبان کا ایک ایک حرف صحیح ہے، کیونکہ اگر دوران تقریر میں اس نے اپنی کمزوری محسوس کرلی، تو اس کی زبان میں لغزش آجائیگی، اور خطابت کا سارا زور دفعتہً برباد ہو جائیگا اس بنا پر خطیب کے لئے قادر الکلام اور وسیع النظر ہونا ضروری ہے، کیونکہ بغیر اس کے خطیب کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہوسکتا۔ فخر و غرور بے شبہ بُری چیز ہے، لیکن خطیب کے لئے ایک حد تک زیبا ہے، اس لئے جب وہ تقریر کے لئے کھڑا ہو، تو اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ پورا مجمع اس کی سطح سے فروتر ہے، ورنہ اس پر سامعین کا رعب طاری ہو جائیگا، اور یہی ایک خطیب کی آزمائش کا سب سے زیادہ نازک موقع ہوتا ہے، جہاں بڑے بڑے اربابِ کمال کے پائے ثبات میں لغزش

آجاتی ہے،

تخیل۔ شاعری اور خطابت دو برابر درجہ کی چیزیں ہیں، دونوں کا تعلق جذبات سے ہے، صرف فرق یہ ہے، کہ شاعر صرف اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے، اس کو اس سے غرض نہیں، کہ کوئی اس کا سننے والا بھی ہے، لیکن خطیب دوسروں کے جذبات و احساسات کو برانگیختہ کرتا ہے، اس لئے جس طرح شاعر اپنے خیالات کو موثر بنانے کے لئے قوت تخیل سے کام لیتا ہے، اسی طرح سامعین پر اثر ڈالنے کے لئے خطیب کو اپنے انداز بیان میں تخیل کی رنگ آمیزی کرنی پڑتی ہے، فطرت انسانی کا عام خاصہ ہے، کہ نادر سے نادر بات اگر سادہ اور خشک الفاظ میں کہی جائے، تو اس کا سامع پر بہت کم اثر پڑتا ہے، لیکن اگر انداز بیان لطیف اور موثر ہے، تو وہی سحر معجزہ بن جاتا ہے، اس بنا پر خطیب بغیر تخیل کی سحر کاریوں کے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا، یعنی سامعین کے جذبات کو متاثر نہیں کر سکتا،

ارسطو کا قول ہے، "کہ تشبیہ شاعری کی، اور استعارہ خطیب کی خاص صنعت ہے" استعارات سے کلام میں خاص زور اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے، جو سامع کے قلب کو فوراً مسحور کر لیتی ہے دقیق سے دقیق فلسفیانہ مسائل کو بھی جب خطیب استعارات کا جامہ پہنا دیتا ہے، تو سامع کے قلب میں فوراً اتر جاتے ہیں، اس لئے خطبا، عموماً استعارات سے کام لیتے ہیں، برک اس صنعت کا بادشاہ تھا، اور بعض وقت اس کے استعمال میں حد اعتدال سے متجاوز ہو جاتا تھا، یہی وجہ تھی، کہ اس کی تقریریں عموماً بہت زیادہ دلچسپ اور موثر ہوتی تھیں، اسکو استعارات پر اتنی قدرت تھی، کہ اس کی تقریر سر تا پا شاعری بن جاتی تھی، ڈینیل وبسٹر اور کرن بھی اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے،

اگرچہ رنگینی کلام کے زور میں غیر معمولی اضافہ کر دیتی ہے، لیکن اگر ہر ہر قدم پر اس سے کام لیا جائے، تو تقریر بدمزہ ہو جاتی ہے، خطیب کو تخیل کے جوش میں اس قدر بلند پروازی نہیں کرنی چاہیئے، کہ بالکل نظر سے غائب ہو جائے، اسکو استعارات کے استعمال میں ہمیشہ ذوق صحیح سے کام لینا چاہیئے، یعنی افراط و تفریط سے بچتا رہے، نہ اس کو خشک فلسفی بن جانا چاہیئے اور نہ ہمہ تن شاعر، بلکہ دونوں کا جامع ہو،

احساس۔ احساس دراصل خطابت کی روح رواں ہے، جس کے بغیر خطیب خطیب نہیں ہو سکتا، ممکن ہے، کہ ایک خطیب اپنے زور بیان، منطقی دلائل، اور قوت تخیل کی سحر کاریوں سے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر لے، لیکن اگر اس کا قلب احساس کی آتش فشانیوں سے خالی ہے، تو اس کی تمام تقریر شراب بے کیف کی طرح گداز و اثر سے معرا ہو گی، پھول کسی قدر خوش نما اور باصرہ نواز ہو، لیکن اگر اس میں خوشبو نہیں ہے، تو اس کی ظاہری رنگینی اور لطافت دل و دماغ کو بیخود نہیں بنا سکتی، اسی طرح ایک تقریر علمی اور ادبی حیثیت سے کسی قدر بلند اور شاندار ہو، لیکن اگر اس کا دامن احساس کے شعلوں سے خالی ہے، تو سامعین کے جذبات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی، سامع پر اثر ڈالنے کے لئے ضرور ہے، کہ خود کہنے والا بھی سر تا پا سوز و اثر سے لبریز ہو، ایک واعظ جس کی اخلاقی حالت خود پست اور مبتذل ہے، اگر فضائل اخلاق کی تعلیم کے لئے کھڑا ہو، تو مجمع پر اس کی تلقین و ارشاد کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

اس بنا پر خطیب کے لئے ضروری ہے، کہ وہ جو کچھ کہے، خود اس کو محسوس کرے، کیونکہ جو بات دل سے نکلتی ہے، وہ دل پر اثر کرتی ہے، محض الفاظ کی طلسم بندی سے خطیب سامعین کے قلوب کو اپنا حلقہ بگوش نہیں بنا سکتا، لارڈ مینسفیلڈ (Mansfield) میں تقریباً خطیب کی تمام خصوصیات موجود تھیں، لیکن اس کا قلب گداز و اثر سے خالی تھا، اس لئے وہ بحیثیت خطیب کے بہت زیادہ کامیاب نہ ہو سکا، ایک دن ایک شخص ڈیماس تھینیز کے پاس آیا اور سادہ لہجہ میں کہا "کہ فلاں شخص نے مجھ کو مارا ہے، آپ اس کے خلاف میری وکالت کر دیجئے" چونکہ اس کا لہجہ جوش سے خالی تھا، ڈیماس تھینیز نے کہا "نہیں، تمکو ہرگز کوئی صدمہ نہیں پہنچا ہے" اس پر اس شخص نے جوش میں آ کر آواز بلند کہا "کیا مجھکو اس کے ہاتھوں چوٹ نہیں آئی ہے"، خطیب نے جواب دیا "ہاں، اب تم ایسے شخص کی طرح بولتے ہو، جس کو واقعی صدمہ پہنچا ہے"، غرض سامعین اس وقت تک متاثر نہیں ہو سکتے جب تک ان کو یہ محسوس نہ ہو، کہ خطیب جو کچھ کہہ رہا ہے، خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کہہ رہا ہے، لارڈ ارسکن (Erskine) نے نہایت سچ کہا ہے "کہ خطابت کا اصلی سرچشمہ دل ہے"

لیکن ایک ایسے مجمع کو جس میں مختلف عقائد وخیالات کے لوگ موجود ہوں، متاثر کرنے کے لئے خطیب کے لئے معمولی احساس کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا احساس عام انسانوں کی سطح سے بہت زیادہ بلند، سریع الاشتعال، اور قوی ہونا چاہیئے، تاکہ وہ جس موضوع پر تقریر کرے، ہمہ تن اس کے اثر میں غرق و محو ہو جائے۔ محویت و استغراق کے عالم میں جو باتیں منہ سے نکلتی ہیں۔ ان کا سامع پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔ ڈیماس تھینیز اور سسرو تقریر کرتے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے انگارے برس رہے ہیں، گلیڈسٹون اس جوش کے ساتھ بولتا تھا، کہ لوگوں کو محسوس ہوتا تھا، کہ سمندر میں طوفان آگیا ہے۔ سسرو اپنے ایک خط میں لکھتا ہے" کہ میں اوائل ایام میں اس جوش کے ساتھ بولتا تھا، کہ میری جسمانی حالت بہت کمزور ہو گئی، چنانچہ دو برس تک اصلاح صحت کی غرض سے یونان میں بسر کرنا پڑا، جہاں مختلف قسم کی ورزشیں کیا کرتا تھا، مولانا ابوالکلام کے خطیبانہ اعجاز کا سب سے بڑا راز یہی ہے، کہ ان کو قدرت کی طرف سے غیر معمولی احساس عطا ہُوا ہے، چنانچہ جب ان کی تقریر جوش سے لبریز ہوتی ہے، تو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ بجلیوں کا طوفان امنڈا ہُوا چلا آرہا ہے، اور مخالف سے مخالف کا بھی سر نیاز خم ہو جاتا ہے، خطیب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اپنے زور بیان سے دشمنوں کو بھی اپنا معتقد بنالے، لیکن زبان میں اسی وقت قوت پیدا ہو سکتی ہے، جب دل میں بھی قوت موجود ہو، آگ کے شعلے اسی خطیب کی زبان برسا سکتی ہے، جس کے دل میں احساس کے شعلے بھڑک رہے ہیں،

غرض خطیب کا احساس جس قدر قوی اور بلند ہو گا، اسی قدر اس کی خطابت شاندار اور پُر اثر ہو گی، لیکن اس موقع پر خطیب کے لئے ایک امر خاص لحاظ کے قابل ہے، یعنی انتہائی جوش کی حالت میں بھی خطیب کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیئے، کیونکہ اگر جذبات کے ہجوم و کشمکش سے گھبرا کر اس نے اپنے حواس کھو دئے، تو اس کی تمام شانِ خطابت خاک میں مل جائیگی، متانت، سنجیدگی، وقار، تاثر، تسلسل، خیال، زور بیان، وغیرہ، یہ تمام اوصاف دفعتہً غارت ہو جائینگے، اور خطیب ایک مضحکہ انگیز بیچارگی کی حالت میں مبتلا ہو جائیگا،

ظرافت۔ عوام دیر تک فلسفیانہ اور سنجیدہ گفتگو کو گوارا نہیں کر سکتے، اس لئے

دوران تقریر میں ان کی تفریح دماغ کے لئے کبھی کبھی ظریفانہ فقروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جن سے ان کا تمام تکدر دفعتہً رفع ہو جاتا ہے، اور وہ پھر از سر نو سننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، علاوہ اس کے ظرافت حملہ کرنے کا ایک زبردست آلہ ہے، اور بعض اوقات جواب میں ایک لطیف ظریفانہ فقرہ بڑے بڑے منطقی استدلالات کو دفعتہً خاک میں ملا دیتا ہے، فلاڈلفیا Philadelphia میں ایک مرتبہ عدالت کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں ولیم پرسٹن نے تین دن تک نہایت فصاحت کے ساتھ فلسفیانہ بحث کی، اور جوری (Jury) اور عدالت کو اپنے قبضہ میں کر لیا، مسٹر وڈ (Wood) وکیل فریق ثانی نے اُٹھ کر جواب میں کہا "حضرات! اگر آپ میری گذارش کو سننا قبول فرمائیں، تو آپ لوگ ان بادلوں سے جہاں تین دن تک آپ لوگوں کا قیام رہا ہے، نیچے اُتر آئینگے اور زمین پر چلنے لگینگے" ولیم پرسٹن کی خطیبانہ طلسم کاریوں پر اس فقرے کا یہ اثر ہوا کہ گویا کسی نے جلتی ہوئی آگ پر دفعتہً پانی چھڑک دیا،

دنیا کے اکثر بڑے بڑے خطیبوں کا اقتدار زیادہ تر اسی خصوصیت کا رہین منت تھا، کیننگ (Canning) کے مخالفین بہ نسبت قوت استدلال کے اسکی لطیف ظرافت سے زیادہ خائف رہتے تھے، پٹ محض اپنے پر زور طنزیہ اور ظرافت آمیز فقروں کی وجہ سے اپنے دشمنوں پر ہمیشہ غالب رہتا تھا، صرف چند فقروں میں وہ زبردست سے زبردست مخالف کو ساکت کر دیا کرتا تھا، شیریڈن کی خطابت کا خاص جوہر یہی خصوصیت تھی، یعنی وہ مخالف کی کمزوریوں کو فوراً محسوس کر لیتا تھا اور ان کو نہایت ظرافت آمیز الفاظ میں نمایاں کرتا تھا، یہی وجہ تھی، کہ پٹ بہ نسبت اوروں کے شیریڈن کو زیادہ خطرناک دشمن سمجھتا تھا، حالانکہ اور لوگ علمی حیثیت سے شیریڈن سے کہیں زیادہ افضل تھے، برک، فاکس، پٹ وغیرہ لارڈ نارتھ کے شدید ترین دشمن تھے، لیکن محض اپنے بلیغ ظریفانہ فقروں کی بدولت وہ ہمیشہ ان سب کے مقابلہ میں کامیاب رہتا تھا، لارڈ بیکنس فیلڈ (Baconsfield) کو اس فن میں خاص کمال حاصل تھا، چنانچہ اس کے طنزیہ فقرے اس قدر زبردست ہوتے تھے، کہ مخالفین کے حق میں تیر و نشتر کا کام دیتے تھے،

غرض اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ ظرافت سے خطیب کو اپنی تقریر کے موثر بنانے میں خاص مدد ملتی ہے، لیکن خطیب کو حد اعتدال سے متجاوز نہ ہونا چاہیئے، ورنہ اس کی خطابت

کا اثر زائل ہو جائیگا،

اخلاق۔ یہ صحیح ہے کہ خطیب کے لئے خوش اخلاق ہونا ضروری نہیں ہے، اکثر افراد ایسے ملینگے جو باوجود اخلاقی پستی کے پُرزور تقریر کر سکتے ہیں، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ خطیب کے ذاتی اخلاق وعادات کا سامعین پر ایک خاص اثر پڑتا ہے، ایک رند اوباش اگر ترک شراب کی تعلیم دے، تو کوئی شخص اس کی پیروی پر آمادہ نہیں ہو سکتا، بخلاف اسکے ایک متقی جب لوگوں کو فضائل اخلاق کی طرف مدعو کرتا ہے، تو اس کا ایک ایک حرف لعل وگوہر سے زیادہ گراں ارز ہوتا ہے، اس بنا پر خطیب اگر چاہتا ہے، کہ لوگ اس کی تلقین وتعلیم کی پیروی کریں، تو ضروری ہے کہ اس کا طریقِ عمل ایسا ہو، کہ عوام اسکو مخلص اور ایماندار سمجھتے ہوں، کیونکہ اگر سامعین کو یہ معلوم ہے، کہ خطیب جو کچھ کہہ رہا ہے، خود اس پر عامل نہیں ہے، تو اسکا اثر بہت کم پڑیگا، فاکس (Fox) خطابت کے تمام اوصاف کا جامع تھا، لیکن چونکہ اس کی اخلاقی حالت نہایت پست اور بتذل تھی، اس لئے عوام کو اس کے قول پر اعتبار نہیں تھا، چنانچہ جب وہ تقریر کرتا تھا، تو لوگوں کے دل میں دفعتہً یہ خیال آجاتا تھا، کہ یہ وہی شخص ہے، جو رات رات بھر قماربازی اور میخواری میں صرف کر دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا، کہ اس کی تمام خطیبانہ جدوجہد بیکار ہو جاتی تھی، یہی وجہ تھی، کہ بارہا اس نے وزارت کی کوشش کی، لیکن ہمیشہ ناکام رہا، بجز چند احباب خاص کے ملک و قوم نے کبھی اس کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا، بخلاف اسکے پٹ اپنی اخلاقی پاکیزگی کی وجہ سے تمام ملک پر حکومت کرتا تھا، اور لوگ اس کی تقریروں کو خاص توجہ اور احترام کے ساتھ سنتے تھے، شیریڈن کے متعلق خیال تھا، کہ اگر اس کی اخلاقی حالت قابل اعتبار ہوتی، تو وہ دنیا پر حکومت کرتا، لیکن چونکہ اس کے قول وفعل میں باہم تضاد تھا، اس لئے اس کو سیاسیات میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوئی، بخلاف اس کے واشنگٹن (Washington) خطابت کے فن سے بہت کم واقف تھا، تاہم اپنے اخلاقی محاسن کی وجہ سے امریکہ کی کانگرس پر اس قدر اثر رکھتا تھا، کہ جب وہ چند بلیغ فقروں میں اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا، تو بڑے بڑے بولنے والے خاموش ہو جاتے تھے،

مشق وتعلیم۔ جس طرح ایک شخص جس میں شاعری کی فطری صلاحیت نہیں ہے،

محض فن عروض پڑھ کر شاعر نہیں بن سکتا، اسی طرح ایک شخص جو فطرۃً خطیب نہیں ہے محض مشق و تعلیم سے سامعین کے جذبات پر حکمرانی نہیں کر سکتا، تاہم فن خطابت مشق و تربیت سے بالکل بے نیاز نہیں ہے، سب سے پہلے خطیب کے لئے ضروری ہے، کہ اس کو زبان پر کامل قدرت حاصل ہو، تاکہ وہ اپنے خیالات کو جس طرح چاہے، ظاہر کر سکے، لیکن یہ قدرت عطیۂ الٰہی نہیں ہے بلکہ صرف غور و فکر، اور مطالعہ کتب سے حاصل ہو سکتی ہے، اس بنا پر خطیب کو بہترین انشاپردازوں اور شاعروں کے کلام کا ہمیشہ مطالعہ کرتے رہنا چاہیئے، اس سے خطیب کے دماغ میں مختلف قسم کے خیالات اور الفاظ کا ایک غیر معمولی ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے، جس سے اس کو تقریر میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے، ولیم پٹ نے یونان، روم اور انگلستان کے شعرا کا کلام نہایت غور کے ساتھ پڑھا تھا، شیکسپیئر کے بہترین ٹکڑے اس کو زبانی یاد تھے، فاکس یونان و روم کے قدیم شعرا کا نہایت دلدادہ تھا، چنانچہ مرتے وقت تک اس نے ہومر اور ورجل کا ساتھ نہیں چھوڑا، برک کی تقریروں میں اکثر ورجل اور ملٹن کے لطیف شاعرانہ خیالات کی جھلک نظر آتی ہے، ارسکن نے دو برس تک مسلسل لٹریچر کا مطالعہ کیا تھا، یہی وجہ تھی، کہ وہ نہایت شستہ اور لطیف انگریزی بولتا تھا،

علاوہ اس کے ترجمہ سے خطیب کو خیالات کی ترقی میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے، یعنی خطیب کو چاہیئے، کہ وہ وقتاً فوقتاً غیر زبان کی بہترین ادبی تصانیف کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا کرے، اس سے خطیب کی معلومات کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو جاتا ہے، سینکڑوں نئے نئے الفاظ نئی نئی ترکیبوں، نئے نئے خیالات، نئی نئی تشبیہوں، اور استعاروں کا ایک معتدبہ ذخیرہ خطیب کو ہاتھ آجاتا ہے، جس سے خطیب کو برجستہ بولنے میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے، چیتھم ہمیشہ ڈیماستھنیز کے خطبات کو انگریزی میں منتقل کرتا رہتا تھا، اس کا بیٹا ولیم پٹ بھی اس اصول پر شدت سے کاربند تھا، یہ اسی مشق کا اثر تھا، کہ پٹ کو تقریر کے وقت الفاظ کی تلاش کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی تھی، چنانچہ وہ اکثر بلا کسی تیاری کے گھنٹوں تقریر کرتا تھا، لارڈ چسٹرفیلڈ (Chesterfield) اکثر انگریزی سے فرنچ میں اور فرنچ سے انگریزی میں ترجمہ کیا کرتا تھا، جس کی وجہ سے اس کے انداز بیان میں ایک خاص ادبی لطافت پیدا ہو گئی تھی، لارڈ مینفیلڈ (Mansfield) نے سسرو کے تمام خطبات کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا تھا۔ لارڈ بروہم (Brougham) بھی

ترجمہ کا بہت زیادہ شایق تھا،

علاوہ ترجمہ کے خطیب کو مضمون نگاری سے بھی خاص طور پر کام لینا چاہیئے، اس سے الفاظ کے انتخاب، فقروں کے دروبست، اور خیالات کی ترتیب میں خاص مدد ملتی ہے، چنانچہ جو خطیب اس مشق کو جاری رکھتا ہے، اگر اس کو کبھی برجستہ بولنے کی نوبت آجاتی ہے، تو وہ اسی ادبی لطافت کے ساتھ بول سکتا ہے، جو ایک تیار شدہ تقریر میں موجود ہوتی ہے، یہ صرف انشا پردازی کا فیض ہے، کہ مولانا ابوالکلام کی برجستہ تقریریں بھی لٹریچر کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں، علاوہ مضمون نگاری کے خطیب کو چاہیئے، کہ وہ دنیا کے مشہور ترین خطیبوں کے خطبات کا مطالعہ کیا کرے، اور کبھی کبھی زندہ خطیبوں کی تقریریں بھی سنتا رہے، اس سے انداز بیان میں خطیبانہ شان پیدا ہوجاتی ہے،

اگرچہ فی البدیہہ تقریر کرنا خطیب کا بہت بڑا کمال ہے، تاہم خطیب کے لئے تیاری ایک حد تک ضروری ہے، لیکن اس تیاری سے یہ مطلب نہیں، کہ پہلے سے پوری تقریر لکھ کر زبانی یاد کرلے، بلکہ خطیب کو چاہیئے کہ بولنے سے پہلے اپنے موضوع پر ہر حیثیت سے غور و فکر کرلے، اس سے تسلسل خیال کے قیام میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے، دنیا کے اکثر بڑے بڑے خطیب ہمیشہ پہلے سے تیار ہوکر آتے تھے، شیریڈن، پٹ، کیننگ وغیرہ علاوہ غور و فکر کے تقریر کا زیادہ حصہ لکھ بھی لیا کرتے تھے، ہمارے نزدیک یہ کوئی عیب نہیں ہے، کیونکہ ایک شخص جو پہلے سے تیار ہوکر بولتا ہے، اس پر کبھی مجمع کا خوف طاری نہیں ہوسکتا، اور یہی ایک ایسی کمزوری ہے، جو خطابت کو دفعتہً خاک میں ملا دیتی ہے +

مرزا احسان احمد بی۔ اے
(علیگ)

اُردو شاعری اور بلینک ورس

بڑی بڑی علمی زبانوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود دامن دراز ہونے کے ان کی شاعری تمام غیر ضروری قیود سے آزاد ہے۔ نتیجتہً یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان زبانوں کی شاعری ہر قسم کے علوم و فنون کے جواہرات کی کان ہے۔ ان زبانوں کے شاعر اپنے فطری جذبات کو نظم کے سانچے میں ڈھالتے ہیں تو انکا رہوار طبع کہیں سکندری نہیں کھاتا۔ قید وزن اور چند معمولی شرطوں کے سوا کوئی پابندی ان کی آزادانہ پرواز کے لئے مانع نہیں ہوتی، عربی زبان ہی کو لیجئے جس کے بحر بیکراں میں مترادف الفاظ کے ذخیرے کے ذخیرے نظر پڑینگے جس میں صرف شراب کے لئے ایک ہزار الفاظ ہیں۔ گھوڑے اور شیر کے پان پانسو نام ہیں، تلوار اور اونٹ کے واسطے سینکڑوں لفظ استعمال ہوتے ہیں، جس کی پہنائی و وسعت کا اندازہ واصل[1] بن عطا غزال کے واقعہ سے ہوسکتا ہے۔ جو ثقل زبان کی وجہ سے حرف را کو ادا کرنے پر قادر نہ تھا، اور ایک خاص عقیدہ کا حامی ہونے کے سبب اسے مخالفین سے مناظرے کرنے پڑتے تھے، لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی غرض سے لیکچر دینے ہوتے تھے۔ چونکہ رے کے صحیح تلفظ پر قدرت نہ رکھتا تھا، ضروری کو ضروزی۔ افراط کو افزاط یعنے رے کو زے اور ذال کے تلفظ میں ادا کرتا تھا۔ اور یہ نقص تلفظ مضحکہ انگیز ہونے کے سبب اس کی تقریروں کے اثر میں خلل انداز ہوتا تھا اس لئے وہ اپنی تقریریں تمام اُن الفاظ کو جو ذوات الرا ہیں چھوڑ کر ان کی بجائے اُن کے ہم معنی الفاظ استعمال کرتا تھا۔ مترادف الفاظ کی کثرت اس کے عیب تلفظ کی پردہ دار بن جاتی تھی۔

عربی زبان کی غیر معمولی وسعت، اس کے مترادفات کی حیرت خیز بہتات کو دیکھ کر ذرا اس کی آزاد شاعری پر بھی نظر ڈالئے۔ عربی شاعر آپکو شش جہت پرواز نظر آئیگا، اسکی خیال آفرینی فن کی غیر ضروری پابندیوں سے آزاد ہے، وہ جو چاہتا ہے کہہ سکتا ہے، جدھر چاہتا

[1] البیان والتبیین للجاحظ البصری

ہے خیالات کے پر لگا کر اُڑ سکتا ہے، فنِ شعر کے حدود اُس کے سدِ راہ نہیں ہوتے۔ ملاحظہ ہو

"لعمری لرھط المرأ خیرُ بقیۃً　　علیہ وان عالوا بہ کل مرکب
من الجانب الاقصیٰ وان کان ذا غنیً　　جزیل ولم یخبرک مثل مجرب"

پہلے شعر کے مصرعۂ اولے میں لفظ "خیر" ہے لیکن اس کا صلہ دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "من الجانب الاقصیٰ" استعمال ہُوا ہے، اردو اس آزادی کو اس مضحکہ انگیز صورت میں پیش کریگی۔　　اپنے اچھے ہیں رحم و الفت میں + تجھپہ۔ وہ گرچہ سخت گیر بھی ہوں۔
اجنبیوں سے گو ہوں دولتمند ــــــ

اصل فقرہ اتنا تھا کہ تجھ پر رحم کرنے میں اپنے دولتمند غیروں سے بہتر ہیں ــــ
عربی الفاظ کے معمور خزانوں کو دیکھ کر عربی شاعری کی اس آزادی پر بھی نظر ڈالئے۔
عبدالقیس ابن خفاف کہتا ہے۔

واصبحت عددت للنائبا　　تِ عرضاً بریّاً وعضباً صقیلاً"

"نائبات" کا لفظ پہلے مصرعہ میں سما نہیں سکتا تھا اس لئے اسکے پہلے پانچ حرف مصرعۂ اول میں رکھدیئے اور "تِ" کو دوسرے مصرعہ میں لاکر وزن کو پورا کر دیا۔ "لسان الغیب ہوشیار پوری" کے تتبع میں یہ آزادی اردو میں برتی جائے تو سلطان حیدر جوش اور عظمت اللہ خاں دہلوی نقیب کے صفحات کو زعفران زار بنا دینگے مثلاً

"بڑا انصاف والا ہے وہ اور مُن　　صفی اس کی ہے دنیا بھر میں مشہور"

اسی کے ساتھ عربی میں الفاظ کی ہم قافیگی کے چند نمونے بھی ملاحظہ کیجئے۔

نجذ روسہم من غیر برٍّ　　فما یدرون ما ذا یتّقونا
ونحن اذا عماد الحیّ خرت　　علی الاحفاض نمنع من یلینا

یتّقون اور یلین ہم قافیہ ہیں ــــ

رسا اصلہُ تحت الثریٰ وسما بہٖ　　الی النجم فرعٌ لا ینال طویلُ
علونا الی خیر الظہور وحطّنا　　لوقتٍ الی خیر البطون نزولُ

طویل اور نزول ہم قافیہ لائے گئے ہیں۔ اسی طرح کبیر کا قافیہ ظہور۔ عمرو کا دعر ضعیف

کا علوف۔ اربع کا تمتع لایا جاتا ہے۔ ہمقافیگی کی اس رعایت کے ساتھ اگر ذیل کے اشعار بھی پیش نظر رکھے جائیں جو کسی شاعر نے ہجو ملیح کے طور پر اوتامش الترکی کے سیکرٹری شجاع ابن القاسم کی شان میں کہے ہیں تو پھر عربی شاعری میں غیر مقفّیٰ نظموں کا جواز بھی ثابت ہو جائیگا

شجاعٌ لجاعٌ کاتبٌ لاتبٌ معًا — کجلمودِ صخرٍ حطّہ السیل من علٍ
خمیصٌ لمیصٌ مستمرٌ مقدمٌ — کثیرٌ اثیرٌ ذو شمالٍ مھذبُ
فطینٌ لطینٌ آمرٌ لک زاجرٌ — حصیفٌ لصیفٌ حین یخبر یعلمُ
بلیغٌ لبیغٌ کلما شئت قلتہ — لدیہ وان تسکت عن القول یسکتِ
ادیبٌ لبیبٌ فیہ عقلٌ وحکمۃٌ — علیمٌ بشعری حین انشد یشھد
کریمٌ حلیمٌ قابضٌ متباسطٌ — اذا جئتہ یومًا الی البذل یسمحُ

الاقتضاب - شرح ادب الکتاب

بیروت

لابن السید البطلیوسی (۲۸)

عربی شاعری سے قطع نظر انگلش پوئٹری میں بلینک ورس (بے قافیہ نظم) کا رواج ہی اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ اس زبان کی نظم بھی سرمایہ دار ہونے کے باوجود غیر ضروری پابندیوں سے آزاد ہے۔ انگلش پوئٹری میں قافیہ کا استعمال ہے بھی تو عربی نظم کی طرح معمولی پابندیوں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اس میں۔ سن (سورج) کا قافیہ گوان (گیا) اور فیئر (اچھا) کا قافیہ آر (ہیں) پٹ کانٹ۔ لارڈ کا ورڈ لا سکتے ہیں۔

سنسکرت جو دنیا کی سب سے زیادہ وسیع زبان تسلیم کیجاتی ہے۔ اس میں انتیا نوپراس (قافیہ) کا کسی نظم میں ہونا پدیہ (نظم) کے بہت سے النکاروں (خوبیوں) میں سے ایک النکار ہے[1] یعنی سنسکرت کی شاعری میں قافیہ والی نظم نظم کی بے شمار قسموں میں سے ایک قسم ہے۔ سنسکرت میں بہت سی نظمیں بے قافیہ

[1] گویا قافیہ آرائی منجملہ صنائع و بدائع ایک صنعت ہے۔ ضروری نہیں۔

ہیں۔ رگ وید اور سام وید تمام کی تمام یجروید اور اتھروید کا اکثر حصہ بلینک ورس ہیں ہے۔
غرضیکہ دنیا کی وسیع سے وسیع اور مشہور سے مشہور علمی زبانوں کی شاعری باوجود لغات کی بیکرانی کے غیر محدود اور غیر واجبی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس میں قافیہ یا تو سرے سے ضروری ہی نہیں اور اگر ضروری ہے تو ہم قافیگی کی شرائط حوصلہ شکن نہیں ہیں اور اسی وجہ سے ان زبانوں کی شاعری علوم وفنون سے لبریز نظر آتی ہے۔
اب ذرا اردو کی بے بضاعتی پر نظر ڈالئے کہ علوم وفنون کے ذخیرہ سے محروم ہے کہ کم مایہ ہے، مضامین علمیہ کو اپنے دامن میں نہیں لے سکتی کہ دامن ہی نہیں رکھتی۔ اسکی جمع پونجی چند ہزار الفاظ ہیں اور بس۔ پھر ایسی محدود زبان کی نظم ہی کیا ہوگی۔ اس پر طرّہ یہ کہ فارسی کی دیکھا دیکھی اس کی شاعری کو بے شمار قیود سے جکڑ دیا گیا۔ قافیہ کی پابندی اس پر الفاظ کی ہمقافیگی کی غیر محدود شرائط۔ ان غیر ضروری پابندیوں نے نظم اردو کو پھولنے پھلنے نہیں دیا اور جب تک یہ حدود قائم ہیں اردو شاعری کبھی علمی زبانوں کی مفید شاعری سے آنکھ نہیں ملا سکے گی۔
قافیہ طرازی عربی میں بھی ہے۔ لیکن اول تو زبان کی گراںمایگی کی وجہ سے عربی شاعر اپنے کسی خیال کو بھی قافیہ کی وجہ سے قربان نہیں کرتا، دوسرے یہ کہ باوجود وسعت زبان اور کثرت مترادفات کے عربی نظم میں ہمقافیگی کی شرطیں حوصلہ شکن نہیں ہیں۔ چنانچہ عمرو کا دعر، ضعیف کا علوف، کبیر کا ظہور، اربع کا تمتع قافیہ لایا جاسکتا ہے۔ ایک ہماری اردو ہے کہ تہی دست ہونے کے باوجود اس کی تعزیرات نظم تعزیرات ہند سے زیادہ سخت گیر ہیں۔
اُردو شاعر جانتے ہیں کہ انہیں قافیہ آرائی میں خون اور پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ قافیہ کی غیر محدود وغیر ضروری شرطوں کی وجہ سے اکثر اوقات بہتر سے بہتر خیال، دلکش سے دلکش جذبے کو اپنے حوصلہ کے ساتھ صرف اس لئے دفن کردینا پڑتا ہے کہ جبر کا قافیہ صبر آتا ہے مگر صبر کا لفظ شاعر کے خیال کو ادا نہیں کرتا۔ اور قہر کا لفظ خیال کو ادا کرتا ہے۔ مگر قہر جبر کا ہمقافیہ نہیں ہے۔ کسی نظم میں شاعری کافری کے قافیوں کے ساتھ دلبری وافسونگری کو قافیہ بنانے سے اگر آپ کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات ادا کرسکتے ہیں تو آپکو ہرگز اجازت نہ ملیگی۔ گدائی اور شاہی کو اگر بھولے سے کہیں ہمقافیہ بنانے کا ارتکاب ہوا ہے۔ تو اگرچہ وہ نظم باعتبار حسن معنی عقد ثریا نثار کرنے کے

قابل ہو۔ علوِ جذبات میں فلک الافلاک سے پہلو مارتی ہو مگر اردو شاعری کے دربار سے یہی حکم صادر ہو گا کہ نظم کو داخل دفتر کرکے شاعر کو شہر سے بارہ پتھر باہر کردو ۔۔۔۔

یہ غیر ضروری پابندیاں اردو شاعری کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہی ہیں۔ بہت سی خیال آفرین طبیعتیں ان قیود وحدود سے گھبرا کر حوصلہ ہار چکی ہیں۔ اردو نظم کا خزانہ علوم وفنون کے لئے جواہرات کی بجائے زلف وخال کے خزف ریزوں سے پُر ہو رہا ہے۔ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ زندہ زبانوں کی ترقی یافتہ اور گرانبہا شاعری کو دیکھ کر اپنا مذاق بدل چکا ہے، اور اردو نظم کو اپنے ذوق کے مطابق نہ پا کر اردو شاعری اور اردو زبان سے مایوس ہو رہا ہے۔ یہ حالت ناقابلِ رشک ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر ادب دوست اپنی استعداد کے مطابق اردو زبان کو اک زندہ زبان بنانے کی کوشش کرے۔ اردو شاعری کو زندہ اقوام کی شاعری کے سانچے میں ڈھالا جائے ۔۔۔۔

اردو نظم ونثر کی اصلاح کے متعلق میرا آئندہ پروگرام حسبِ ذیل ہے:۔

۱۔ اردو سے عربی وسنسکرت کے ثقیل الفاظ نکال کر اسے عام فہم ہندی نما زبان بنانا۔

۲۔ آئندہ عام ہندوستانی زبان کے مطابق گریمر تیار کرنا۔

۳۔ اردو نظم میں بلینک ورس کو رواج دینا اسی کے ساتھ مقفّٰی نظموں میں ہمقافیگی کی پابندیوں کو کم کرنا۔

۴۔ اردو نظم کو ہندی وزنوں میں منتقل کرنا۔

۵۔ اردو نظم کا محبوبِ مخاطب مرد کی بجائے عورت کو قرار دینا۔

۶۔ اردو نظم میں لیلی ومجنوں، رستم وسہراب، نرگس وبلبل کی بجائے ہندی مضامین۔ ہندی خیالات اور ہندوستانی واقعات کو بیان کرنا۔

دفعات ۱ و ۲ و ۴ و ۵ کے متعلق ایک سال ہُوا ہمایوں کے صفحات میں سرسری طور پر اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ آئندہ میں مع اپنے ہمخیال دوستوں کے اِن اصلاحات کو عملی طور پر ملک میں رائج کرنا چاہتا ہوں۔ ”انجمن اربابِ علم پنجاب“ کے گرانقدر جلسے اور ہمایوں و بندے ماترم کے زریں صفحات اصلاحی تحریکوں کو رواج دینے میں ہماری مدد کرینگے ۔

اس مضمون کو اُردو نظم میں بلینک ورس کی ترویج کے متعلق ایک تجویز کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ "انجمن ارباب علم پنجاب" کے گذشتہ عظیم الشان ادبی جلسہ میں یہ تجویز پیش کر چکا ہوں۔ اس پر اہلِ قلم کی تائیدی رائوں کے ساتھ اس تجویز کے مخالفین کی جانب سے کچھ اعتراض بھی پہنچے ہیں۔ میں ان سطور میں انہیں اعتراضات کا جواب دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ اردو نظم میں بلینک ورس کی ضرورت کیا ہے؟

اس کا جواب انجمن کے جلسہ میں دے چکا ہوں۔ اور اس مضمون میں بھی آچکا ہے اردو کو آپ ۳۲ کروڑ کے برّاعظم کی مشترکہ زبان تسلیم کرتے ہیں دوسرے لفظوں میں اسکا مطلب یہ ہُوا کہ اردو اپنے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے اس وقت دنیا کی سب سے بلند پایہ زبان ہے۔ تو کیا دنیا کی اس سب سے بڑی زبان (جو تہی مائیگی اور قلاشی میں بھی دنیا کی غالباً تمام زبانوں سے سبقت لے گئی ہے) اس مجموعۂ چند ہزار الفاظ کی شاعری اس کی متحمل ہو سکتی ہے کہ اسے قافیہ اور اس کی بے شمار شرائط کی زنجیروں سے جکڑ کے بے حس و حرکت بنا دیا جائے۔ یا وہ اگر آپ کے خیال میں متحمل ہو چکی ہے تو کیا اس کی مستحق ہے کہ اس کی کم مائیگی کو نظر انداز کر کے دوسری وسیع الذیل اور سرمایہ دار زبانوں (عربی۔ سنسکرت۔ انگلش وغیرہ) کی آزاد شاعری سے اسے مستفید نہ کیا جائے۔

۲۔ یہ مغرب پرستی ہے مشرقی زبانوں میں بلینک ورس کی ترویج مغربیت کی ترویج ہو گی، یہ اعتراض ایک ایسے شاعر کی جانب سے ہُوا ہے جو مذہبی عالم بھی ہیں۔ مجھے اس پر اپنے ایامِ طالب علمی کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ طالب علمانہ زندگی میں مَیں اپنے کمرے میں صفائی کا زیادہ خیال رکھا کرتا تھا۔ عموماً جمعہ کہ وہ تعطیل کا دن ہوتا ہے کمرے کی صفائی کا دن ہوتا تھا ایک دن میں حسبِ معمول کمرے کی صفائی میں مشغول تھا کہ ایک طالب جو مذہبی تقشف کے کارٹون سمجھے جاتے تھے سِرکہ جبینی کے انداز میں تعریضاً اپنے ساتھی سے کہنے لگے کہ "اب دیوبند کے طلبہ میں بھی علیگڈھی نیا چرہ (نیچری کی جمع) کی معاشرت کا اثر پڑنے لگا ہے" میں نے عرض کیا کہ قبلہ! اُن نیا چرہ کی معاشرت کی تشریح تو فرمائیے" کہنے لگے "وہی اپنے حجروں (کمروں) کی آراستگی اور صفائی کے اہتمام میں مفرط غلو"۔

گویا اُن کے نزدیک "علی گڈھی نیا چرہ" کوئی نیک کام بھی کریں تو اس کا اتباع نیچریت پسندی کے برابر جُرم ہے۔ تقریباً ایسا ہی اُردو میں بلینک ورس کی ترویج پر مغرب پرستی کا اعتراض ہے، اہل مغرب میں اگر کوئی خوبی نظر آئے تو اس لئے اسے اختیار نہ کرنا کہ وہ مغرب میں کیوں رائج ہے۔ جرم کی حد تک تعصب کرنے کے مساوی ہے۔ اسکے علاوہ سنسکرت شاعری میں اس کا رواج عربی نظم میں اس کا وجود۔ اردو میں بلینک ورس کی ترویج کو اس الزام سے بھی بری کر دیتا ہے۔

۳۔ اردو نظم میں مثنوی اور مسدس کا وجود بلینک ورس کی ضرورت کو رفع کر دیتا ہے۔ انیس و دبیر کے مرثیئے۔ میر حسن اور نسیم کی مثنویاں اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔"

اس میں شک نہیں۔ انیس و دبیر کے مراثی اور موخر الذکر حضرات کی مثنویاں۔ فطری جذبات اور فلک پیما خیالات کا آئینہ ہیں۔ لیکن کاش ان حضرات کے دل و دماغ میں اُن گرانبہا خیالات و عالی جذبات کی بے شمار لاشوں کو بھی دیکھا جاسکتا جو قافیہ کی گراں سنگی سے ٹکرا کر شہید ہو چکے ہیں۔

قادر البیان سے قادر البیان شاعر جانتا ہے کہ اسے نظم کو مرصع بنانے کے لئے اکثر اوقات اپنے خیالات کا دامن چھوڑ کر جبراً قافیہ کے پیچھے گھسٹنا پڑتا ہے۔ مسدس کا تو ذکر ہی کیا کہ مشکلات سے لبریز ہے۔

مثنوی کو لیجئے۔ جس میں ہر شعر ایک مطلع ہوتا ہے اور بظاہر دو مصرعوں کو ہمقافیہ بنانا آسان ہے۔ لیکن مثنوی نگار حضرات جانتے ہیں کہ بسا اوقات اک ڈھلا ہُوا دلکش مصرعہ ایسے قافیہ کے ساتھ نظم ہو جاتا ہے کہ اس کی ٹکر کا دوسرا مصرعہ لگانا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ مجبوراً شاعر یا تو اس مصرعہ کو ضائع کر دیتا ہے یا دوسرا مصرعہ جیسا بھی میسر آئے لگا کر کلام میں ناہمواری کا نقص پیدا کر لیتا ہے۔ مثلاً میں اپنی نظم "غازی اسلام" کے دو مصرعے پیش کرتا ہوں

"بوئے خوں آتی ہے اے یورپ تری تہذیب سے"

تہذیب قافیہ ہے۔ تقلیب۔ تعریب۔ تادیب۔ تشبیب۔ تغلیب۔ تعذیب وغیرہ یہ تہذیب کے ہمقافیہ الفاظ ہیں۔ اب پہلے مصرعہ کی برجستگی اور خوبصورتی کو مدنظر رکھ کر دوسرے

مصرعہ کے لئے الفاظِ مذکورۂ بالا میں سے کوئی قافیہ انتخاب کیجئے اور ایسا مصرع موزوں کرکے دکھلیئے کہ مطلع کے دونوں مصرعے دست وگریباں ہوجائیں۔ میں نے تو دوسرا مصرعہ موزوں کرنے پر تین گھنٹے برباد کئے مگر بے سود۔ جو مصرعہ موزوں ہوتا تھا صرف قافیہ کی وجہ سے نہایت بے تکا ہوتا تھا۔ آخر کار اس مصرعہ ہی سے دست بردار ہونا پڑا۔

"تو نے ہل چل ڈال دی معمورۂ آفاق میں"

"غازی مصطفیٰ کمال" کی شان میں یہ مصرعہ کہا گیا ہے۔ آفاق قافیہ ہے۔ مشتاق۔طاق دستاق۔ اعماق۔ اغراق۔ اغلاق۔ وغیرہ میں سے کوئی لفظ پہلے مصرعہ میں بطور قافیہ لایا جا سکتا ہے۔ پہلے دو لفظ شگفتہ ہیں باقی مولویانہ قافیے ہیں۔ دیدۂ مشتاق شگفتہ طور پر آسکتا تھا، لیکن مصرعۂ مذکورہ کا مفہوم "دیدۂ مشتاق" کو بے محل قرار دیا ہے۔ لے دیکے "طاق" رہ گیا بہت زور لگایا مگر مصرعۂ ثانی کی ٹکر کا مصرعہ موزوں نہ ہوا۔ اصل مصرعہ کو ضائع کرنے پر دل راضی نہ ہوا مجبوراً

"سامنے مہمان کے جو تھا پیسر رکھدیا" (داغ)

طاق کا قافیہ لے کر پہلا مصرعہ موزوں کیا اب ذرا دونوں مصرعوں کی یکسانیت پر غور کیجئے

"خود سری یورپ کی رکھی رہ گئی سب طاق میں
تو نے ہل چل ڈال دی معمورۂ آفاق میں"

پہلے مصرعہ کو دوسرے مصرعہ سے وہی نسبت ہے جو چاندی کی اٹھنی سے نکل کی اٹھنی کو کہ دونوں رواں ہیں مگر ایک چلتی اور دوسری چلائی جاتی ہے۔

کسی بڑے سے بڑے شاعر کی مثنوی اُٹھا کر دیکھئے اس میں ہزاروں مصرعہ زبانِ حال سے آپ کو بتائے گا کہ۔

"میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں"

کلام میں آورد کا نقص کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اسی لئے کہ شاعر فطری جذبات کو ادا کرنا چاہتا ہے مگر قافیہ کی پابندیاں شش جہت سے "رستہ بند ہے" کا فرمان صادر کرتی نظر پڑتی ہیں۔ ان رکاوٹوں سے اپنے جذبات کا دامن اُس سے چھوٹ جاتا ہے، اور قافیہ اپنے زلف و گیسو میں اسے جکڑ کر "می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست"

یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات کوئی خاص عنوان قائم کر کے شاعر نظم لکھنی شروع کرتا ہے اور جب کہہ چکتا ہے تو درمیان میں بلاارادہ دوچار قافیے ایسے بندھ جاتے ہیں کہ انہیں ضائع کرنا گوارا نہیں ہوتا اور مجبوراً نظم کا عنوان بدلنا پڑتا ہے۔

۴۔ "بلینک ورس" کوئی نئی چیز نہیں وہی ہے جسے فارسی میں "نثرِ مرجز" کہتے ہیں۔ "بلینک ورس" کے نام سے اردو میں اسے رائج کرنا اپنی ایشیائی زبان سے بےخبری پر دال ہے"۔

اس اعتراض کا منشا بظاہر فارسی فنِ شعر سے میری بےخبری ثابت کرنا ہے۔ یعنے "بلینک ورس" نام میں نے اس لئے اختیار کیا کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ فارسی میں بلینک ورس کو "نثر مرجز" کہتے ہیں۔ یہ اعتراض ایک ایسے شخص کا ہے جس نے فارسی میں ایم اے پاس کیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں فارسی علوم سے بےبہرہ ہوں۔ لے دے کر صفوۃ المصادر اور گلستان کے چار باب میری فارسی کی کل کائنات ہے۔ تاہم اتنا گیا گذرا بھی نہیں کہ اپنے فارسی داں دوست[1] کو انکے ایم اے ہونے پر مبارکباد اور ان کی لاعلمی کی داد دوں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بلینک ورس انواعِ نظم سے ہے اور "نثرِ مرجز" اقسامِ نثر سے۔ بلینک ورس کے انواعِ نظم سے ہونے کو تو وہ مجھ سے زیادہ جانتے ہونگے۔ اس کا نام ہی بتا رہا ہے کہ یہ نظم ہے انگلش گریمر میں بلینک ورس کو اقسامِ نظم میں شمار کیا گیا ہے۔

نثرِ مرجز انواعِ نثر سے ہے ملاحظہ ہو

"در اصطلاحِ اہلِ انشا مرجز کلامیست منثور کہ وزن دارد وسجع ندارد"

(مقدمات ظہوری)

"باصطلاح اہلِ انشا قسمے از سہ اقسامِ نثر کہ مرجز و مُسجّع و عاری است۔ پس مرجز نثرے باشد کہ کلماتِ فقرتین اکثر جاہا ہمہ ہموزن باشند"

(فرہنگ انندراج)

"بلینک ورس" میں وزن سے مراد وزن بحوری ہوتا ہے۔ اور "نثر مرجز" میں دو فقروں کے باہم کلمات کا ہموزن ہونا یہ وزنِ بحوری نہیں وزن عروضی ہے۔ مختصر یہ کہ بلینک ورس اور

---

[1] مولانا شاداں لکھنوی۔

نثرِ مرجز میں نظم و نثر کا تفاوت ہے یہ دونوں جیسا کہ میرے علوم فارسی سے باخبر دوست کو مغالطہ ہُوا ہے ایک ہی چیز کے دو نام نہیں ہیں۔

کاش بلینک ورس اور نثرِ مرجز ایک ہی چیز کے دو نام ہوتے کہ میں اردو کی پیش رو فارسی زبان میں بھی بلینک ورس کا رواج دکھا سکتا۔

ان اعتراضات کا جواب دینے کے بعد میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اردو نظم میں بلینک ورس (بے قافیہ نظم) کو رائج کرنے سے میری یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ اردو نظم کے میدان میں قافیہ آرائی کے ہنگاموں کو بند کر دیا جائے۔ بلکہ صرف یہ عرض ہے کہ اگر کوئی مجھ جیسا کم مشق شاعر بلینک ورس بھی کہہ لے تو گردن زدنی قرار نہ دیا جائے۔ لیکن اگر کچھ پختہ مشق اُردو دُنیا میں ایسے بھی ہیں کہ قافیہ کی غیر قدرتی پابندیاں انکی جولانیٔ طبع کی سدِ راہ نہیں ہوتیں تو وہ قطعاً بلینک ورس کو ہاتھ نہ لگائیں۔

قافیہ شعر کا جزو نہیں ہے۔ شعر کی تعریف میں کہیں قافیہ کا ذکر نہیں۔ آخر فرد شعر ہی کی قسم ہے اور قافیہ نہیں رکھتی۔ بنا بریں جب قافیہ شعر کا جزو نہیں۔ اس کی تعریف میں داخل نہیں پھر اس کے لئے اتنا ضروری کیوں قرار دے لیا گیا کہ بے قافیہ نظم کہنا ہی ناجائز ہو۔

میرے خیال میں بے قافیہ نظموں کو رائج کرنا اردو نظم کی گرانقدر اصلاح ہے پنجاب کی شاداب سرزمین میں اردو شاعری کی اصلاح سب سے زیادہ بارآور ہُوئی ہے۔ آزاد و حالی نے اسی "انتخاب ہفت کشور" میں اردو نظم کی اصلاحِ معنوی کا بنیادی پتھر رکھا جس کی سربفلک عمارت بمبئی اور کلکتہ کے سمندری ساحلوں سے بھی نظر آرہی ہے۔ اس پہلے کامیاب تجربہ سے فائدہ اُٹھا کر کیوں نہ پنجاب ہی میں اردو نظم کی غیر ضروری پابندیوں کی اصلاح کا مفید کام جاری کیا جائے۔ اکثر مفید تحریکات پنجاب میں جاری ہُوئیں اور ہندوستان بھر میں پھیلیں۔ اردو نظم کی اصلاح میں پنجاب کی رہنمائی سارے ہندوستان سے خراجِ اطاعت وصول کریگی۔ میرا ارادہ ہے کہ انجمن ارباب علم اور رسالہ ہمایوں کے ذریعہ اُردو نظم میں بلینک ورس کو رواج دوں۔ ہر کام کی ابتدا مشکلات سے پُر ہوتی ہے۔ لیکن مشکلات کا عبور کرنا ہی کسی کام کو انجام تک پہنچا دینے کا نام ہے۔ بے قافیہ اردو نظم اول اول غیر مترنم۔ سامعہ سوز اور اوپری سی

معلوم ہوگی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اسی جدت میں دلکشی و دل آویزی پیدا ہو جائیگی۔
اردو زبان یا اردو نظم میں جب کبھی کوئی مفید تبدیلی کی گئی ہے۔ دلی اور لکھنو والوں نے اپنی صدائے احتجاج سے کان کے پردے پھاڑنے کی کوشش کی ہے یقیناً بلینک ورس کی تجویز سُن کر بھی ان کی بے اثر فریادیں آسمان کے کنگرے ہلا دینگی۔ لیکن اس غوغائے بے ہنگام کی جانب سے کان بند کرکے ہم اردو زبان اور اس کی شاعری کی اصلاح میں بدستور منہمک رہینگے مستقبلِ قریب ہماری اصلاحی کوششوں کی داد اردو کے ان دو مرکزوں سے بھی دلا کے چھوڑے گا۔
آئندہ کوشش کیجائیگی کہ ہمایوں کے ہر نمبر میں بے قافیہ نظمیں شائع کیجائیں۔ شعرائے روشن خیال سے استدعا ہے کہ وہ اس مفید تحریک کے رائج کرنے میں ہماری مدد کریں۔ ہمایوں کے صفحات میں بے قافیہ نظمیں مقفّیٰ نظموں کے مقابلہ میں ترجیحی سلوک کی مستحق سمجھی جائینگی۔ انگلش پوئٹری میں اکثر ایپک اور ڈرامیٹک نظمیں بے قافیہ ہوتی ہیں۔ ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ اور شکسپیر کے بعض ڈرامے (میکبتھ وغیرہ) بلینک ورس میں ہیں۔ لرک نظمیں جو گائی جاتی ہیں وہ مقفّیٰ ہیں۔ اردو میں شاہنامہ اور یوسف وزلیخا کی طرح رزمیہ اور عشقیہ افسانوں کو مثنوی کے سپرد کردیا جائے لرک کیلئے غزل پہلے ہی سے ہے بلینک ورس کو اُن عالی پایہ فلسفیانہ خیالات، جذبات افروز مضامین اور تاریخی واقعات کے لئے مخصوص کرلیا جائے جو قافیہ کی آمیزش سے رنگِ اصلیت کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔
اردو کے بلینک ورس نگار اس تقسیم کو پیش نظر رکھ کر بے قافیہ نظمیں کہیں۔
چونکہ اردو میں بلینک ورس کو اس لئے رائج کرنا مقصود ہے کہ طبیعت کے قدرتی بہاؤ میں مشکلات حائل نہ ہوں اس لئے بے قافیہ نظموں میں اگر بلا ارادہ کوئی شعر مطلع بنجائے تو اسے مطلع ہی رہنے دیا جائے اسلئے کہ ایسے مطلع کو شعر بنانا غیر قدرتی ہو جائیگا۔

تاجور۔

شاعری و نفسیات

انسان کے قوائے روحانیہ اور اُن کے افعال کا مطالعہ علم النفس کا خاص موضوع ہے۔ اور چونکہ شاعری انسانی دماغ کے بعض اعمال کا ماحصل ہے۔ اس لئے شعر کی ماہیت بھی نفسیات کے دائرہ میں شامل ہے۔ اس ماہیت کے مطالعہ کے متعلق پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیا شاعری تصنیف و تالیف کے دیگر انواع مثلاً مضمون نگاری سے بجائے ذہنی صفات کے بالکل مختلف شئے ہے۔ یا یہ کہ ہر قسم کی تصنیف و تالیف ایک ہی قسم کے وظائفِ نفسانیہ کا اثر و نتیجہ ہیں۔ علم النفس کے عالموں کی کثرت رائے اس جانب معلوم ہوتی ہے۔ کہ اگرچہ بعض ذہنی صفات ایسی ہیں۔ جو ہر قسم کی انسانی تحریر و تقریر کے لئے مشترک ہیں۔ تاہم شاعری دیگر انواع تصنیف سے نہ صرف فی نفسہٖ مختلف ہے۔ بلکہ اُس کی بنیاد بعض ایسے اعمال روحانی پر ہے جو شعر ہی کے لئے خاص ہیں۔ اور جن کا وجود دماغ کے دیگر نتائج مثلاً ریاضیات میں یا تو بالکل مفقود ہے۔ یا اُس درجہ و اُس شکل میں موجود نہیں۔ جس درجہ اور جس شکل میں ہم اُس کو شاعری میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس رائے کو تسلیم کرنے سے پیشتر یہ جاننا ضروری ہے۔ کہ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں۔ وہ شعر کے مفہوم کو اُس کے متعارف معنوں سے بہت زیادہ وسعت دیدیتے ہیں اور جہاں تک اُن کی بحث کا تعلق ہے۔ شعر صرف کلام موزون ہی کا نام نہیں۔ بلکہ وہ انسان کے قول و فعل کے اس جزو کا نام ہے۔ جو ہمارے احساس حسن کو تیز کر دیتا ہے۔ ان وسیع معنوں میں نہ صرف کلام موزوں۔ بلکہ کلام غیر موزون اور کلام کے علاوہ ہر قسم کے اور فنون۔ مثلاً موسیقی۔ مصوری۔ اور سنگتراشی۔ حتیٰ کہ ریاضیات بھی اپنے میں کچھ نہ کچھ شعریت رکھتے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے۔ کہ شعر میں موزون الفاظ کو احساس حسن کا محرک بنایا جاتا ہے۔ اور شاعری کی دوسری اقسام۔ موسیقی۔ مصوری۔ وغیرہ میں اور اشیاء مثلاً اصوات۔ الوان وغیرہ کو۔ لیکن اگر ہم شاعری اور شعر کو اس وسیع مفہوم میں استعمال

کریں۔ تو درحقیقت یہ ایک لفظی بحث رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اگر ہم لفظ شعر کی جگہ لفظ تخیل کو اس موضوع میں استعمال کریں۔ تو مندرجہ بالا رائے کی صداقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو سکے۔ لیکن شعر کے مفہوم کو اس قدر وسعت دینے میں کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے جہاں تک اس مختصر مضمون کا تعلق ہے۔ شاعری و شعر کو قریب قریب اسی معنی میں لیا جائیگا جو عام طور پر معروف ہیں۔ لہذا اب جو سوال ہمیں درپیش ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ آیا علم النفس کی رو سے کسی ایسے اعمال ذہنی کا پتہ چلتا ہے۔ کہ جو شعر کے لئے مخصوص ہوں۔ میرے خیال میں اس سوال کا مثبت جواب دینے میں چنداں تامل نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے۔ کہ ہر شخص شاعر بننے کی اہلیت نہیں رکھتا اور نہ ہر شاعر اپنے خاص فن کے علاوہ کوئی نمایاں ذہنی قابلیت رکھتا ہے۔ یہ حقایق جو ہمارے مشاہدہ میں روزمرہ آتے رہتے ہیں۔ ہمیں اس بات کے تسلیم کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ کہ شاعری کا مدار دماغ کی عام استعداد پر نہیں۔ بلکہ خاص قویٰ کی کمی یا زیادتی پر ہے۔ ان قویٰ کا تعین البتہ ایک مشکل کام ہے کیونکہ قوائے ذہنی ایک دوسرے کے ساتھ اس طور پر وابستہ ہیں۔ کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا بہت دقت طلب ہی سے ممکن ہے۔ بہرحال اتنا تو وثوق کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ کہ شاعری زیادہ تر تاثرات وجذبات سے واسطہ رکھتی ہے۔ خیالات کے منطقی ربط سے اُسے چنداں سروکار نہیں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ شاعری قوانین استدلال سے بالکل آزاد ہے۔ اگر ایسا ہو۔ تو شاعری کو مجنون کے ہذیان سے تمیز کرنے کے لئے کوئی معیار باقی نہ رہیگا۔ اور اگرچہ بعض شاعری اس قسم کی ضرور موجود ہے۔ کہ جس کے اور ہذیان کے درمیان شاید ہی کوئی بار یک فرق ہو۔ لیکن پختہ کار اساتذۂ شعراء کا کلام عموماً اس ہذیانی صفت سے پاک ہوتا ہے۔ اور جہاں وہ ایک جانب تخیلات کو حرکت میں لاتا ہے تو دوسری جانب قوت استدلال کو بھی مطمئن کر دیتا ہے۔ لیکن شاعری کو خیالات و تصورات کے استدلالی تسلسل سے اتنا تعلق نہیں ہوتا۔ جتنا اُن کی اُس صفت سے جو ہمارے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ ہر ایک خیال خاص صورتوں میں جذبات کا مرکز بن سکتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ "ایک" کو لیجئے۔ جو ابتداً گنتی کی ایک اصطلاح ہے جو کسی منفرد شئے

کو ظاہر کرنے کے لئے ریاضی نے وضع کر لی ہے۔ لیکن یہی لفظ "ایک" جب ذات باری کے ساتھ منسوب ہو جاتا ہے۔ تو توحید اور جو جذبات کہ اُس سے پیدا ہوتے ہیں اُنکا منبع اور ماخذ ہو جاتا ہے۔ یہانتک کہ محض اُس لفظ کی مختصر شکل یعنی (۱) کا تصور بعض لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کی وجدانی کیفیات پیدا کر سکتا ہے۔ شاعر لفظوں کی اس قوت سے واقف ہو کر اُن کو اپنے پیرایہ استعمال کرتا ہے۔ کہ وہ ہمارے جذبات میں تموج پیدا کر سکیں۔ اور بعض وقت یہ نتیجہ پیدا کرنے کے لئے شاعر کو یہ ضرورت پیش آتی ہے۔ کہ وہ خوشنما تصورات سے کم از کم اتنا سکون پیدا کر دے۔ کہ قوت استدلال جذبات کے راستہ میں حائل نہ ہو۔ اور تھوڑی دیر کے لئے تصورات کو اُس خوشگوار بے ربط تسلسل میں آنے دے جو واقعیت سے زیادہ عالم رویائے میں مشاہدہ کیا جاتا ہے،

بعض شعر باوجود واقعیت اور استدلال سے دور ہونے کے بھی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً داغ کا شعر ہے۔ کہ ؎

یہ بات کیا دم رفتار ہوتی آتی ہے
کہ اپنے سایہ سے تکرار ہوتی آتی ہے

عقلی طور پر یہ اعتراض اس شعر پر وارد ہو سکتا ہے۔ کہ سایہ سے تکرار معشوقانہ انداز نہیں بلکہ مجنونانہ حرکت ہے۔ اور عقل اُس کو قبول نہیں کرتی۔ کہ یہ فعل معشوق سے منسوب کیا جائے۔ لیکن اربابِ ذوق میں شاید ہی کوئی ایسا ہو۔ جو اس شعر کی داد دینے میں مضائقہ کرے۔ بعض وقت قوت استدلال کا یہ عارضی سکون۔ جو کیفیت شعر کے لئے ضروری ہے۔ محض اس سے حاصل ہو جاتا ہے کہ شعر کے الفاظ اس قسم کے ہوں جو کانوں کو بھلے معلوم ہوں۔ اور بڑے شاعر ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں۔ کہ بندش و انتخاب الفاظ میں خشن اور کرخت لفظوں کے اجتماع سے پرہیز کریں۔ یہ بھی عام مشاہدہ کی بات ہے کہ معمولی سی غزل بھی اگر لے میں پڑھی جائے تو رنگین ہو جاتی ہے۔ اور لوگ اس کی داد دینے لگتے ہیں۔ لیکن اگر وہی غزل تحت اللفظ پڑھی جائے۔ تو کوئی لطف باقی نہیں رہتا۔ عرب کے مشہور ادیب ابو تمام کا مقولہ ہے۔ کہ "ترنم وہ میدان ہے

کہ جس میں شعر دوڑتے ہیں مولوی حالی مرحوم نے یہ قول پسندیدگی کے ساتھ اپنے دیوان کے معرکتہ الآرا دیباچہ میں نقل کیا ہے۔ لیکن اُس کی تحقیق کی کوشش نہیں کی۔ اصل میں یہ مقولہ حکمت و حقیقت سے پر ہے۔ کیونکہ ترنم یا آہستہ آواز سے گانے کا یہ اثر ہے۔ کہ دماغ پر ایک حالت سکون طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس نیم غنودگی کی حالت میں تخیلات دماغ کی تہ میں سے اُبھر کر سطح تک آتے ہیں۔ اور لفظوں کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ نیز ترنم سے الفاظ کو موزوں کرنے میں بھی آسانی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ علم عروض و علم موسیقی میں جو قریب کا تعلق ہے۔ وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

ابو تمام کا یہ مقولہ اس حقیقت کی جانب ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ کہ دماغ کی اس جد و جہد کے علاوہ جو اُس سے بیداری میں ظاہر ہوتی ہے کوئی اور فعل بھی ہے۔ جو نیند اور اُس کے مماثل حالتوں میں جاری رہتا ہے۔ ہر شخص یہ تجربہ کر سکتا ہے۔ کہ اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے ماحول سے خالی الذہن ہو کر اپنی توجہ کو کسی خاص چیز یا خاص خیال پر جمنے نہ دے بلکہ خیالات کی رو کو اپنے طور پر بہنے دے۔ تو بہت سے ایسے تصورات کہ جو عالم بیداری میں شاید ہی کسی وقت اُس کے پیش نظر رہتے ہوں۔ ایک عجیب بے قاعدگی کے ساتھ نمودار ہو کر چلتی چلاتی تصویروں کے مانند اپنا تماشہ دکھانے لگتے ہیں۔ بعض وقت یہ تصورات اُن اشیاء یا خیالات کے متمثل بن جاتے ہیں۔ جو اُس شخص کے علم میں ہوتی ہیں۔ لیکن اکثر مرتبہ وہ دماغ کے اُن تجربات سے علاقہ رکھتے ہیں۔ کہ جن کا اس کو خود بھی پوری طرح علم نہیں ہوتا۔ یہی حالت عالم خواب کی ہے۔ اور دماغ کی بعض غیر معمولی کیفیات میں بھی یہ امر مشاہدہ کیا گیا ہے۔ کہ جو باتیں معمولی طور پر انسان کے حافظہ سے محو ہو چکی ہوتی ہیں وہ پھر عود کر آتی ہیں۔ ان سب واقعات سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے۔ کہ اُن وظائف ذہنیہ کے علاوہ کہ جن سے انسان باخبر اور آگاہ رہتا ہے۔ دماغ اپنا بہت سا کام عالم بیخبری میں کرتا رہتا ہے۔ جس سے ہم عموماً آگاہ نہیں ہوتے لیکن خاص حالتوں میں آگاہ ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک پردہ ہے۔ جس پر طرح طرح کے نقش و نگار ہیں اور جس کے مقابل ایک چراغ ہے کہ جو اپنی روشنی اُس پردہ پر ڈال رہا ہے ہوا کے

جھونکے آتے ہیں۔ اور اُس پردہ کی ہموار سطح پر تموج پیدا کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے چراغ کی روشنی پردہ کے ہر ایک حصہ پر یکساں نہیں پڑتی۔ بلکہ بعض نقش و نگار معمول سے زیادہ اُبھر آتے ہیں اور بعض اس قدر تاریک ہو جاتے ہیں۔ کہ نظر بھی نہیں آتے یہ منقش پردہ انسان کے تصورات و خیالات و محسوسات کا مجموعہ ہے۔ جس کو بعض اوقات دماغ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن جس کے لئے عربی لفظ نفس یا روح زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان غیر مادی اشیاء کو مادی دماغ سے تمیز کرنا ضروری ہے۔ جو صرف چند رگوں اور پٹھوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور مضغۂ گوشت سے زیادہ کچھ نہیں چراغ انسان کی توجہ ہے۔ جو بعض تصورات۔ خیالات۔ حسیات کو بعض سے زیادہ نمایاں کر دیتی ہے۔ اور ہوا کے جھونکے ذوق و خواہش کے وہ جذبات ہیں۔ کہ جن کی وجہ سے کوئی شے یا خیال ایک وقت خاص کے لئے ہماری توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔

دماغ کے اس غیر معلوم حصہ کا مطالعہ بجائے خود بہت مفید اور دلچسپ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ آئندہ میں نفسیات کے ماہرین کا بڑا کام اسی تاریک خطہ کے متعلق تجسس ہوگا۔ لیکن ہمارے لئے اس وقت صرف اس قدر جاننا کافی ہے۔ کہ یہ غیر معلوم حصہ کوئی معین حدود نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کی وسعت میں ہر لحظہ کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی خیال جو اس وقت روشنی میں ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں چلا جائے اور کوئی دوسرا خیال جو ایک مدت سے دماغ کے دور اُفتادہ مقامات کی سیر کر رہا تھا۔ صف اول میں جگہ پائے۔ بعض دماغی امراض بعض دوائیں قلب انسانی کی بعض کیفیات اِن پوشیدہ خیالات کو قوی بنا دیتی ہیں۔ اور وہ اپنی ہستی کو مختلف صورتوں سے ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ زمانہ حال کی تحقیق سے اس حیرتناک حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ انسان کی زندگی کئی وجوہ سے اِن غیر معلوم خیالات کے رحم پر منحصر ہے اور جنون کے بعض اقسام اور اُس کے مماثل امراض مثلاً مراق۔ ہسٹیریا وغیرہ بیشتر ان خیالات کے دماغ پر محیط ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن دماغ کا یہ تاریک خطہ جہاں بہت سی خرابیوں کا منبع ہے وہاں بہت سی خوبیوں کا بھی سرچشمہ ہے۔ اسی میں وہ خوبصورت تصورات

اور خوشنما تخیلات جمع رہتے ہیں۔ جن کو شاعر الفاظ کا جامہ پہنا کر ذوق سخن سے داد لیتا ہے اور جنکو موسیقی دان خوشگوار اصوات کے سلسلہ میں منسلک کر کے سامعہ کے لئے لذت کے سامان پیدا کرتا ہے۔ مصور کی تصویریں۔ اور سنگتراش کے اصنام اس مقام پر جنم لیتے ہیں۔ بہت سے اعتقادات و اشارات جن پر مذہب کا مدار ہے۔ دماغ کے اسی گوشے میں رہتے ہیں۔ اور وہاں سے اپنا پرتو ہمارے عمل و یقین پر ڈالتے ہیں۔ غرضیکہ اس مخفی عالم میں قسم قسم کے نیرنگ و عجائبات دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس کی سیر علم النفس کے شائقین کے لئے ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ہے۔ قدیم الایام سے مراقبہ و احتساب نفس کو باطنی تزکئے کے لئے ضروری خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اور اس قسم کے اقوال کہ "من عرف نفسہ عرف ربہ" روحانیات میں ہمیشہ مستند سمجھے گئے ہیں۔ یہ جملہ عقائد دماغ کے ان اسرار سے جو اس وقت زیر بحث ہیں کم و بیش آگاہی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ عرفی کا یہ شعر اُس کے حقیقت شناس ہونے کا کافی ثبوت ہے ؎

"سر روحانیاں داری ولے خود را ندیدستی بخواب خود درآ تا قبلۂ روحانیاں بینی"

افسوس ہے کہ ہمیں اس وقت اس دلچسپ عالم کی سیر کرنیکی فرصت نہیں ہے ممکن ہے کہ پھر کبھی آنا ہو فی الحال اس مختصر مضمون کو ختم کرنے کے لئے چند سطروں کا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے غالباً یہ دعوےٰ بیجا نہ ہوگا۔ کہ غیر معلوم خیالات و تصورات کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد شعر کے ذہنی ماخذ کو معلوم کرنے میں کسقدر آسانی ہوجاتی ہے اور یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ شاعری اور دوسرے دماغی کاموں مثلاً ریاضی اور منطق سے ایک تو اسوجہ سے متمیز ہے۔ کہ اس میں ان مخفی خیالات و تصورات کو اُن کاموں کی نسبت زیادہ دخل ہے اور یہ بہت بڑی وجہ تمیز ہے جسپر شعرا ہمیشہ فخریہ پیرایہ میں یہ کہتے آئے ہیں کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" اور "الشعراء تلامذ الرحمن" لیکن یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ کہ شاعری تمام و کمال اسی نوع کے تصورات کا نتیجہ ہے۔ شاعری کے اعلیٰ مدارج دیگر قوائے ذہنیہ مثلاً فہم ادراک استدلال کے ایسے ہی محتاج ہیں جیسے کہ دماغ کے اور کام محض غیر معلوم خیالات کا خزانہ دماغ میں رکھنے سے کوئی شخص شاعر نہیں بن سکتا۔ بلکہ بسا اوقات اس قسم کے خوشنما تصورات کی موجودگی ایسے شخص کے لئے جو اسکو نظم کرنیکی لیاقت و استعداد نہ رکھتا ہو۔ کئی قسم کی دماغی اور اخلاقی خرابیوں کا سامان پیدا کر دیتی ہے +

محمد سعید

گمنام خطوط

خورشید لقا بیگم کا خط اپنے بہنوئی کے نام

میں للت پور جا رہی تھی۔ رات تاریک تھی؛ اور ٹرین کے انجن کا کثیف دھواں اس تاریکی کو کچھ کم نہیں کر رہا تھا، بڑھا ہی رہا تھا۔ اس عظیم الشان، اور وسیع تاریکی میں، گاڑی کی کھڑکیوں میں سے نکلنے والی روشنی نے، ٹرین کو ایک چمکدار اور تیز رو، ہزار پا کیڑا بنا رکھا تھا جو بل کھاتا ہُوا جا رہا ہو۔ اس محیطِ حزن و خوف میں میرے لئے ایک عجیب کشش تھی، میں بار بار سر نکال کے اس تاریکی پر نظر ڈالتی تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ اس میں غائب ہو جاؤں۔ میں اسٹیشن پر پہنچی؛ مگر وہاں میرے لینے کے لئے کوئی نہ تھا۔ میں جس طرح تمہیں اطلاع دئے بغیر لکھنو سے روانہ ہو گئی تھی، اسی طرح بغیر کسی اطلاع کے یہاں پہنچی تھی۔ میں نے چاہا کہ اپنے شوہر سے اچانک جا ملوں۔ بالفرض اگر میں اس تاریکی میں غائب ہو جاتی، تاکہ اس فجیعۂ حیات کو جسے تنہا میں ہی محسوس کرتی ہوں ختم کر دوں، اور اپنے دل کی حسرتوں، اپنی روح کی تڑپ کو اپنے ہی ساتھ خاموشی سے لیجاؤں، تو کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ میں کہاں غائب ہو گئی اور کیونکر غائب ہو گئی۔ میں ایک عورت ہوتی جو ایک راز، ایک معما کی طرح بغیر حل ہُوئے رہ جاتی یہ ایک ایسا محبوب خیال تھا کہ اگر میری لڑکی کی سیاہ آتشیں آنکھیں ابدیاً میرے لئے روتی ہُوئی، انتظار کرتی ہُوئی، میرے تخیل کے سامنے نہ آجاتیں تو میں اس ارادے کو پورا کر گذرتی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ کچھ دنوں کے بعد مجھے اپنے وطن سے، ایک راز، ایک معما کی طرح غائب ہونا ہی پڑیگا۔

انسان، اپنے مستقبل کے مقابلہ میں کس قدر عاجز و ناتوان ہے۔ اُسے نہیں معلوم ہوتا کہ اگلے چند دن، یا چند گھنٹے زندگی کی کیسی مصیبتیں، کیسی فلاکتیں یا کیسی خوشیاں، کیسی مسرتیں اپنے میں چھپائے ہُوئے ہیں۔ اگر آئندہ کے پنہاں صدمات، یا متبسم تجلیات کی ہمیں خبر ہو جائے، تو ہم شاہراہ حیات پر اس طرح اپنے کور کورانہ چلے جانے پر کیسے ہنسیں۔ اگر اسوقت

اپنی خواہش کے مطابق میں اپنے تئیں، ٹرین کی کھڑکی سے نکال کے اُس فضائے تاریک میں پھینک دیتی، تو آج کے دن اس تلخکامی کے احساس سے بچ جاتی. مگر جس قسمت نے اس اعتنا کے ساتھ مجھے اس جال میں پھنسایا تھا، کیا وہ اپنے کھلونے کو آسانی سے اپنے ہاتھ سے جانے دیتی؟ ہرگز نہیں. غرضیکہ وہ سیدھی مجھے اُس گڑھے میں لے گئی، جس کی طرف مجھے اپنی بیٹی کی سیاہ اور خوبصورت آنکھیں کھینچ رہی تھیں.

میں گھر پہنچی، مگر ماجد کو میں نے گھر میں نہ پایا. وہ دورے پر باہر گیا ہوا تھا. میری لڑکی اپنی سیاہ چمکیلی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھرے ہوئے مجھ سے آکر لپٹ گئی. میری ساس نے اپنی حلیم و شفیق نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھا؛ مگر ان نظروں میں تجسس اور شبہ ملا ہوا تھا. اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں گئی تو تھی تین مہینے کے لئے اور ڈیڑھ مہینے ہی میں واپس آگئی. اس کی کیا وجہ تھی. پھر بے خبر اچانک آنا کیا معنی رکھتا تھا. میرے "بچی اور ماجد کو دیکھنے کو میرا دل چاہا" کہنے پر اُس نے نیم محزون، نیم مستہزی آواز سے کہا

"ہاں ضرور، تمہاری اور ماجد کی ایسی ہی اچھی طرح تو گذرتی ہے کہ میں یہ سمجھوں کہ تم اُس بغیر نہیں رہ سکتیں."

اُسے یہ کہنے کا حق تھا. ہماری تیرہ برس کی زندگی ایک فاجعۂ مدید تھی، جس میں ناقابل بیان درد انگیز واقعات ظہور میں آئے تھے. اس زندگی کی یگانہ شاہد اُس کی ہمدرد و رحیم آنکھیں تھیں. اُسے یقین نہ آتا تھا کہ لکھنو کی زندگی چھوڑ کر میں اس شخص کے لئے، گو وہ اُس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، دوڑی دوڑی آؤنگی. خود وہ جب کبھی لکھنو جاتی تو ہفتوں کی بجائے مہینوں وہاں ٹھیرتی، اور گو اپنے بیٹے سے جُدا ہو کر گئی تھی پھر بھی لوٹتے وقت کہتی:

"میرا سر پھرا تھا جو میں یہاں آئی"

روحاً و فکراً جس آدمی سے مجھے کوئی مناسبت نہ تھی، میں اُس کی ہر زیادتی اور سختی کا سکون و بُردباری سے مقابلہ کرتی تھی؛ اُس کے سب و شتم کا کبھی میں نے جواب نہ دیا. اپنے خاندان، اور اپنے عزیزوں میں ہمیشہ بشاش چہرہ ظاہر کرنے کی کوشش کی. میری

ساس اس کوشش پر عزت آمیز شفقت کی نگاہ ڈالتی تھی۔ مگر اُسے یہ خبر نہ تھی کہ ایک عورت جس مرد سے اس قدر بیزار ہو کہ اپنی موت کی دعائیں مانگا کرے، جس مرد نے تیرہ سال تک اُسے ستایا ہو، اُس کی زندگی بے مزہ، و بے رنگ کر رکھی ہو، اس عورت کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ وہ عورت، اُس مرد کو ناقابل وضاحت کشش سے چاہتی ہے۔

شام کا وقت تھا کہ بنگلے کی برساتی میں ایک دوڑتے ہوئے گھوڑے کی آواز آکر رُکی، میں اور میری بیٹی مہ لقا، دوڑکر دروازے تک گئے۔ ماجد نے اپنا گھوڑا سائیس کو دیا۔ اُس کے ہاتھوں میں گہری جھرّیاں تھیں، اُس کی سیاہ آنکھیں اندیشہ ناک تھیں اپنے بازؤں کو، جس کی گوشت کی پھڑک کو میں نے ہر وقت ایک عجیب جاذب خوف سے دیکھا تھا اُس نے کولھوں پر گرا دیا، اور ایک مغموم طریقے سے وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی پہلی نظر مجھ پر پڑی، میں اس وقت لکھنو کے تازہ تریں لباس میں ملبوس تھی جس سے وہاں کی فسون و دلبری برس رہی تھی اُس کے چہرے پر ایک فوری اور لطیف تغیر پیدا ہوا۔ اُس کے بعد اپنے بھاری جسم کو ہلاتا ہوا ایک دلدوز آواز سے وہ میری طرف لپکا؛ اور اُس نے اپنی سیاہ، اور مختر ص آنکھوں سے دیوانہ وار میرے چہرے کو دیکھا۔ پھر اپنی کرخت آواز کو نرم کرنے کی کوشش کر کے مجھ سے کہنے لگا۔

"خورشید! تمہارا میرے دیکھنے کو دل چاہا تھا نہ؟ لکھنو سے اس قدر جلد چلی آئیں، یعنی لکھنو اور لکھنو والوں سے زیادہ ہمیں چاہتی ہو؟"

یہ باتیں بالکل قدرتی تھیں، مگر میں نے خیال کیا کہ اس میں کوئی معنی پنہاں ہیں؛ اور اس لئے مجھے ان باتوں سے خوشی ہونے کی بجائے تھوڑی سی تکلیف ہوئی لیکن اس میں کیا تھا؟ میں سوچتی تھی کہ اس دماغ میں جو صرف مادّہ اور ہوس سے پُر ہے۔ اور کوئی گریزاں شُبہ بھی پھر رہا تھا۔

پہلے دو تین دن تو ہم نے ایک نوخیز عشق کے غشی آور جوش میں گذارے کمرے پر پردے گرا دیئے گئے۔ لانگ بوٹ اور وردی اُتار کے پھینکدی گئی۔ یہانتک کہ

جب اُسے خبر دی گئی کہ اُس کی محبوب گھوڑی، تھان پر بندھے بندھے شرارت کر رہی ہے، تو اُس نے اپنے چوڑے سینے کی تمام قدرتِ وسعت کو کام میں لاکر گرج کے کہا:

"جاؤ، ہٹو، اگر پورے ضلع کو ڈاکو لوٹ مار کر کے تباہ کر دیں، تو بھی میں فی الحال ٹس سے مس ہونے والا نہیں ہوں۔ کرچ یہاں سے اُٹھاؤ، وردی کو میرے سامنے سے ہٹاؤ، اماں جان سے جس نے تجھے بھیجا ہے میری طرف سے کہو کہ میری بیوی کو آئے ابھی تین دن ہی تو ہُوئے ہیں؛ ایک ہفتہ تک سب انہیں کے سپرد ہے چلو" کوئیک مارچ" یہ کہہ کر گلشن آیا کو جو ایک مضحک خوف سے اُلٹے پاؤں جا رہی تھی، ماجد نے نکالا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کی عمر ۳۸ سال کی تھی، مگر اُس کے دل اور جسم کی طراوت دس سال پہلے کے شباب کو یاد دلاتی تھی۔ آج بھی وہ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسا کالج سے تازہ تازہ نکل کے، فوراً ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر ہونے اور میرے ساتھ بیاہے جانے کے وقت تھا۔ مگر اب میں وہ لڑکی نہ تھی جو بیاہ کے بعد اُس کے گھر میں آکر اُس کی روشن آنکھوں پر عاشق ہوگئی تھی۔ میری روح، حسیات کے وسیع و مُغلق فضا، میں میرے شوہر کو جو مجھ سے عمر میں صرف پانچ برس بڑا تھا، حسناً ایک بچہ چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر یہ ماننا پڑیگا کہ یہ شخص جو اپنی بعض اوقات تحملفرسا گرمجوشی سے مجھے اُکتا دیتا تھا میری زندگی کے لطیف ترین و شیریں اوقات کا بھی باعث ہُوا تھا۔ مگر اس دفعہ اس گرمجوشی نے (جس کی میں عادی تھی) معمول سے زیادہ طول کھینچا۔ میں نے خیال کیا کہ اس کی تہ میں ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ میں جانتی تھی کہ یہ آدمی جو مجھ سے کوئی بات چھپانے پر مقتدر نہیں ہے، ضرور مجھ سے سب حال کہیگا۔ میرا اندازہ غلط نہ نکلا۔ لکھنو سے واپس ہوئے، مجھے تین دن ہُوئے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ ماجد کمرے میں کھڑکی کے پاس متفکر و ساکت بیٹھا ہُوا تھا؛ میں سونے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اپنی کرسی گھسیٹ کے میرے پلنگ کے قریب آیا، اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کے اپنے ہونٹوں تک لے گیا، اور متردد اور کچھ کچھ محجوب آواز سے کہنے لگا: مجھے معاف کرو گی؟"

میں نے خیال کیا کہ میرے لکھنو کے زمانۂ قیام میں اس نے یہاں کوئی حرکت کی ہے، اُس کے لئے معافی مانگ رہا ہے۔ نوازش آمیز طریقے سے میں نے اُس کے ہاتھوں کو اپنے

ہاتھوں سے دبایا۔ وہ اپنے سامنے نظر گاڑ کے کہہ رہا تھا:
مجھے تمہاری طرف سے کچھ شبہ تھا۔ گو اپنے سے زیادہ مجھے تم پر اعتبار تھا لیکن میں نے ایک مہینہ اس قدر رشک کے جذبات میں گذارا کہ میں قریب قریب پاگل ہوگیا تھا۔"
میرے دل میں ایک ٹھسری سی پیدا ہوئی؛ میں نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔
"کس باعث اور کیوں؟"
"اگر میں کہوں تو مجھے معاف کرو گی؟"
"اس کا میں وعدہ نہیں کرتی، کیونکہ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتی کہ تم مجھ پر شبہ کرو"۔
"سچ کہتی ہو، خورشید! مگر اُن خطوں میں اس خاص لفظ پر اس قدر اصرار تھا کہ"
"کون" خطوط، اور کیسے نقطے؟"
"چند گمنام خطوط تھے؛ مجھ جیسے سپاہی آدمی کا، ایسے کمینے اور بزدل، لوگوں کی تحریروں پر اعتبار کرنا جنہیں اپنے دستخط کرنے کی بھی ہمت نہیں، بیشک قابلِ ملامت ہے۔ مگر میں نے اُن تمام خطوط کو جلادیا۔ اور میرا سارا اضطراب اور شبہ تمہارے چہرے کو دیکھ کر جاتا رہا۔

میری پہلی آرزو یہ سُن کر یہ ہوئی کہ مجھے معلوم ہو۔ ان گمنام خطوں میں میرا نام کس کے ساتھ لیا گیا ہے۔ مگر نہ معلوم کیوں، کسی خیال نے میری زبان پکڑ لی اور میں نے کچھ نہ پوچھا۔ کیا وہ نام تمہارا تھا؟ مگر کیوں اور کس لئے؟ میں نے اپنے ضمیر کے سب سے پوشیدہ کونوں میں نظر ڈالی۔ مجھے کوئی ایسا لمحہ، یا کوئی ایسا لفظ یاد نہ آیا جو کسی مشکل پسند ضمیر کے نزدیک بھی قابل اتہام ہو۔ یہ بھی نہیں کہ اپنے یا اپنے شوہر کے عزیزوں میں صرف تم ہی وہ مرد ہو جس سے میری ملاقات ہو۔ میرے شوہر کے ایک چچازاد بھائی ہیں جو خود بڑے عہدہ دار ہیں؛ اُن کا میری طرف اس قدر رجحان ہے، کہ اگر میں ایک سیاست داں کی ترکیبوں کو استعمال نہ کروں تو وہ مجھ سے ہر وقت اس قدر بے تکلف ہونے پر آمادہ ہیں کہ وہ یہ بھی بھول جانا چاہتے ہیں کہ میں اُن کے بھائی کی بیوی ہوں۔ میرا چچا کا ایک بیٹا ہے جو میرے بیاہ سے پہلے دو برس تک متواتر میرا طلبگار رہا، اور مجھے سو جان سے

چاہتا تھا۔ اُسے بھی میں نے ترکیبوں سے، عاشقی کے راستے سے ہٹا کر برادرانہ دوستی کی راہ پر ڈالا۔ اب ہم دُنیا میں دو سب سے اچھے اور صمیمی دوست ہیں۔ مگر تم! تم سے تو کبھی پاک و صاف بھائی چارہ اور دوستی کے حدود سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا گیا، اور تمہاری نگاہوں میں میں نے کبھی اخوت کی شفافیت کے سوا کوئی اور جھلک دیکھی ہی نہیں۔

مگر کیوں اس وقت، سب سے پہلے میرے ذہن میں تمہارا نام آیا؟ میں پچھلی دفعہ جب لکھنؤ میں تھی تو میں نے اعزا و احبا کی نظروں اور اطوار میں کچھ عجیب و غریب اشارے پائے۔ خاصکر، میری قمر زمانی کی مغلانی، حسینی خانم کی باتیں عجیب تھیں میں اپنی ابتدائے زندگی سے دیکھ رہی ہوں کہ اس بڑھیا کی کوشش رہتی ہے کہ یہ ظاہر کرے کہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کی زندگی پر رشک ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے، جب تم قمر سے نئے نئے بیاہے گئے تھے، اور میں تمہارے باسلیقہ و خوبصورت گھر میں اپنی بہن سے ملنے گئی تھی اس بڑھیا نے یہی خیال ظاہر کیا تھا۔ کہنے لگی:

"بیٹی! مفصلات میں بھلا تمہیں ایسی خوبصورت کوٹھی رہنے کو کہاں ملتی ہوگی؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے"

"بیٹی تمہاری بھی قسمت کیسی خراب نکلی۔ کیا اچھا ہوتا تمہیں رشید جیسا مشہور شاعر ملتا جو محض شاعر ہی نہیں پوتروں کا امیر بھی ہے۔ وہ قمر کے نصیبے میں لکھا تھا جسے پڑھنے لکھنے یا شعر شاعری کا ذرا بھی شوق نہیں۔ تم جو بچپن سے کتابوں کا کیڑا رہی ہو، تمہیں ایک پولیس والا ملا ہے جسے کود پھاند کے سوا اور کچھ نہیں آتا"

"میں اپنے اکھڑ پولیس والے سے خوش ہوں؛ مجھے شاعر نہیں چاہیئے"

"خدا تمہیں خوش رکھے بیٹی؛ مگر رشید صاحب کی نزاکت، دنفاستِ مزاج ایسی ہے کہ اُسے چاہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ وہ ہر وقت اپنی بیوی کی دلجوئی کا خیال رکھتا ہے"

"یہ مانا میرا پولیس مین ایسا نہیں، مگر قمر کی خوش بختی میری خوش بختی ہے"

بی مغلانی، میرے دل میں حسد پیدا کرنے کی ناکامیابی سے کچھ کھسیانی سی ہو کر رہ گئیں تھوڑی دیر بعد قمر اپنا حسین مگر بھولا چہرہ لئے آئی۔ اُس کی آنکھوں سے، نورِ مسرت کی شعاعیں

نکل رہی تھیں جسے دیکھ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا. بی مغلانی کی کوششوں کے باوجود میں اور قمر ایک دوسرے کو اتنا چاہتے ہیں، ایک دوسرے کو اتنا سمجھتے ہیں کہ ایک دوسرے کی خوشی و رنج میں پوری طرح شریک ہوتے ہیں. اُس دن قمر مجھے سناتی رہی کہ تم اُسے کتنا چاہتے ہو میں نے اس محبت کو محسوس کیا! ایک صمیمی، عمیق و وفا کار شفقت! تم میری چھوٹی قمر کے آرام کے لئے، اپنی شخصیت کو بالکل برطرف کر دیتے ہو،

اب جو تم گھر میں آئے، تو شاید صبح کی گفتگوؤں کا نتیجہ تھا یا کیا، میں بلا ارادہ، اپنے دل میں اپنی زندگی اور ماجد کا تم سے مقابلہ کرنے لگی. مجھے نظر آیا کہ گو ماجد بھی مجھے دیوانہ وار چاہتا ہے مگر اُس کی محبت مادّی ہے. تمہارا عشق قمر کے ساتھ ایک حمایہ کار، نزیہ محبت کی شان لئے ہُوئے ہے. ان دونوں محبتوں میں مجھے وہ فرق نظر آیا، جو دوزخ اور بہشت میں ہے. تم قمر کو اُس کی آرزو کے خلاف کھونٹتے نہیں، ذرا ذرا سی باتوں پر ستاتے نہیں، ساتھ ہی اس کے تمہاری محبت میں ماجد کا سا طوفان، جوش و خروش یا مردانہ مستانہ پن نہیں ہے. ممکن ہے اس بات پر، قمر کی سکونِ حیات و مسرّت منور پر مجھے تھوڑا سا غبطہ ہُوا ہو، مگر مجھے اس کی خوشی سے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں کہہ سکتی ہوں نہیں ہوا. میری زندگی کے لئے تو شاید یہ مقدرات میں سے ہے کہ ہمیشہ وہ طوفان میں سے گذرے. مجھے ایسا سکون ملتا جیسا تمہارے گھر میں ہے، یقیناً وہاں بھی طوفان شروع ہو جاتا. جیسا میں نے ابھی کہا یہ میرے مقدرات میں سے ہے.

قمر میں کس قدر تغیر ہو گیا تھا. میں نے دیکھا کہ ایک عالی روح، اور عالی فکر نے اپنی تمام خصوصیات اُس میں القا کر دی تھیں، اور عشق کے موقلم نے اپنا رنگ اُس کے حِس اُس کے فِکر میں بھر دیا تھا. شام کو جس وقت تم اُسے اپنے اشعار، یا اپنے مجوّزہ تصانیف کے خاکے یا قصوں کے پلاٹ .... سناتے تو وہ سمجھنے والی اور سمجھ کر داد دینے والی نظروں سے تمہیں دیکھتی تم قمر میں سرتاپا حلول کر گئے تھے؛ تم بھی قمر کی ہر حرکت کو مشفق و مدقق نظر سے دیکھتے تھے. میں متبسمانہ اپنے دل میں ماجد کا خیال کئے بغیر نہ رہ سکتی تھی. وہ مجھ سے کہا کرتا تھا "میں تمہارے زلف عنبرین کے ایک ٹوٹے ہُوئے بال کے بدلے میں تمہارے سارے افکار و اشعار کو نہ لوں،،

حال آنکہ تم نے قمر کے تنویر دماغ کے لئے اُس کے معمولی باتوں کی پروانہیں کی۔ اسکے بعد مجھ میں اور تم میں ایک رابطۂ دوستی شروع ہوگیا۔ اس دوستی کی اس خصوصیت میں کبھی فرق نہ آیا کہ وہ اتحادِ خیالات کی دوستی تھی۔ میں نے اپنے تخیلات وحسیات کی دُنیا میں تمہیں اپنا شریک پایا۔ مگر یہ تخیلات وحسیات وہ تھے جو دو مرد ایک دوسرے کے متعلق رکھ سکتے ہیں یا ایک دوسرے سے کہہ سکتے ہیں، ان حسیات میں جنس کا عنصر نہ تھا۔ میری طرف سے اس کا خاص التزام رہا۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ تمہارے مقابلہ میں میں اپنے چچازاد بھائی، یا اپنے دیور سے زیادہ آزادی سے گفتگو کرتی تھی۔ میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ میں تمہارے ساتھ اس قدر احتیاط کیوں برتتی ہوں۔ مجھے اس کا یقین تھا کہ تمہاری طرف میرے دل کی کوئی کمزوری نہ تھی۔ بھلا میں اس کی روادار ہو سکتی تھی کہ قمر کی آفتاب مسرت کی ضیا پاشی میں کسی ہلکے سے ہلکے بادل کا ٹکڑا بھی حائل ہو؟ میں زندگی کے ہر قدم پر دیکھ رہی تھی کہ دُنیا میں کمیاب مگر محبوب ترین چیز "وفا" ہے۔ وہ قابل رشک زندگیاں جو ہر وقت ہالۂ مسرت میں نظر آتی تھیں، میں نے دیکھا کہ وہ اس عنصر وفا کے فقدان سے گہنا گئیں، مسرتیں غموں میں تبدیل ہوگئیں۔ انسانوں کے دماغوں میں داخل ہوکر اگر وہاں کے حالات کا کشف کرنا ممکن ہوتا تو دیکھا جاتا کہ وہاں کردہ وناکردہ متصور ومخیل کیا کیا بیوفائیاں، ستم آرائیاں چھپی بیٹھی ہیں۔ مگر میں دیکھ رہی تھی کہ اک جاہل بڑھیا کی بے لگام زبان میرے متعلق سرگوشیاں کرانے لگی تھی۔ اُس نے مجھے اس قدر ڈرپوک کردیا کہ اگر کوئی مجھ سے تمہارے متعلق ذکر کرتا، تو میں یہ خیال کرتی کہ وہ جانکر میری تحقیر کر رہا ہے۔ اور مجھے یہ گمان ہوتا تھا کہ یہ زہر جو نہ معلوم کہاں سے آرہا ہے میرے شوہر تک میں سرایت کر رہا ہے، اور جب وہ تمہارا ذکر کرتا تو اُس کی نظریں پلٹی ہُوئی معلوم ہوتی تھیں۔ نوبت یہانتک پہنچی کہ جو زمانہ قمر کے گھر میں گذرتا، وہ بھی ان سرگوشیوں کی وجہ سے میرے لئے باعث تکلیف ہوتا۔ میرا وجدان متہم نہ تھا، لیکن میں چاہتی تھی کہ ان سرگوشیوں کا خود اُس سے ذکر نہ کروں۔ مجھے اطمینان تھا کہ میری چہیتی بہن میرے گلے میں باہیں ڈال کر مجھ سے کہیگی:

"میں آپ کے اور رشید کے متعلق ان باتوں کا کیسے یقین کر سکتی ہوں"

پچھلی دفعہ میں تین مہینے رہنے کے ارادے سے لکھنؤ گئی تھی، مگر صرف ڈیڑھ مہینہ

رہی کیونکہ تمہارے ہاں رہنے سے مجھے خوف آنے لگا ہے. میں اُس خوف سے بھاگتی ہوں جو بلاوجہ میرے سر پر پڑے.

جس دن ماجد نے مجھ سے ان گمنام خطوں کا ذکر کیا تھا، اُسے دو ہفتے ہو چکے تھے. کہ میں نے رسالے میں تمہاری آخری نظم پر تنقید پڑھی؛ جو سرتاپا مدحیانہ الفاظ میں تھی. تمہاری نظم کے ہزارہا نسخے بک رہے ہیں. تمہارے قلم سے وہ نظم نکلی تھی جس نے ایک شاندار مظفریت کے ساتھ تمہیں اقلیم سخن کا تاجدار بنا دیا. مگر مجھے اس نظم کی فوق العادت کامیابی اور اپنی مصیبت میں ایک رابطہ نظر آرہا ہے. اگر تم ایک معمولی آدمی ہوتے تو اس تہمت کو جو اگر واقعیت بھی رکھتی ہوتی، مرورِ زمانہ بھلا دیتا. لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا نام کسی بڑے شاعر سے، جھوٹ یا سچ کسی طرح مربوط ہو جائے، وہ ادبیات کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہتا ہے. غرضیکہ میں یہ خیال کر کے کانپ اُٹھتی تھی کہ باوجودیکہ میں بے گناہ ہوں آیندہ نسلیں مجھے اس ناپاک تہمت کے ساتھ یاد کرینگی غالباً تمہاری یہ شاندار کامیابی، ناکام شاعروں کے شعلۂ حسد کو بھڑکائیگی، اور وہ تمہاری زندگی کو داغدار بنانے کے لئے ہمیشہ اسکا ذکر کرینگے. اور گھر کی یہ بے بنیاد و بے سروپا باتیں، انکے ہاتھ لگ کر تمہیں مُلوث کرنے کے لئے شوق سے استعمال کی جائینگی. بہت ممکن ہے کہ ماجد کے نام جو گمنام خطوط آئے. اُنکے لکھنے والے یہی دنی الطبع حاسد ہوں.

میری بچی سو رہی تھی؛ میں نے اُس کے ریشمی بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ کے حضورِ قلب کے ساتھ خدا کی درگاہ میں دیر تک دعا مانگی کہ وہ یہ اتہام میرے سر سے اُٹھا لے.

اُس رات، کلب میں ایک دعوت تھی. ماجد اُس میں گیا تھا. اور یہ معلوم تھا کہ وہ دیر میں آئیگا. اس لئے میں سونے کے لئے لیٹ چکی تھی اور تھوڑی دیر بعد گہری نیند میں چلی گئی تھی.

رات آدھی گذری ہوگی. مجھے اک کرب سا محسوس ہُوا اور میں جاگی. دیکھتی کیا ہوں کہ ماجد، جس کا چہرہ زرد ہے، آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہیں ہونٹ غصہ سے کانپ رہے ہیں، جُھکا ہُوا میرے چہرے کو دیکھ رہا ہے. اُس کے مُنہ سے شراب کی بھپک نکل رہی ہے. میں کانپتی ہُوئی اُٹھ بیٹھی. ماجد جس نے کبھی شراب نہ پی تھی آج کیوں شراب میں دُھت تھا

وہ آج غیر معمولی طور پر خوش خوش گیا تھا؛ یکایک اُس میں ایسا تغیر کیوں ہوگیا. نہایت بھونڈے اور اکھڑ طریقے سے اُس نے ایک ہنٹر کو جسے وہ ایک ہاتھ میں لئے اور کمر پر رکھے ہُوئے چھُپائے ہُوئے تھا اب دکھانا شروع کیا اور کہنے لگا، "میں لایا تھا بجلی کے لئے (بجلی، ایک بازاری عورت کا نام تھا جس کے ساتھ اُس نے بیاہ سے پہلے محبت کی تھی، یہ نام اب اُس نے اپنی چہیتی گھوڑی کو دے رکھا تھا) مگر یہ نصیب میں کسی اور کے تھا"

میرا غرور سمٹ کر جمع ہوگیا، اور میں سیدھی ہو بیٹھی اور میں نے اُس آواز سے جس میں استخفاف اور جراءت دونوں ملی ہُوئی تھیں پوچھا: "مجھے مارو گے؟"

"ہاں"

"کس حق سے؟"

"اس حق سے کہ تم اپنی عصمت کھو بیٹھیں، اور انسانیت کے درجے سے نیچے گر گئیں"

میں نے غصہ سے چلا کر کہا: "جھوٹا، مفتری"

اس پر یکایک ماجد اک قدم پیچھے ہٹا، اور نرم آواز سے کہنے لگا:

"کیا تم قسم کھا سکتی ہو کہ رشید سے تمہارا کوئی تعلق نہیں؟"

اس کمینے سوال پر، میں اپنے توازن طبیعت کو کھو بیٹھی. یہ بے اعتباری اُس شخص کی طرف سے جس کے حق میں میں نے تیرہ برس کی طویل مدت میں کوئی چھوٹی سی چھوٹی ایسی حرکت نہیں کی جو بیوفائی کہلائی جاسکے مجھے پاگل کئے دیتی تھی. میں نے جواب دیا.

"میں ہرگز قسم نہ کھاؤں گی. جس عورت کو تم اس قدر رذیل سمجھتے ہو، اس سے بات ہی کیوں کرتے ہو؟ کہاں ہے تمہاری تلوار اور بندوق؟"

اُس نے کہا: "اب بھی غرور!" اور یہ کہکے اور ایک عجیب غرغراہٹ کی آواز گلے سے نکال کے اُس نے میرے سر کے بالوں کو پکڑا اور مجھے کھینچا، میں نے دیکھا کہ اُس نے ہنٹر کو اُٹھایا. میں درد سے تو ڈرتی نہیں، مگر میری عزتِ نفس جسے بچپن سے

میں نے بڑے اہتمام سے پالا پوسا تھا اور آسمان تک بلند کیا تھا، اس وقت اس قدر مجروح تھی کہ عین اس لمحہ میں۔ جب مجھ پر شڑاق شڑاق ہنٹر پڑ رہے تھے اور میری کھال اُدھڑ رہی تھی، میں چاہتی تھی کہ اس مار کی تکلیف زیادہ ہو تاکہ میرے عزتِ نفس کے پامال ہونے کی تکلیف اُس میں دب جائے۔

ماجد حیران تھا کہ وہ عورت جو معمولی دردِ سر کی تکلیف میں چیخ اُٹھتی تھی کس عناد و تکبر کے ساتھ اس مار کو خاموشی سے سہ رہی تھی، اُس نے اور زور سے مارنا شروع کیا۔ اُس درد سے جو میرے شانے سے دوڑتا ہُوا میرے قلب تک گیا، آخر کار بیتاب ہو کر میں بیہوش ہوگئی اور نہ معلوم کتنی مدت تک میں اس حالت میں فرش پر پڑی رہی کہ میرے شانوں سے اور پیٹھ سے خون بہ رہا تھا۔ سکوتِ شب کو روالور کے چلنے کی سخت و قطعی دھماکے نے توڑا، اور میں نے آنکھیں کھولیں۔ ماجد سپاہی منش ہونے کی اس صفت کے ساتھ جس سے وہ ہمیشہ متصف رہا تھا زمین پر پڑا ہُوا تھا۔ روالور کی گولی ایک کنپٹی سے دوسری کنپٹی میں نکل گئی تھی۔

اس کے بعد کا حال تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا؟ ماجد کے ہاتھ میں ایک گمنام خط پایا گیا جس میں میرے اور تمہارے تعلقات کی نسبت بہت کچھ زہر اُگلا گیا تھا یعنی یہ کہ میں جو اچانک لکھنؤ سے بھاگ آئی وہ اس لئے تھا کہ ماجد کو ہمارے تعلقات کی خبر نہ ہو جائے اس خط نے تہمتوں کو اسی پر بس نہیں کیا۔ شادی کے آٹھ برس بعد تک میرے کوئی بچہ نہ ہونا، اور قمر کے بیاہ کے بعد میرے اولاد ہونا . . . . الٰہی توبہ! الٰہی توبہ، میں نہیں لکھ سکتی۔ یہ ملعون قلم، کیا کسی قاتل کے خنجر سے زیادہ کاٹ کرنے والا نہ تھا؟ ایک ایسے دماغ کے لئے جو مہینوں سے شبہات میں مبتلا تھا، کیا یہ دلائل کافی نہ تھے؟ تھوڑے ہی زمانے میں میری بدنامی پھیلی ہوگی۔ ہر شخص نے ماجد کے ساتھ ہمدردی کی۔ اُسکے جنازے پر سارا شہر آیا، اور ہر شخص نے مجھ پر لعنت کی۔

ماجد زندگی میں جیسا میرے ساتھ رہا سو رہا، مرتے وقت بھی میرے ساتھ بُرائی کر کے گیا۔ میرے ساتھ کسی نے وفا نہیں کی، مگر میں نے اپنی ہر حرکت اور ہر بات

میں وفاکار و راست باز رہنے کی کوشش کی. اس کا عوض مجھے یہ ملا کہ جس شخص پر میں نے اپنی عمر کے بہترین تیرہ برس قربان کر دیئے اُس نے مجھ پر اعتبار نہ کیا اور تا ابد مجھے رسوا کیا. جو آدمی میرا اتنا محرم تھا، جب اُس نے ہی میری بات پر یقین نہ کیا اور اس حد تک یقین نہ کیا کہ اپنے سر میں گولی مارلی، تو اب اور کون یقین کریگا۔ اس خودکشی نے شُبہ کو قطعیت، مطلقیت کا درجہ دیدیا. اب کون اسے روک سکتا ہے کہ تاریخ میں میرا نام اس طرح درج ہو کہ یہ وہ ننگ ناموس عورت تھی جس نے اپنی بہن کے ساتھ بیوفائی کی اگر ماجد یہ کہکر خودکشی کرتا کہ میں اپنے چچا کے بیٹے یا اور کسی کو چاہتی ہوں تو بھی میں عمر بھر کے لئے رسوا اور بدنام ہوتی. مگر اب شاعر بے ہمتا، رشید کی سوانح عمری لکھنے والے لکھیں گے کہ اُس کی بیوی کی بہن نے اُس کے ساتھ عشق کیا، اور اس بنا پر اُس کے خاوند نے خودکشی کی۔ اسے ایک واقعہ قرار دیکر، بہت کچھ رنگ آمیزیاں کی جائینگی۔ لوگ تمہیں معذور خیال کرینگے مگر مجھے مسئول۔ الہی، میں نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے جس کے پاداش میں ایسے خوفناک افترا و بہتان پر بھینٹ چڑھائی جا رہی ہوں. مگر ایک بے پروا اور میرا مضحکہ اُڑانے والا مقدر کہتا ہے کہ ہاں تجھ پر ہمیشہ ہمیشہ یہ بہتان تھپے گا. آہ! اب مجھ میں نہ اس کی جرأت نہ اس کی آرزو کہ میں لکھنو آؤں. میں اس سوسائٹی سے جو مجھے اُس گناہ پر جس کی میں مرتکب نہیں ہوں ملعون قرار دیتی ہے میری زندگی کو برباد کرتی ہے، دور بھاگنا چاہتی ہوں اپنی زندگی، اپنی بدبخت بچی کے ساتھ کسی نامعلوم گوشے میں جاکر بسر کروں گی. کسی کو خبر نہ ہوگی کہ میں کہاں چلی گئی. میری بچی جب جوان ہوگی، اس وقت میں اُسے سب حال بتاؤں گی. مگر تم سب مجھے پھر نہ دیکھوگے. میں ایک راز ایک معما بن کر غائب ہو جاؤنگی اور میرے لئے کسی کی آنکھ سے نہ ایک قطرہ آنسو کا نکلیگا، اور نہ کسی ہونٹ سے ایک کلمۂ افسوس. عزیز و اقربا جان پہچان والے سب ہمیشہ لعنت ہی بھیجیں گے.

میں جنہیں پیچھے چھوڑ رہی ہوں، ان میں صرف تم ہی ہو جسے میری بیگناہی کا علم ہے مگر اُس بیگناہی کو ثابت کرنیکا اقتدار نہیں. میں اب بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے

یہ خط تمہیں کیوں لکھا. مگر تم سے التجا کرتی ہوں کہ اس خط کو قمر کو مت دکھانا. کیونکہ مجھے خوف ہے کہ جس بہتان پر سارا خاندان یقین کر رہا ہے، شاید وہ بھی یقین کرنے لگی ہو. میں اُسے معاف کرتی ہوں. دیکھو، مجھے اس خیال سے تسلی ہوتی ہے کہ میری اکلوتی بہن کی زندگی کی خوشی تمہارے ہاتھ میں ہے. میری عزتِ نفس قبول نہیں کرتی کہ تمہارے سوا اور کسی کو اپنی بے گناہی منوانے کے لئے کچھ لکھوں، مگر ہاں یہ حسرت ضرور اپنے ساتھ لئے جاتی ہوں کہ اگر میری طرف سے میری بہن کے دل میں غلط خیالات جاگزیں ہو گئے ہیں وہ دور ہو جاتے.

میں تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں کہ مجھے سمجھنے والے صرف تم ملے ہو. تم کہ میرا تمہارا کوئی ساتھ نہیں رہا تم نے مجھے اُس آدمی سے زیادہ پہچانا جس کے ساتھ میں نے تیرہ برس گذارے کیا تمہارا ایمان نہیں ہے کہ مجھ سے ایسی حرکت سرزد نہیں ہو سکتی؟ میری سیاہ روح میں اب صرف یہی ایک منور نقطہ ہے. کہ جب ساری دُنیا مجھے ملوث خیال کر رہی تھی تم جانتے تھے کہ میں بے گناہ و پاک ہوں اک دن میری بیٹی بھی اِسے جانے گی.

تم سے میری اک آخری التجا اور رہ ہے اسے ایک بیاہی ہوئی عورت کی آخری آرزو سمجھ کر سنو! تم متاذی و مضطرب ہو کہ اس مصیبت کے سبب تم ہوئے جس نے مجھ پر وہ داغ لگایا جو اب دُھل نہیں سکتا اور جو مجھے دائمی جلاوطنی میں بھیج رہی ہے، مگر میری آرزو ہے کہ میرا نام تمہارے لئے اک عذاب، اک تاسف نہ ہو. بس میں تم سے اس قدر آرزو رکھتی ہوں کہ جب تم میرا نام لو تو یہ خیال کرو کہ میں وہ ہوں جس نے جنس نسواں میں تمہیں اور تمہارے کلام کو سب سے بہتر سمجھا.

یقین مانو کہ زندگی مصیبتوں میں کاٹنے، پھر بھی زندہ رہنے کی ہمت مجھ میں صرف ایک اسی کی وجہ سے ہے؛ میری لڑکی!

تاریخ تو مجھے کیا کچھ کہکر یاد کریگی، مگر تم جب میرا خیال کرنا تو یہ خیال کرنا کہ تمہاری اک بہی خواہ ہے جو انتہائے بعید سے تمہاری کوششوں، تمہاری کامیابیوں، تمہاری خوشیوں کو دیکھ رہی ہے، اور تمہارے لئے سعادت دین و دنیا کے حصول کی دُعا کر رہی ہے. کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا؟

(ملخص) سید سجاد حیدر

گردشِ زمانہ

۱

بہادر شاہ خاندان مغلیہ کے چراغ سحری تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں بادشاہ نہیں تھے۔ ان کا نصف وقت یادِ خدا میں کٹتا تھا، نصف وقت غزلیں کہنے میں۔ ملکی معاملات سے اُن کو چنداں دلبستگی نہ تھی۔ مگر اُن کے عہد میں بدامنی ہو یہ بات نہ تھی۔ وہ رعایا کی بہبودی کا بدرجہ اتم خیال رکھتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے۔ کہ اگر میری رعایا کو تکلیف ہے۔ تو اُن کا جواب دہ حشر میں مَیں ہوں گا اور اُن کی فریادیں ہاں میرا دامن پکڑیں گی۔ وہ بچوں کے بہت شایق تھے، اور اُن کی بھولی بھالی باتیں سُن کر بہت مسرور ہوتے تھے۔ اپنے وقت کا بیشتر حصہ وہ اپنی پوتی نرگس نظر کے ساتھ کھیلنے میں صرف کرتے تھے۔ اس کھیل میں اُنہیں روحانی حظ حاصل ہوتا تھا۔ اکثر فرمایا کرتے۔ بچوں کی بادشاہت دنیا بھر کی محفلوں سے لاجواب ہے۔ ان کی سادگی، اُن کی شوخی، اُن کی معصومیت دیکھ کر مورِ دل رقص کرنے لگتا ہے اور طبیعت پر روحانی سرور چھا جاتا ہے نرگس کو وہ قصر شاہی کی مینا کہا کرتے تھے۔ وہ اُن کے لڑکے کی لونڈی کے پیٹ سے تھی۔ تاہم انکو اُس سے اتنا پیار تھا کہ جب تک اُسے دیکھ نہ لیتے تب تک چین نہ آتا تھا یہاں تک کہ اُنھوں نے حکم دیدیا تھا۔ کہ جب تک نرگس نظر نہ آجائے۔ تب تک دسترخوان نہ چُنا جائے۔ اس حکم کی سختی کے ساتھ پابندی ہوتی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ نرگس نظر بیمار ہوئی۔ بہادر شاہ دو راتیں سرہانے بیٹھے رہے۔ قصر شاہی میں قیامت آگئی۔ چاروں طرف آدمی اس طرح دوڑتے پھرتے تھے گویا کسی دشمن نے حملہ کر دیا ہو۔ وزرا نے بہت زور دیا، مگر بہادر شاہ نے سُنا ان سُنا ایک کر دیا اور نرگس نظر کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ اُس کا بخار اُتر گیا۔

اُس وقت نرگس نظر کی عُمر ۶ سال کی تھی۔

۲

۱۸۵۷ء کا سال آیا، ملک پر تباہی کی گھٹائیں چھاگئیں۔ پوربیوں نے آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے شہزادہ میرزا مغل کی فوج بھی اس رو میں بہ گئی جس طرح پانی کے دھارے میں گھاس کا تنکا بہ جاتا ہے۔ مگر وہ اپنا جرنیل سوائے میرزا مغل کے اور کسی کو نہ مانتے تھے۔ ایک سپاہی، دوسرے بدامنی کے دن۔ اُن کے سر پر جنون سوار تھا۔ گویا کسی نے بندر کو شراب پلادی ہو۔ من مانی کارروائیاں کرنے لگے۔ میرزا مغل یہ دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں کڑھتے تھے۔ اس وقت اُن کی حالت اُس سوار سے مشابہ تھی۔ جس کا گھوڑا قابو میں نہ ہو۔ اور موت کے رستے پر سرپٹ دوڑ رہا ہو۔ وہ اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کرتے تھے لیکن اُن کی کوئی پیش نہ جاتی تھی۔ باغی سپاہی بھوکے بھیڑیوں کی طرح دوڑتے پھرتے تھے۔ میرزا مغل نے انہیں بارہا سمجھایا۔ لیکن کسی نے پروانہ کی میرزا مغل سوچتے تھے یہ ہو کیا رہا ہے۔ ایک طرف مجھے جرنیل کہتے ہیں۔ میرے نام پر سب کچھ کرتے ہیں۔ دوسری طرف میری آواز کو سننا بھی پسند نہیں کرتے گویا میں شطرنج کا بادشاہ ہوں۔ جہاں چاہتے ہیں، اُٹھا کر رکھ دیتے ہیں۔ میرزا مغل کی جان عذاب میں آگئی۔

صبح کا وقت تھا، میرزا مغل لال قلعہ کی چھت پر کھڑے تھے اور دیوان خاص کے سامنے میدان میں باغی انگریز عورتوں اور بچّوں کو قتل کر رہے تھے۔ نرگس نظر نے یہ خونفشاں منظر دیکھا۔ تو اُس کا ننھا سا دل سہم گیا۔ جس طرح بچے دوسرے بچّوں کو پٹتا دیکھ کر رونے لگتے ہیں۔ وہ باپ کے پیروں کو چمٹ گئی اور بولی:۔ ”ابا ان کو بچالو“

میرزا مغل پہلے ہی بددل [illegible] تھے۔ بیٹی کی درخواست سُن کر اور بھی رنجیدہ ہو گئے۔ اُنکی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے بیکسانہ انداز سے بولے ”بیٹی کیا کروں۔ وہ میری نہیں مانتے۔“

نرگس نظر کو بہادر شاہ کے لاڈ پیار نے حکم دینے کا عادی بنا دیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی۔ کہ جس طرح محل میں میرا حکم ہر اک شخص مانتا ہے۔ اُسی طرح سپاہی بھی مانیں گے اور میرے کہنے پر تلواریں جھکا لیں گے۔ اُس نے بے صبری سے کہا:۔ ”تو انہیں میں جا کر کہوں۔ وہ میرا کہا

نہیں ٹالیں گے"

میرزا مغل نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا" وہ تمہاری بھی پروا نہیں کرینگے"

"تو صاحب عالم اُن سے خفا نہ ہوں گے؟"

مولوی عین اللہ نرگس نظر کے اُستاد تھے۔ وہ بھی وہیں کھڑے تھے۔ اس سادگی نے اُن کے سینہ میں جذبات کا ہجوم برپا کر دیا۔ جس طرح کنکر سے تالاب کا پانی ہلنے لگتا ہے۔ وہ جرأت کر کے آگے بڑھے اور بولے۔ "حضور وہ آپ کو اپنا کما نڈر کہتے ہیں"

میرزا مغل نے اُن کی طرف اس طرح دیکھا، گویا مولوی صاحب نے اُن کی تحقیر کی ہے اور بیکسی سے کہا" ہاں"

"تو آپ اُنہیں روکتے نہیں۔ ذرا خیال کیجئے۔ ماؤں کی آنکھ کے سامنے معصوم بچے ذبح کئے جا رہے ہیں۔ ان کی معصوم فریاد عرش کے کنگورے ہلا دیگی"

میرزا مغل کے رو کے ہُوئے آنسو آنکھوں میں آ گئے۔ گلوگیر آواز میں بولے۔ "مولویصاحب! وہ نہیں مانتے۔ پتہ نہیں۔ اُن پر کسی نے کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ میری ذرا بھی پروا نہیں کرتے"

مولوی عین اللہ نے چند منٹ تک سکوت کیا۔ جس طرح کوئی دریا میں کودنے سے پیشتر اپنے جسم کو تولتا ہے۔ اور پھر بولے "تو میں جاؤں؟"

"کہاں؟"

"ان کو جا کر سمجھاؤں۔ شاید میری بات اُن پر اثر کر جائے"

میرزا مغل گھبرا گئے۔ اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر بولے" نہیں ایسا نہیں ہو سکتا"

"مگر کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"وہاں خطرہ ہے"

"مَیں اُس کے لئے تیار ہوں"

میرزا مغل نے باغیوں کی طرف نگاہ کی۔ وہاں حشر کا منظر بپا تھا۔ اُن کے جگر پر چھریاں چل گئیں۔ اُنہوں نے جلدی سے نگاہ پھیر لی اور مولوی عین اللہ سے بولے" وہ آپ کو ہلاک کر دیں گے"

مولوی صاحب نے سینہ تان کر جواب دیا" تو معمولی بات ہے۔ آخر کسی نہ کسی دن مرنا ہی ہے۔ اب ہمیشہ تھوڑا ہی جیتا رہوں گا"

یہ کہکر انھوں نے نرگس نظر کو پیار کیا۔ میرزا مغل سے بغلگیر ہوئے۔ اور دیوان خاص کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن ابھی نیچے تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ کسی نے قتل کر دیا۔ دوسروں کو بچانے گئے تھے۔ خود شہید ہو گئے۔ نرگس نظر رونے لگی۔

۳

رات ہو گئی تھی۔ لال قلعہ میں اداسی کا دورہ تھا۔ یہی جگہ تھی۔ جہاں اس وقت کافوری شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ اور نوکروں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لیکن آج وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جس طرح میلے کے اختتام پر ہو کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ یا بیاہ شادی کے بعد افسردگی چھا جاتی ہے۔ اتنے میں دروازے سے ایک بیل گاڑی نکلی۔ جس میں نرگس نظر، اس کی ماں اور ایک مرد ملازم سوار تھے۔ دہلی کو انگریزوں نے فتح کر لیا تھا۔ بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اور میرزا مغل اپنی جان چھپاتے پھرتے تھے۔ نرگس نظر کی ماں نے قلعہ کی طرف دیدہ حسرت سے دیکھا اور آہ سرد بھر کر گاڑیبان سے بولی "چل بھائی لے چل"

کیسا حسرتناک موقعہ تھا۔ وہی نرگس نظر اور اُس کی ماں جو مخمل پر سوتی تھیں۔ پھولوں پر چہکتی تھیں۔ اس وقت جان بچانے کے لئے تاریک رات میں بھاگی جا رہی تھیں۔ وہ عروج کے دن تھے۔ اُس وقت رشک کو خود اُن پر رشک تھا۔ اب زمانہ تبدیل ہو گیا تھا۔ اِس وقت اُن پر ذلت بھی ہنس رہی تھی۔

لیکن اِس ذلت کی کسے پروا تھی۔ خیال یہ تھا۔ کہ کسی طرح اس آگ سے نکل جائیں موت کے خوف نے ذلت کا خیال دل سے خارج کر دیا تھا۔ گاڑی کسی بدنصیب کی طرح ہچکولے کھاتی ہوئی روانہ ہوئی۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس تاریکی نے ان کی بہت امداد کی۔ روشنی ہوتی۔ تو بھاگنا دشوار ہو جاتا۔ مگر ابھی چھتر پور ہی پہنچے تھے۔ کہ آسمان میں چاند نے سر نکال لیا۔ بد قسمت قافلہ پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ کہیں اندھیرا مل جائے

تو اس میں سما جائیں لیکن چاند نے کام خراب کر دیا۔ وہ اس چاندنی سے اِس طرح ڈرتے تھے جس طرح آنکھوں کا مریض سورج کی شعاعوں سے ڈرتا ہے۔ بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ وہاں بینائی کو خطرہ ہوتا ہے۔ یہاں جان کا اندیشہ تھا۔ نرگس نظر کی ماں گھبرا گئی۔ اُس نے دل ہی دل میں سینکڑوں منتیں مانیں۔ خدا کے حضور میں دعا کی۔ روئی۔ گڑگڑائی لیکن ان تدبیروں سے جو ہونا تھا وہ نہ رکا۔ یکایک دُور سے غبار اُٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ یاس نے پر پھیلا دئے گاڑیبان نے گھبرا کر کہا:" سرکار کوئی آوے ہے"

سب کے بدن کانپنے لگے۔ موت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ داروغہ قدرت خاں نے جان پر کھیل کر باہر جھانکا اور پوچھا:" کیا ہے رے؟"

مگر آواز لرز رہی تھی۔

گاڑیبان نے غبار کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر کہا:" سرکار کوئی جرور جرور آوے ہے"

اول اول شبہ تھا۔ کہ ممکن ہے آنکھ کی غلطی ہو۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد یقین ہوگیا۔ کہ کوئی آرہا ہے۔ پر کون ہے؟ یہ کہنا آسان نہ تھا۔ کبھی کبھی یہ بھی خیال گذرتا تھا۔ کہ ممکن ہے اپنے ہی آدمی ہوں۔ جس طرح تاریکی میں بجلی چمکتی ہے۔ چند ساعت امید و بیم کی حالت رہی یہاں تک کہ وہ جماعت قریب آگئی۔ اُمید کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ گیا یہ باغی تھے۔ جنہیں ناکامی نے درندوں سے زیادہ خونخوار اور چیتوں سے زیادہ تند بنا دیا تھا۔

قدرت خاں نے گاڑی بان سے کہا۔ گاڑی روک لو۔ اور خود تلوار لیکر گاڑی سے کود پڑے پر ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ عورتیں رونے لگیں۔ گاڑی بان کے اوسان خطا ہو گئے۔ اتنے میں سپاہی نزدیک آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں بھالے تھے، آنکھوں میں خنجر۔ آتے ہی بولے:" جو کچھ پاس ہے رکھدو۔ ورنہ جان کی خیر نہیں"

قدرت خاں نے کہا:" یارو! تم ہمارے ہی آدمی ہو۔ تمہیں ہم پر رحم کرنا چاہیئے"

ایک سپاہی نے حیرت سے پوچھا:" تم کون ہو؟"

"صاحب عالم بہادر شاہ کے آدمی ہیں"

تنے ہوئے بھالے نیچے جھک گئے۔ جیسے کسی نے منتر پڑھ دیا ہو۔ معاً ایک سپاہی

نے کہا "تو تمہیں نے تو ہمیں شکست دلائی ہے۔ ورنہ ہم راج نہ حاصل کر لیتے"
منتر کا سحر ٹوٹ گیا۔ گیا ہوا قہر واپس آگیا۔ سپاہیوں نے بگڑ کر کہا "ٹھیک ہے تم ہی نے تو ہمارا کام خراب کیا ہے"
قدرت خاں نے جواب دیا "کبھی تم ہماری آنکھوں کے اشارے دیکھتے تھے۔ آج قسمت نے آنکھیں چرائی ہیں۔ تو تم بھی دھمکیاں دینے لگے۔ یہ طوطا چشمی کسی مذہب میں روا نہیں"
"ارے بک بک کیا لگائی ہے۔ رکھ دے جو کچھ پاس ہے"
ایک دوسرے سپاہی نے پوچھا "گاڑی کے اندر کون ہے؟"
"شاہی خاندان کی اک خاتون ہیں۔ ان کا احترام کرنا جیسا میرا فرض ہے، ویسا ہی تمہارا بھی ہے"
"مارو سالے کو۔ باتیں بناتا ہے"
مہلت خوف رفع کرنیکا بہترین نسخہ ہے۔ قدرت خاں کے لئے یہ مہلت اکسیر ہو گئی اُن کا خوف جاتا رہا۔ شاہی وفاداری کا جذبہ رگ وپے میں لہرانے لگا۔ آنکھوں میں دلیری آگئی۔ بیباکی سے تلوار نکا کر بولے "زبان سنبھال کر بول۔ میں اپنی جان لڑا دوں گا"
"یہ بات ہے۔ یہاں تک حوصلہ؟"
"تو تم جب مجبور کرتے ہو۔ تو اور کیا کیا جائے۔ میں شاہی حرم کی بے ادبی نہ ہونے دونگا"
"موت کو بلا رہے ہو"
"اگر موت ہی آئی ہے تو کون ہے جو بچا سکیگا؟"
یہ کہکر داروغہ نے سپاہیوں پر وار کیا۔ مگر سپاہی تعداد میں زیادہ تھے۔ اس پر پایوسی نے ان کو نتائج سے بے پروا کر دیا تھا۔ داروغہ قدرت خاں جلد ہی مارے گئے گاڑی بان نے اُن کا یہ انجام دیکھا۔ تو جان بچا کر بھاگا۔ نرگس نظر اور اُس کی ماں دونوں رو رہی تھیں۔ دلی سے بھاگی تھیں۔ مگر یہ خیال نہ تھا۔ کہ قسمت میں یہ بھی بدا ہے۔ سپاہیوں نے اُن سے زر و جواہر سب کچھ چھین لیا۔ اور فتنے کی صورت آئے تھے قرار کی صورت چلے گئے ماں بیٹی کی

چیخیں نکل گئیں۔ وہ اس وقت ان ڈاکوؤں کے ساتھ کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ کبھی وہ ان کی صورت سے بھی خوف کھا جاتیں۔ مگر اس وقت اُنہی کا ساتھ زندگی کا سہارا معلوم ہو۔ واقعات نے حالات کو پلٹا دیدیا تھا۔ انہیں روتے دیکھ کر اُن ظالموں کا بھی دل پسیج گیا ایک نے نرگس نظر کو گھوڑے پر بٹھا لیا۔ اُس کا دل محبت کا سوتا بنا ہوا تھا۔ دوسرے نے نرگس نظر کی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس پر حسن نے وار کیا تھا۔ ماں بیٹی کے رستے الگ ہو گئے

۴

دوسرے دن نرگس نظر سوہانہ پہنچی۔ یہ ضلع گڑگاؤں میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہ سوار وہیں کا رہنے والا تھا۔ وہ ذات کا گھوسی تھا۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی اس گوہر نایاب کے لئے اُس نے سینکڑوں جتن کئے، لیکن دل کی مراد بر نہ آئی۔ علاج کئے، تعویذ پہنے منتیں مانیں۔ سادھوؤں کی سیوا کی اور عمر عزیز کے بہت سے سال گذار دئے۔ لیکن خانہ بے چراغ بدستور تیرہ و تار رہا۔ یہاں تک ۱۸۵۷ء کا منحوس سال آگیا۔ اُس کا سینہ پتھر کا تھا، دل لوہے کا۔ محبت کے نغموں سے اُسکے کان مطلقاً آشنا نہ تھے۔ باغیوں میں شامل ہو گیا۔ اور انسانی زندگیوں کو تباہ و برباد کرنے لگا۔ مولوی عین اللہ کو دن دہاڑے قتل کرنیوالا یہی گھوسی تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ جب وہ گھوسی اپنے مکان پر پہنچا۔ اور نرگس نظر کو دروازے پر ٹھہرا کر اندر گیا۔ اُسکی بیوی نے اُسے دیکھا۔ تو مسرت سے جھومنے لگی اُسے اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں وہ مارا نہ گیا ہو۔ اس خیال سے اُسکو ساری رات نیند نہ آئی تھی۔ اب اُسے صحیح و سالم دیکھ کر اُسکی آنکھوں میں رونق آگئی شوہر سے لپٹ کر بولی "اب گھر سے نہ نکلنا۔ وقت نازک ہو رہا ہے۔ تم گھر سے چلے جاتے ہو، تو میرا دل اداس ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے خیال ستانے لگتے ہیں"

گھوسی نے اطمینان سے جواب دیا "اب نہ جاؤنگا"

"اب تک کہاں تھے؟"

"لوٹ مار کرنے گیا تھا"

اس وقت تک گھوسن کو اس کا خیال نہ تھا۔ مگر شوہر کو سلامت دیکھ کر ہوس نے بھی گردن بلند کی۔ بولی "تم کو بھی کچھ ہاتھ لگا؟"

"لگا کیوں نہیں؟"

"کیا؟"

"تم ہی بتاؤ"

"روپیہ پیسہ"

"اُس سے بڑھ کر"

"سونے کے زیور؟"

"یہ بھی نہیں"

"ہیرے موتی جواہر؟"

"نہ"

"تو پھر اور کیا ملا، جس پر اِتنا پھُول رہے ہو؟"

گھوسی نے آنکھیں مٹکا کر جواب دیا "ایک نہایت خوبصورت چھوٹی سی لڑکی"

گھوسن کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر شادمانی کھیلنے لگی، بیتابی سے بولی "تو کہاں ہے۔ ہم اُسے اپنی بیٹی بنا لیں گے"

"باہر ہے۔ جاکر لے آؤ۔ میں بھی یہی چاہتا تھا"

گھوسن باہر گئی۔ اور نرگس نظر کو گلے لگا کر رونے لگی۔ وہ ذات کی نیچ تھی۔ مگر اُسکا دل بُرا نہ تھا۔ اُسے نرگس نظر پر بے اختیار ترس آگیا۔ اُسے ایسا محسوس ہُوا۔ گویا وہ اُسکی بیٹی ہے۔ اور اُسے کئی سالوں کی جدائی کے بعد ملی ہے۔ قدرت نے نرگس کی ماں کا پیار گھوسن کے سینہ میں تبدیل کر دیا اُس رات خاوند بیوی کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ ان کو وہ چیز مل گئی تھی۔ جس کے لئے وہ کئی سالوں سے بیتاب و مضطرب تھے۔ اور دن رات روتے رہتے تھے۔ غدر نے اُنکی پُرنم آنکھوں کو خشک کر دیا۔ لیکن افسوس یہ خوشی محض ایک شب کی خوشی تھی۔ جو چاند کی چاندنی کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ صبح کو انگریزی سپاہ

نے گھوسی کو گرفتار کرلیا اور دلی لے گئے۔ وہاں پچاسوں آدمیوں نے شہادت دی۔ کہ یہ باغیوں میں شامل تھا۔ حکام نے اُسے پھانسی کی سزا دی۔ گھوسن نے یہ سُنا۔ تو پچھاڑ کھا کر گر پڑی اور کئی دن تک بیمار رہی۔ نرگس نظر نے اُس کی تیمارداری میں اپنی جان لڑادی۔ ماں کھو کر اُس نے ماں کی قدر جانی تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ اب یہ گھوسن زندہ رہے، اب اُس کی یہی آرزو باقی رہ گئی تھی۔ مگر اُس کی تمام کوشش بے کار ہوئی۔ گھوسن جانبر نہ ہو سکی ——— نرگس نظر اب دنیا میں اکیلی تھی، بے یار و مددگار۔ وہ جب کبھی ماضی کے پرشکوہ ایام کو یاد کرتی۔ تو آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگتے۔ اور پہروں ہچکیاں بندھی رہتیں لیکن بے بس تھی۔ گوئیں ہانکتی تھی، اُپلے تھاپتی تھی۔ اور روکھی سوکھی کھا کر جہاں جگہ ملتی، وہاں پڑ رہتی تھی۔

۵

اسی طرح کئی سال گذر گئے۔ نرگس نظر جوان ہوئی۔ اُس کے مست شباب حسن کے جلوؤں سے سارا گاؤں منور ہو گیا۔ قدرت نے اُس کے والدین چھین لئے تھے۔ آرام و آسایش پر قبضہ کرلیا تھا۔ لیکن اُس کے حسن پر اُس نے بھی قبضہ نہیں کیا۔ پہلے دن رہتے، تو شہزادوں کے پیغام آتے۔ لیکن اب وہ دن کہاں تھے؟ کسی نے کپڑے دئے، کسی نے برتن۔ اور نرگس نظر کا نکاح ایک گھوسی کے ساتھ کر دیا۔ اس وقت اُسے بہادر شاہ کا زمانہ یاد آگیا۔ جب روپیہ پیسہ کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ مگر آج .... نرگس نظر کے دل پر چوٹ لگی۔ اور منہ لال ہو گیا۔

نکاح کے بعد تخلیہ ہوا، تو گھوسی شوہر نے کہا "دیکھو تم نے شاہی گھرانے کی روٹیاں کھائی ہیں۔ یہاں وہ حکومت نہ چلے گی۔ بہتر یہی ہے کہ اب وہ دن بھول جاؤ۔ اور غریبانہ زندگی بسر کرو۔ ورنہ یاد رکھو مار مار کر ہڈیاں توڑ دوں گا"

نرگس نظر کے سینہ میں تیر سا لگا۔ وہ متواتر کئی سالوں سے تکلیفیں اُٹھا رہی تھی۔ اُنہیں اُس نے عورت ذات ہو کر ہمت مردانہ سے برداشت کیا تھا۔ مصیبتوں کی آندھی میں وہ سیدھی کھڑی رہتی تھی۔ سوچتی تھی۔ رونے سے کیا حاصل ہے اب وہ

دن واپس تھوڑے ہی آجائیں گے۔ شاہی غیرت ذلت کی تشہیر کے رستہ میں حائل ہوجاتی تھی۔ لیکن اُسے یہ خیال خواب میں بھی نہ تھا۔ کہ شادی کے پہلے ہی دن خاوند اُسے اِس طرح کے ذلت آفرین الفاظ میں مخاطب کرے گا۔ وہ کام کاج سے نہ گھبراتی تھی۔ نہ غریبانہ زندگی اُسے دُوبھر تھی حالات نے اُسے ان باتوں کا عادی بنادیا تھا۔ لیکن کیا اُس کی قسمت میں چار ہمدردی کے الفاظ بھی نہ تھے۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک وہ دن تھا۔ جب ان آنسوؤں پر موتی نثار ہوتے تھے۔ لیکن آج یہ حسین پانی کتنا حقیر، کس قدر کم بضاعت ہوگیا تھا۔ گردشِ زمانہ نے اُس کی قدر و قیمت کو مٹی میں ملا دیا تھا۔

سُدرشن

دوشیزۂ فرانس

اِس غازیۂ حریت کی زندگی دو دور پر منقسم کی جاسکتی ہے پہلا دورِ ہمت و شجاعت۔ دوسرا دورِ ایثار و قربانی۔ پہلا دور اُن واقعات پر ختم ہوتا ہے جن کا انجام دوشیزہ کی گرفتاری ہوا یہاں تک ناظرینِ ہمایوں اُس کے حالاتِ سیرت کا مطالعہ کرچکے ہیں۔ بقیہ حصہ بوجہ عدم گنجایش تین ماہ کے بعد شائع ہونا شروع ہوگا۔

د۔ ر

اطلاع

دسمبر کے پرچے میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ انعامی نمبر فروری میں شائع ہوگا۔ لیکن بوجوہات چند یہ فیصلہ کیا گیا کہ فروری کے بجائے مارچ کا رسالہ انعامی نمبر ہو۔

سیدھے رستے چل

سیدھے رستے چل اگرچہ تُو تنہا ہی کیوں نہ ہو! صرف جمِ غفیر کے ساتھ ملنے کے لئے اُن کے پیچھے نہ ہو لے!

راستی عموماً تنہا رہتی ہے لیکن اپنی تنہائی میں مسرور و شاداں! اُس کا گذر اکثر تاریک رستوں سے ہوتا ہے لیکن اس تاریکی میں وہ ہمیشہ بے خوف رہتی ہے کیونکہ وہ اک نورانی ہستی ہے جسکی پیشانی میں سُرخ و سبز روشنیاں کھیلتی ہیں!

کج روش لوگوں کے لئے تنہائی تہور سوز ہوتی ہے اور تاریکی جانگداز! اور یہی وجہ ہے کہ دشتِ زندگی میں جمِ غفیر کے ساتھ ملنے کی غرض سے وہ دُنیا کی گرد آلود شاہراہ پر چلتے ہیں اور اپنی دنائتِ نفس سے غیروں کی مصاحبت اور تمسخر میں پناہ ڈھونڈھتے ہیں۔

سیدھے رستے چل اگرچہ تُو مادی خسارہ اُٹھائے اگرچہ تُو دنیا کے جاہ و حشمت کو اپنے ہاتھوں سے کھو بیٹھے۔

کب تک تُو اوروں کا مال سمیٹ کر خوش ہو لیا کریگا؟ کب تک یہ مسروقہ خوشی تیری نقاہتِ قلبی کو تجھ سے چھپائے رکھیگی؟ آخر کب تک تُو اِن کلیوں کا ہار اپنے گلے سے لگائے رکھیگا۔ جو زہریلے کانٹوں کی طرح روز بروز تیرے جان و جگر میں پیوست ہوئی جاتی ہیں؟

تُو شیوۂ راستی اختیار کر اور دیکھ کہ تو نت کس طرح تیرے دل میں اُمڈی چلی آتی ہے، اطمینان کیونکر تیرے لئے اپنا سائبان پھیلا دیتا ہے فقط لوگوں سے مل بیٹھنے کیلئے اُنکی خالی و بے بنیاد عشرتوں میں حصہ نہ لے اگرچہ وہ تجھے خشک مزاج اور روا اڑدوں طبع ہی کیوں نہ کہیں!

خوشی زندگی کیلئے آبِ حیات ہے لیکن عشرت خوشی نہیں۔ عشرت تو اک ملمع ہے جو خوف یا بے مائگی کو عارضی مسرت کا فریب کار جامہ پہناتا ہے اور سچی خوشی صرف ضمیرِ بے داغ کی جھلک سے پرتو افگن ہوتی ہے۔ دنیا داروں کی مصاحبت اکثر منافقت کے بازاروں سے ہو کر مغائرت کے گلی کوچوں میں پہنچتی ہے جہاں محبت نام نہاد ہوتی ہے اور ایثار خود نمائی! بھلا ایسے لوگوں کی دوری میں اُس عیش کا کیا سہارا ہے جو تُو نے اُنکی صحبت سے مستعار لیا؟ وہ اُنکی صورتوں میں اک بے معنی قہقہہ کی طرح خندہ زن ہے، وہ اک مصنوعی پھُول ہے جس میں رنگ ہو بغیر بُو کے اور دل لگی بغیر دلدہی کے!

تُو سیدھے رستے چل اگرچہ اس دل لگی سے ناآشنا ہو کر تجھ سے تیرا دل کچھ دنوں ناخوش رہے کیونکہ یہ سطحی اُداسی جوہرِ اطمینان ہے اور اُس مسرت کے آغوش میں پرورش پاتی ہے جو قلبِ انسان میں چھپی رہتی ہے اُس چشمۂ شیریں کی طرح چھپی ہوئی جو کسی دُور اُفتادہ وادی کو اپنے بہتے ہُوئے پانی سے سرسبز و شاداب رکھتا ہو! تُو بھی اسرارِ مضمر کے ربط سے ضبطِ نفس حاصل کر اور ہمیشہ سیدھے رستے چل اگرچہ جادۂ زیست میں تُو تنہا اور بے یار و مددگار ہی کیوں نہ ہو!!

د ب

محفلِ ادب

مادہ اور قوت۔ مادیوں کا ایک فرقہ کہتا ہے، کہ مادہ اور قوت دو مستقل چیزیں ہیں، جو ایک دوسرے پر عمل کرتی رہتی ہیں، اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مادہ اصل ہے اور قوت اُسکی تابع ہے، (یعنی قوت مادہ کے خواص میں سے ایک خاصہ ہے) وہ کہتے ہیں کہ مادہ میں بقا، جذب، اور حرکت کے خواص پائے جاتے ہیں، حرکت ہی کا دوسرا نام قوت ہے، اس لئے قوت بھی مادہ کا ایک خاص حصہ ہُوا۔ ایک اور طبقہ کہتا ہے۔ کہ قوت ہی حقیقت میں موجود ہے، اور مادہ قوت کا ایک مظہر ہے، وہ اپنے مذہب کی بنا اس پر قائم کرتے ہیں کہ ہم مادہ کا وجود قوت یا حرکت کے ذریعہ سے معلوم کرتے ہیں، حرکت ہی ہمارے دماغ کو متاثر کرتی ہے، اور ہم مادہ کے وجود کا احساس کرتے ہیں، اس لئے مادہ کا کوئی اصلی وجود نہیں ہے، بعض کا خیال ہے کہ مادہ اور قوت ایک ہی چیز ہے، بعض کہتے ہیں کہ مادہ اور قوت دونوں کوئی شئے نہیں ہیں، انکے نزدیک وجود محض وہم ہے، اور خارج میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، بسا اوقات انسان ایسی چیزوں کا احساس کرتا ہے جن کا خارج میں کچھ وجود نہیں (مثلاً خواب کے مشاہدات) ایسا ہی حال مادہ اور قوت کا ہے، ہر ایک فرقہ اپنے مذہب پر دلائل پیش کرتا ہے، جن سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ مادہ اور قوت کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں ہے، عقل روح نفس، یہ سب الفاظ ہیں جن کا کوئی مصداق نہیں ہے، (رہنگار)

ایشیا کے روحانی فاتح۔ یورپ میں سکندر اور نپولین دو فاتح تھے جنہوں نے ایشیا میں اپنی فتوحات کا سکّہ چلایا انگریزوں نے اگر ایشیا پر قبضہ کیا تو فاتحانہ قابلیت کے اس معیار سے نہیں جو سکندر و نپولین میں مانی جاتی ہے۔ نہ اُنکے کسی خاص شخص کے سر پر ان فتوحات کا سہرا باندھا جا سکتا ہے۔

سکندر و نپولین کے مقابلہ میں اہل ایشیا چنگیز و تیمور و نادر و محمّد فاتح کو پیش کر سکتے ہیں جن میں دو نے یورپ کو بھی فتح کیا تھا۔

مگر یورپ میں روحانی فاتح کوئی نہیں ہُوا۔ ایسا فاتح جو ایشیا کے جمہوری دلوں پر قبضہ کر سکتا البتہ ایشیا

میں ایسے فاتح ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں جنکا اقتدار تمام یورپ کے عوام پر ہوتا ہے۔

حضرت عیسیٰ ایشیائی تھے۔ اور یورپ و امریکہ کی تمام اقوام انکی حلقہ بگوش ہیں حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی فتوحات روحانی اگرچہ یورپ کو ہمیشہ ناگوار ہیں تاہم آج اُن مُلکوں میں لاکھوں آدمی اُن کے پیرو ہیں +

ہندوستان کے سری کرشن اور انکی گیتا کا قبضہ امریکہ اور یورپ کے دلوں پر موجود ہے۔ اگرچہ انگریز اپنی روحانی ناقابلیت کے سبب اسکی چنداں قدر نہیں کرتے تاہم جرمنی اور امریکہ میں گیتا کے جھنڈے گڑے ہُوئے ہیں۔ مہاتما گوتم بدھ کا فلسفۂ روحانی تو یورپ میں حضرت عیسیٰ سے بھی بڑھ کر مانا جاتا ہے اور لاکھوں آدمی بدھ کا تابعدار ہونے پر فخر کرتے ہیں:۔

سوامی ووِیکانند۔ سوامی رام تیرتھ۔ عبدالبہا عباس بابی۔ میرزا قادیانی کے خیالات کی مقبولیت یورپ و امریکہ میں ہُوئی۔ بابی فرقہ تو بکثرت امریکہ میں پھیل گیا ہے۔ اول الذکر سوامی صاحبان کے بھی لاکھوں چیلے امریکہ میں موجود ہیں +

(زمانہ)

کیا اسلام کی اشاعت بزورِ شمشیر ہُوئی ہے؟ یورپ کا یہ اعتراض بہت مدت سے مسلمانوں پر چلا آرہا ہے کہ انھوں نے اپنے مذہب کی اشاعت بزورِ شمشیر کی۔ اس کے تحقیقی جوابات بارہا دئے جا چکے ہیں۔ لیکن ایک لطیف الزامی جواب کی جانب سب سے پہلے اکبر کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہماری شمشیر کی تو یہ دھوم دھام ہے، لیکن اپنی توپ پر بھی کبھی نظر کی ہے پھر ہم نے بالفرض شمشیر کے ذریعہ سے اشاعت کی تو مذہب ہی کی تو کی۔ لیکن الحمد للہ کہ مے نوشی و سود خواری خودغرضی و حق تلفی۔ زرپرستی و زن پرستی۔ تفوق و مسابقت حب جاہ و بے حجابی کی تلقین و اشاعت کا فخر جس کا مجموعی نام تہذیب و تمدن رکھا گیا ہے، ہماری تیغ کے حصہ میں نہیں آیا یہ شرف جناب ہی کی توپ کو حاصل ہے۔ اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں۔ ؎

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ کچھ پروا ہے ۔۔۔ غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام ۔۔۔ یہ نہ ارشاد ہُوا توپ سے کیا پھیلا ہے

(اردو)

پروانے سے - اے بے وقوف پروانے! تیری عقل پر کیوں پردہ پڑ گیا۔ جو تو نے جلنے اور جلانے والی شمع سے محبت کی؟

کیا تجھے امید تھی؟ جو تو نے اپنی عقل محبت کے حوالے کر دی۔ اور اتنا نہ سوچا، کہ محبت کا انجام ہمیشہ، ہر حالت میں اور ہر جگہ تباہی اور بربادی ہے۔

تو نے یہ خیال نہ کیا، کہ تیرے محبوب کی شکل وصورت کیسی ہے اور اُس کا اثر کس قسم کا ہے۔ اگر تو یہ سوچتا۔ تو اپنے دل و دماغ کو اس کے جانسوز شعلوں کے سپرد نہ کر دیتا۔ تیرا محبوب فطرتاً محبت کی چھری ہے، کاش تو سوچتا، کہ وہ مجھے محبت کا جواب دینے کے قطعاً ناقابل ہے۔ تو اُس کے حسن پر اپنے پر نثار نہ کرتا۔ اور نور آباد کا باسی ہو کر آج تاریک پڑی میں دم نہ توڑتا نظر آتا۔ مادھری لکھنؤ (ہندی)

رام نام ست ہے - ہم بیٹھے یوگ وسشٹ پڑھ رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے۔ کہ دنیا آخر چھوٹنے والی شئے ہے۔ اتنے میں باہر سے آواز آئی۔ رام نام ست ہے۔ ہم نے کتاب ہاتھ سے رکھدی۔ طبیعت میں دنیا کی بے ثباتی کا اثر سرایت کر گیا۔ پاس سے جنازہ گذر رہا تھا۔

یکایک ایسا معلوم ہوا۔ جیسے گذشتہ ایام کے واقعات تصاویر متحرک کے مانند آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں۔ تمام مرے ہوئے دوست، رشتہ دار، عزیز، واقف یاد آگئے۔ آواز قریب آئی۔ رام نام ست ہے۔ طبیعت میں انتشار واقعہ ہوا۔ کیا دنیا ایسی جگہ ہے۔ جس میں دل لگایا جائے۔ آخر ایک دن ہمارا انجام بھی یہی ہونا ہے۔

خیال آیا، کیا ہم مری ہوئی مٹی کے اوپر کپڑا ڈال کر اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے رہے۔ اور دوسروں کی نگاہوں سے صداقت کو چھپانے کی کوشش نہیں کر رہے؟

تھوڑی دیر کے بعد ہم اُسی رستے پر روانہ ہوئے جس پر ہمارے کئی دوست جا چکے تھے اور جس پر ہمکو بھی کسی نہ کسی دن چلنا ہے۔

قبرستان میں پہنچ گئے۔ یہاں بے ثباتی کی حکومت تھی۔ لوگ جب تک یہاں رہتے ہیں تب تک اُن کا دل موت کو سامنے دیکھتا ہے۔ مگر باہر آکر آنکھیں پھر بند ہو جاتی ہیں۔

خیال آیا۔ یہ جگہ مبارک ہے۔ کیا یہاں رہنے سے انسان پر نت نئے نئے انکشاف نہ ہوتے ہوں گے۔ ارادہ ہُوا یہی ڈیرا لگادوں۔

معاً شمشان کا براہمن سامنے آگیا۔ اُس کے چہرے پر کوئی اداسی، کوئی رنج نہ تھا۔ اُسے وہاں بھی دُنیا نے جکڑ رکھا تھا۔ ہوا کا رخ بدل گیا ہم سوچنے لگے۔ کہاں جائیں کدھر ڈھونڈیں؟ دل پر ہاتھ رکھا، معلوم ہوا۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں، مقصد حل ہو گیا۔

سرسوتی الہ آباد (ہندی)

عہدِ شباب اور عالمِ ضعیفی۔ آہ! زندگی کے ان دو زمانوں میں کتنا فرق، کیسا فاصلہ ہے، شباب آتا ہے، چلا جاتا ہے۔ بڑھاپا آتا ہے، ساتھ لے کر جاتا ہے۔ شباب آندھی ہے ضعیفی پچھتاوا ہے شباب میں انسان ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں سنجیدگی کی تصویر بنتا ہے۔ شباب میں غلط کاریاں کرتا ہے۔ بڑھاپا اُنکے لئے آنسو بہاتا ہے۔ شباب اکڑ کر چلتا ہے۔ بڑھاپا عاجزی سکھاتا ہے۔ شباب اس دنیا سے بھی آنکھیں بند رکھتا ہے۔ بڑھاپا آئندہ زمانے سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ شباب بڑھاپے کو دیکھ کر کانپتا ہے۔ اور پھر اپنے رنگ میں بیخود ہو جاتا ہے۔ شباب دیکھ کر ٹھنڈے سانس بھرتا ہے اور اُسے کبھی نہیں بھولتا۔

بڑھاپا ایک سمندر ہے۔ جس میں شباب کی ناؤ تیر رہی ہے۔ اور پتہ نہیں۔ کب اُس میں غرق ہو جائے۔ مگر شباب ناتجربہ کار لڑکے کے مانند اس حقیقت سے ناواقف فانی خوشیوں میں مست رہتا ہے۔ حتی کہ بڑھاپے کی لہریں اُسے چکنا چور کر دیتی ہیں۔ اور اُس کا نام و نشان تک غائب ہو جاتا ہے۔

وارتا بمبئی (گجراتی)

مرقس کا سترھواں باب۔ پادری صاحب نے اپنے حاضرین سے کہا۔ لوگ جھوٹ بولنے کو اب گناہ نہیں سمجھتے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آئندہ ہفتے جھوٹ کی برائیوں پر تقریر کردں۔ مگر ضروری ہے کہ آئندہ اتوار آپ اصحاب مرقس کا سترھواں باب پڑھ کر گرجے آئیں۔

دوسرے اتوار کو پادری صاحب نے پوچھا کیا آپ میں سے جو اصحاب مرقس کا سترھواں

باب گھر سے پڑھ کر آئے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ بلند کرینگے؟"
نصف اصحاب نے ہاتھ کھڑے کر دئے۔
"بہت اچھا۔ جن اصحاب نے ہاتھ کھڑے نہیں کئے۔ وہ گرجے سے باہر چلے جائیں۔ میں صرف ان حضرات کے سامنے تقریر کروں گا۔ جنہوں نے ہاتھ کھڑے کئے ہیں۔ کیونکہ مرقس کا سترھواں باب ہے ہی نہیں"
قہقہہ۔

(پیرسن لنڈن)

آرزوئے محض

نری خواہش اور آرزو جوانوں کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری پیدا کرتی ہے۔ جس سے وہ اپنے اوقاتِ عزیز کو صرف خیالی پلاؤ پکانے اور لایعنی منصوبے باندھنے میں ضائع کرتے ہیں جس وقت کسی مقصد کے حصول کا ارادہ کرو۔ فوراً کھڑے ہو جاؤ اور اُسی وقت اس میں ہاتھ لگا دو۔ پھر کبھی اُس میں سستی نہ کرو۔

(سیموئل سمائلز)

بڑے بننے کا راز

اگر بڑا بننا چاہتے ہو تو پہلے چھوٹے بنو۔ کوئی وسیع اور بلند عمارت بنانا چاہتے ہو تو پہلے اُسکی چھوٹی چھوٹی بنیادوں کا خیال کرو جسقدر بنیاد گہری ہوگی اُسی قدر عمارت اونچی ہوگی۔

(سینٹ آگسٹائن)

کامیاب کون ہوتا ہے؟

جس وقت کوئی شخص راہِ نیک اختیار کرے اور اُسکے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ "زمانہ کیا کہیگا" تو سمجھ لو کہ وہ شخص کچھ نہ کریگا۔ لیکن اگر اُس کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ "کیا یہ میرا فرض ہے؟" تو سمجھ لو کہ وہ شخص کامیاب ہوگا۔ کیونکہ وہ لوگوں کے اعتراضات و الزامات اور تمسخر و استہزا کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ (سیموئل سمائلز)

اولوالعزمی

وہ شخص جو اوپر نہیں دیکھتا اُسکو پستی کے سوا کچھ دکھائی دے ہی نہیں سکتا۔ وہ جانور جو اوپر اُڑنا نہیں چاہتا۔ وہ زمین پر رینگنے کے سوا اُڑنا سمجھ بھی نہیں سکتا اور وہ جوان مرد جو آسمان پر تیر چلانا چاہتا ہے اگر آسمان تک نہیں پہنچا سکا۔ تو زمین پر کسی اونچے درخت کی پھُننگی تک تو ضرور پہنچیگا۔ اسی طرح وہ اشخاص جنکے ارادے بلند ہوتے ہیں اگر وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوتے تب بھی اپنی حالت سے بلا شبہ کچھ ترقی کر سکتے ہیں

(ڈزرئیلی) (ماخوذ)

حصّۂ نظم

مثنوی

اللہ اللہ چہ بیدار بختم کہ حضرت مولانا روم قدس سرہ شبے بخوابم جلوہ فرمودہ فرمودند کہ گرامی چند می نشینی؟ ہلہ برخیز کارے بکن پیش از آنکہ کار از دست رود و دست از کار۔ در حال مژہ وا کردم لختے چشم بمالیدم ایں بیت بگوشم برخورد

بالب دمساز خود گر جفتمے　　ہمچو نے من گفتنی ہا گفتمے

گرامی

گرامی

نے کہ نالانست بیش از چوب نیست　　چوب نالد دل بنالد خوب نیست

بوالعجب چوبے کہ شورش در سرست　　سوختن در پردہ ہایش مضمرست

پردہ ہایش پردہ ہائے خیر و شر　　ویں عجب خود پردہ دارش پردہ در

سینہ اش با چاکہا پیوندگیر　　در کمند نالہ ہاے خود اسیر

سینہ چاکاں را بپرس اسرارِ نے　　کیست غیر از سینہ چاکاں یارِ نے

خندہ را در گریہ آرد نالہ اش　　نالہ اش زنجیری بتخالہ اش

سخت نالانست نے بر حالِ ما　　حالِ ما دیباچۂ اعمالِ ما

یار در آغوشِ ما۔ ما بے خبر　　یار در چشم ست و ما داغِ نظر

جہلِ ما کردست ما را بوالفضول　　بوالفضولیہاے ما ردِّ قبول

خیمہ بر اختر زدن سہل ست سہل　　خویش را نشناختن اینست جہل

جہلِ ما از لوحِ ما آوخ زدود　　نکتۂ تفسیرِ اوفوا بالعہود

ورنہ ما بودیم پیدا و نہاں　　معنی ترکیب وصلِ جسم و جاں

خندۂ صبحِ ازل انفاسِ ما　　کعبہ امید دلہا یاسِ ما

مانگہدارِ رموزِ جزو و کُل　　عکسِ نورِ اولِ ختمِ رسل

حیف بشکستیم آں عہد الست ... زآں شکست آمد بکار ما شکست
عہد ہا بر بستہ بشکستیم ما ... با شکستن عہد بر بستیم ما
بے خبر ماندیم از بود و نبود ... خود وجود از ما و ما ننگ وجود
وہ چہ خوش فرمود مولانائے ردم ... آں محیط حکمت و بحر علوم
"با لب دمساز خود گر بجفتمے ... ہمچو نے من گفتنی ہا گفتمے"

عزیز و اعجاز

ناظرین ہمایوں، مرزا اعجاز حسین اور میاں عبدالعزیز کے خیالاتِ عالیہ سے متعدد بار روشناس ہو چکے ہیں۔ "میاں صاحب نے اپنے کسی خط میں مرزا صاحب کو اُردو شاعری کی موجودہ حالت پر توجہ دلاتے ہوئے اُسے غیر تسلی بخش قرار دیا تھا۔ اسکے جواب میں مرزا صاحب ان اعتراضات سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے اپنے خیالات کو نظم کرتے ہیں، مرزا صاحب نے یہ نظم اشاعت کی غرض سے نہ لکھی تھی لیکن اب ہمارے اصرار کرنے پر ہمایوں کے لئے مرحمت فرماتے ہیں،" خلوت کی بعض سرگوشیاں آراستہ خیالات سے کہیں زیادہ پُر لطف ہوتی ہیں!

ہمدمِ نکتہ سنج و شعر نواز ... اب کہاں شعر ہائے رُوح گداز
شعر میں اب کہاں دُرِ معنے ... دلِ شاعر نہیں خزینۂ راز
دل میں حس ہو تو ہو زباں پہ اثر ... دل میں خوں ہو تو ہو مژہ گلباز
جان رہینِ امید و بیم نہیں ... شکل ساعت ہے زیست کا انداز
رُوح و مذہب کے راز ہائے نہاں ... تھے کبھی عقل سوز و سینہ گداز
آج فرصت بھلا کسے کہ کرے ... فکرِ اندیشہ ہائے دور و دراز
مایۂ شعر انبساط نہ درد ... حاصلِ شعر اب نہ سوز نہ ساز
مراۃِ شعر تشنۂ صیقل ... کہ نہیں عکس ریز جلوۂ ناز
کھو دیا رُوپ سب تصنّع نے ... شعر ہے شکوہ سنجِ روغنِ قاز
شوقِ عُمریانیِ بیان! اللہ ... مرت لُٹا شعر کا خزینۂ راز
ہو بُرا ندرتِ ادا تیرا ... کھو نہ تاثیرِ معنیِ الفاظ
لا سکی جب نہ تابِ بندشِ چُست ... رُوحِ اشعار کر گئی پرواز

۲

ہاں ترقی پہ اب تمدن ہے ... ہوگیا شعر کا زوال آغاز

شعر کی بھیرویں ہوئی بے وقت — اب زمانے کا ہے نیا انداز
ہاتھ میں مطربِ تمدن نے — اب سنبھالا ہے اک نرالا ساز
جنتِ گوش ہے ترانۂ فون — کون سنتا ہے روح کی آواز
خوب توڑا غرورِ مایۂ حسن — حسنِ سرمایہ تیری عمر دراز
اب درِ ناز پر نہیں گھستا — عاشقِ مضطرب جبینِ نیاز
ولولے سب نثارِ ضبط ہوئے — بند رہتی ہے چشمِ شاہد باز
دلِ جانباز سر بسر پتھر — حسن کے تیر سب غلط انداز
عشقِ محتاط کھائے کیوں ٹھوکر — دیکھ لیتا ہے سب نشیب و فراز
کششِ حسن و عشق صرفِ سکوت — زور و زر محوِ شغلِ ناز و نیاز
ہو گئی ختم داستانِ کہن — قصۂ نو ہے بزم میں آغاز
نغمۂ شاہدِ دخانی نے — بربطِ دل کی چھین لی آواز

خشک ہیں چشمہ ہائے شعر و سخن
تشنہ جاں ہیں عزیز اور اعجاز

نغمۂ قدس

از سردار اودے سنگھ صاحب شایق بی۔ اے

کل قریبِ شام میں گم گشتۂ دشتِ خیال — سن رہا تھا گوشِ دل سے نغمۂ سازِ حیات
آسماں والوں کی تھی اک انجمن آراستہ — ہو رہا تھا اُس میں ذکرِ نظم و نسقِ کائنات
کرتے جاتے تھے فرشتے رازِ سربستہ عیاں — کاشفِ اسرارِ پنہانی تھی اُن کی بات بات
کہہ رہے تھے وہ کہ دنیا ہے طلسمِ رنگ و بُو — زندگی دھوکا ہے گر دیکھیں حقیقت کی لغات
اہلِ دُنیا کو عبث دُنیا میں ہے شوقِ نمود — یہ جسے سمجھے ہوئے ہیں دن حقیقت میں ہے رات

اپنی ہستی کے لئے سب جد و جہد انسان کی
سعی لاحاصل ہے گر پوچھے کوئی ایمان کی

میں سراسر وقفِ حیرت صورتِ تصویر تھا　　سُن کے اُن سے داستانِ زندگئے مستعار
ہو رہی تھی محفلِ دل خوف سے زیر و زبر　　رو رہی تھی چشمِ خوننا بہ فشاں بے اختیار
اپنے مستقبل کا اندیشہ ڈراتا تھا مجھے　　اژدہا کی شکل کر رکھی تھی اس نے اختیار
ہو کے بیتاب الم آخر کیا میں نے سوال　　گلشنِ ہستی کی ہے کیا واقعی دو دن بہار؟
ہے فریبِ ہوش۔ کیا۔ یہ آمد و رفتِ نفس　　وہم ہے دھوکا ہے سچ مچ گردشِ لیل و نہار

ہیچ شوقِ خود فروشی۔ ہیچ سودائے نمود
لُوٹ جائے گا طلسمِ گلستانِ ہست و بُود؟

دیکھ کر مجھ کو پریشاں حال وہ کہنے لگے　　آ بتائیں تجھ کو رمز قصہ رازِ دُرُون
ساکنانِ خاک کو اِس راز سے آگاہ کر　　ختم ہو جانے کو ہے ہنگامۂ دنیائے دُوں
ہاں مگر تو اس قدر حیران اور مضطر نہ ہو　　اے سراپا جستجو۔ لے سُن لے پیغام سکوں
مٹ کے یہ دنیا بنیگی پھر سے اک دُنیا نئی　　رنگ لانے کو ہے دورِ آسمانِ نیلگوں

دستِ قدرت چھیڑ دیگا اس جہاں کے ساز کو
پھر سے بے پردہ کریگا حُرّیت کے راز کو

ہوگی بے پروا خزاں کے جور سے اُسکی بہار　　غیرتِ باغِ جناں ہوگا وہ گلزارِ جہاں
خوف کچھ قیدِ قفس کا اور نہ ڈر صیاد کا　　بے خطر گایا کریگی بلبلِ شیریں زباں
آسماں سے آئینگے قدسی زیارت کے لئے　　نورِ ایمں سے منوّر ہوگی بزمِ خاکیاں
حاکم و محکوم میں ہوگا نہ کوئی امتیاز　　حکمراں ہوگا تو بس اک وہ شہنشاہ شہنشہاں

آنے والا ہے محبت اور وفاداری کا دور
ختم ہونے کو ہے غداری و عیاری کا دور

مشرق کا پیامِ اخوّت مغرب کے نام

(بے قافیہ نظم)

تو ہے مغرب! کشور آرائے جہانِ ارتقا　　اور میں اس گلستان میں سبزۂ بیگانہ ہوں

میرے باشندے ہیں۔ لطفِ زندگی سے بے خبر
اہلِ مشرق۔ پائمالِ گردشِ لیل و نہار
مغربی۔ گہوارۂ راحت میں پلتے ہیں مدام
میری قسمت۔ کم نہ تھی مجھ کو مٹانیکے لئے
میرے احسانات۔ زیبِ طاقِ نسیاں کردئے
چشم پوشی کو مری۔ اپنی جفاکوشی کو دیکھ !
تجھ کو مشرق نے کیا آزاد۔ بندِ جہل
تجھ کو مشرق نے کیا روحانیت سے۔ شادکام
تیرے نبیوں کے لئے گہوارۂ الہام ہیں !
مغربی۔ مشرق میں آنکلے تو مہمانِ عزیز
آہ وہ معمورۂ ہندوستاں جنت نشاں
شام۔ وہ شاداب خطّہ۔ آہ وہ سرسبز ملک
بصرہ و بغداد۔ وہ عباسیوں کی یادگار
الغرض ہے جسمِ مشرق۔ زخمہائے غم سے چور
تابکجا اے سنگدل! یہ امن سوزی تابکجا ؟
ہوش میں آ بیخبر! آئینِ فطرت کو نہ توڑ !
ختم ہونے کو ہے اب دورِ "تنازُع للبقا"[1]

تجھ میں رہنے والی قومیں زندۂ اقوام ہیں
اہلِ مغرب کامرانِ مدعائے زندگی
مشرقی اور بدنصیب۔ اک شخص کے دو نام ہیں
اُس پہ طرّہ بنگئی۔ تیری جفائے جاں خراش
بڑھ گئی ہے حد سے کچھ۔ محسن فراموشی تری
اپنے اور میرے ذرا۔ طرزِ عمل پر غور کر !
تو نے مشرق کو کیا جور و ستم سے۔ پائمال
تو نے مشرق پر لگائے "حکمبرداری" کے ٹیکس
میرے شاہوں کے لئے زندانِ آفتناک تو!
مشرقی مغرب میں جا پہنچے تو "نیٹو اور غلام"
تیرے ہاتوں لٹ گئی جس کی بہارِ جانفروز
مصر۔ وہ صبحِ تمدن۔ منبعِ تہذیب و علم
اُف مراکش۔ آہ وہ ویرانۂ لبریزِ درد
تختۂ مشقِ جفا ہے ایشیا تیرے لئے
کب تک اے ناعاقبت اندیش! ظلم آرائیاں؟
مشرقِ پروردۂ الہام کا پیغام سن !
آرہا ہے دہر میں عہدِ "تصالُحِ للحیات"

[1] میرا خیال ہے کہ "تنازع للبقا و بقائے اصلح" کا فلسفہ بہت حد تک قوموں کی انسانیت سوز جنگوں کا باعث ہوا ہے۔ واقعات کی تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ ہر عہد کے بڑے بڑے لوگوں کے اقوال انکی قوم کی معاشرت پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ "تنازع للبقا" کا مدعی کاش انجام اندیشی سے کام لیکر۔ اس امن سوز فلسفہ کے اظہار سے باز رہتا۔ یہ مسئلہ غلط ہو یا صحیح۔ لیکن یہ امر ناقابلِ انکار ہے۔ کہ بہت سی قوموں نے اسکو دستور العمل بنا کر اپنی باہمی جنگہائے بربریت سے بزمِ ہستی کو زیر و بالا کردیا ہے۔ بہت سی کمزور قومیں اس خونخواری آموز فلسفہ پر قربان ہوچکی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ تنازع للبقا (زندگی کے لئے جنگ) کے فلسفہ کو صدقۂ نسیان بنا کر تصالُحِ للحیات (زندگی کے لئے صلح) کے اصول کو دنیا کے مستقبل کا پروگرام بنایا جائے۔

تاجور

اب محیطِ عالمِ انسانیت کے کُل خطوط
کھینچ لیگی اپنی جانب سب کو فطرت عنقریب
فلسفہ کپلنگ[1] کا فطرت سے ہوگا سرنگوں
آ۔ کہ اس عہدِ مبارک کو کہیں خوش آمدید!
ارتقا انسانیت کا اپنا نصب العین ہو
مشرقی و مغربی کا جوہر فطرت سے ایک
دل سے مشرق کا یہ پیغامِ اُخوت کر قبول!

مرکزِ فطرت پہ آ کر سب کے سب مِلجائینگے
اختلافِ رنگ و مذہب بے اثر ہو جائیگا
مشرق و مغرب کے سارے تفرقے مٹ جائینگے
اُٹھ! کہ استقبال دورِ امن کا۔ مل کر کریں
مشرقی ہو خواہ وہ انسانیت یا مغربی
رنگ و مذہب کے عوارض سے بدل سکتا نہیں
سُن کہ! فطرت کا تقاضا ہے کہ ہم ہو جائیں ایک

عیش و راحت سے رہینگے امن کے گُن گائینگے
آ گلے مل ملیں! گلے ملنے سے دل مل جائینگے

تاجور نجیب آبادی

جذباتِ عالیہ

جلیل

دستِ قاتل سے جو کچھ گزری دلِ نخچیر پر
آج تک اُس کا فسانہ ہے زبانِ تیر پر
خوب قاتل نے سرِ راہِ عدم رکھی سبیل
لُوٹ کر پیاسے گرے آبِ دمِ شمشیر پر
صید گاہِ عشق میں مجھ سا کہاں کوئی شکار
آشیاں باندھا ہے مرغِ جاں نے شاخِ تیر پر
حُسنِ جاناں کو کوئی پردہ چھپا سکتا نہیں
روئے روشن پر نقاب آئینہ ہے تصویر پر

---

[1] "کپلنگ" انگلستان کا مشہور شاعر اپنی کسی نظم میں کہتا ہے
"مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے"

پاس قاتل کے یہ بسمل کی نشانی رہ گئی
خون کی گلکاریاں ہیں دامنِ شمشیر پر

رفتہ رفتہ اُٹھتی جاتی ہے نقابِ روئے یار
آفریں اے شوقِ نظارہ تری تاثیر پر

راز تھا سوزِ نہانی اُس کو افشا کر دیا
شمع کا سر کاٹنا واجب ہوا گلگیر پر

ہے یہی باعث خمیدہ ہے جو مثلِ شاخِ گل
خون ہے لاکھوں کا قاتل گردنِ شمشیر پر

ٹکڑے اُڑ جائینگے اسکے بھی گریباں کی طرح
دستِ وحشت پڑ گیا جس دن مرا زنجیر پر

محو ہے دل کھینچ کر نقشہ تصور میں ترا
جان دیتا ہے مُصوّر بھی تری تصویر پر

دل جگر باہم جھگڑتے ہیں نشانے کے لئے
فیصلہ ٹھیرا ہے دونوں کا زبانِ تیر پر

فکرِ عقبےٰ ہے مُقدّم فکرِ دُنیا پر جلیل
دو نہ اس کو ہاتھ سے چھوڑو اسے تقدیر پر

یاس

تارِ نظر نے باندھ لیا ہے بہار کو
نیرنگیٔ تصوّر بے اعتبار کو

نامِ خزاں پہ یاس لٹا دو بہار کو
بازیچۂ دو رنگیٔ لیل و نہار کو

دے کچھ تو داد طبعِ ندامت شعار کو
کیا دیکھتا ہے لغزشِ بے اختیار کو

بادِ سحر کجا۔ پرِ پروانہ شام سے
بھڑکا رہے تھے شعلۂ بے اختیار کو

دیدار تو دکھائے کہیں صبحِ منتظر
حاضر ہے سر بھی سجدۂ بے اختیار کو

خانہ خرابِ عشق نے دل میں پناہ لی
دار الامان سمجھ کے اس اُجڑے دیار کو

تڑپا رہی ہے مقصدِ موہوم کی خلش
کیا روگ لگ گیا دلِ اُمیدوار کو

دل نے بزورِ عشق لگایا ہے راہ پر
گم گشتگانِ غمکدۂ روزگار کو

حیرت نے شش جہت میں نظر بند کر دیا
نامحرمِ طلسمِ خزان و بہار کو

ہم ایسے بدنصیب گرفتارِ آشیاں
کیا جانیں گرم و سردِ خزان و بہار کو

آج آشیاں بھی اپنا ہے مارے خوشی کے تنگ
روتے تھے کل جو کشمکشِ ناگوار کو

یاد آئی آشیانۂ پرخار کی خلش
دل ڈھونڈھتا ہے پھر اُسی اُجڑے دیار کو

مہندی بندھی نہیں مرے پائے خیال میں / چاہوں تو کھینچ لاؤں گزشتہ بہار کو

اللہ رے اختیار کہ آمادہ کر دیا / فکرِ محال پر دلِ بے اختیار کو

کچھ ہوش ہو تو آنکھوں ہی آنکھوں میں تولیئے / آغاز پُر فریب سے انجام کار کو

بیگانہ وار ایک ہی رُخ سے نہ دیکھئے / دُنیا کے ہر مشاہدۂ ناگوار کو

میزان عدل آئی اب ایسوں کے ہاتھ میں / کانٹوں سے تولتے ہیں جو پھولونکے ہار کو

سہو و خطا ودیعتِ فطرت سہی مگر / سمجھاؤں کیا ضمیر ملامت شعار کو

ساحل کہاں دو آبۂ اُمید و بیم کا / تہ پر بٹھا دو یاس دلِ بیقرار کو

وقار الاعظم شرف

اس عشق میں بتوں کے کچھ بھولے یا نہ بھولے / بھولے ہیں ہم خدا کو ہمکو خدا نہ بھولے

مجھ کو زمانہ بھولا مجھ کو زمانہ بھولے / بھولا ہوں جس پہ یارب وہ بیوفا نہ بھولے

ہم نے وفا نہ چھوڑی دلبر جفا نہ بھولے / اپنی ادا کے بندے اپنی ادا نہ بھولے

یادش بخیر قاصد کہنا یہ اُن سے جاکر / ہم بھولنا نہ سیکھے تم بھولنا نہ بھولے

ظالم بُری گھڑی تھی صبح مفارقت کی / بھولے ہیں تیرا آنا جانا ترا نہ بھولے

او یاد آنے والے تو مجھ کو بھول بیٹھا / تو مجھکو بھول بیٹھا میرا خدا نہ بھولے

ہم نے خودی کو کھویا تو بے خودی کو پایا / کھویا ہوا نہ پایا پایا ہوا نہ بھولے

ہستی کا بھول جانا مقصودِ عاشقی تھا / ہم مدعا جو بھولے تو مدعا نہ بھولے

ہر حال میں شرف نے اللہ کو پکارا / دُنیا کے میکدہ میں اپنی صدا نہ بھولے

فہرستِ مضامین بابت ماہ اپریل ۱۹۲۳ء

جلد ۳ | حصۂ نثر | حصۂ نظم | نمبر ۴

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذباتِ عالیہ

جہاںؔ نُما

ایشیا یورپ میں - آنے والی نسلیں جب زمانۂ حال کی تاریخ سیاست پر نظر دوڑائینگی تو غالباً سنہ ۱۹۱۸ء وہ سال قرار دیا جائیگا جب یورپ کی مُسخرانہ دیوانگی اپنے معراجِ کمال پر تھی، جنگِ فرنگ کے بند ہونے کے ساتھ ہی رہے سہے مشرقی مُلکوں میں سے اکثر کو مغربیوں نے اپنے قابو میں کر لیا یعنی یورپ پہلے سے بھی زیادہ ایشیا میں گھُس آیا۔ لیکن اس سال کے خاتمے پر اس طوفان بے تمیزی کی قوت میں کمی واقع ہونی شروع ہُوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب ایشیا یورپ میں دخل پانے لگا۔ رُوس کو مغربی تہذیب یافتہ ایشیائی مُلک کہہ کر پکارنے لگے کیونکہ اُس نے مغربی کوٹ اُتار کر مشرقی قبا زیب تن کر لی۔ اُدھر افغانستان نے اپنی آزادی کا نعرہ بلند کیا اور مغربی ممالک میں اپنے سفیر بھیجے۔ ایران نے رُوس و انگلستان کی گرفت سے رہائی حاصل کر لی اور ترکوں نے اپنی تلوار سے یونانی اور اتحادی زنجیروں کو یکسر کاٹ دیا۔ لیکن ایک مغربی نامہ نگار ہمیں بتاتا ہے کہ ان سب سے زیادہ تعجب انگیز جزیرہ نمائے بلقان میں البانیا کی جدوجہد تھی۔ "دلدادگانِ حریت" کی فتح کے ساتھ اس چھوٹے سے ملک پر زبردست قومیں ہر طرف سے ٹوٹ پڑیں۔ شمالی علاقہ سردیا کے حصے میں آیا جنوبی یونان کو ملا اور وسطی حصے پر اطالیہ نے اپنے قدم جمائے ان دشمنانِ انسانیت کو یہ خبر نہ تھی اور اگر خبر تھی تو پروا نہ تھی۔ کہ قومیت کی رُوح یہاں کے لوگوں میں سرایت کر چکی ہے۔ مُسلمان اور عیسائی البانیا میں زیادہ تعداد مُسلمانوں ہی کی ہے) یک دل و جان ہو کر اپنے وطن کی حمایت کے لئے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ متواتر دو برس تک یہ لڑائی ٹھنی رہی اور اطالیہ کی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں۔ والٹر ایلیٹ کہتا ہے کہ والونا کی تسخیر ترکی فتح سمرنا سے بھی زیادہ حیرت خیز کامیابی ہے۔ ترکوں کی قوم میں ایک کروڑ نفوس ہیں البانیا والے صرف آٹھ لاکھ ہیں۔ اُن کا مقابلہ ایک ایسی قوم سے آ کر پڑا جو تعداد میں ساڑھے تین کروڑ لوگوں پر مشتمل ہے اور جس کے پاس کم و بیش بیس تیس لاکھ تو اعد دان فوج اور سینکڑوں جنگی جہاز ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شمالی اور جنوبی دشمنوں کو بھی البانیوں نے روکے رکھا اور آخر کار اپنے ملک کو "مہذب" غاصبوں کی گرفت سے بچا لیا۔

اس طاقت کے اندر کونسی قوت پنہاں تھی؟ مذہب کی؟ نہیں! اس میں وہ زور قومیت پوشیدہ تھا جو آج دُنیا کے مُلک مُلک میں عظیم الشان کارناموں میں ہویدا ہو رہا ہے اور جس کا اظہار کمزور ہند بھی اپنی جدوجہد کے ساتھ گاہے گاہے کرتا ہے +

رُوس کے انقلابات۔ اِس انقلاب پسند زمانے میں رُوس سب سے بڑا انقلابی مُلک ہے جہاں ایک ہیبتناک سیاسی انقلاب نے ہزاروں انقلابوں کو اس طرح پیدا کر دیا ہے جیسا کہ کسی آتش فشاں پہاڑ کے مُنہ سے آگ کے انگاروں کے ساتھ لاکھوں اژدہا اُچھل اُچھل کر آبادیوں میں جا پڑیں اور لوگوں میں ہر سو تباہی و بربادی پھیلا دیں۔ معاشرتی انقلاب، مذہبی انقلاب، مادی انقلاب، تعلیمی انقلاب، ان سب کے بل پر وہاں دُنیا کی کایا پلٹ رہی ہے اور خواہ طبقۂ اشراف اسے پسند کرے یا نہ کرے ان تبدیلیوں کی اصلی غایت بڑے چھوٹے اور امیر غریب کے باہمی تعلقات کو از سرِ نو اک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے۔

ماسکو۔ میں مزدوروں کے دیوان میں جا نکلئے تو اک عجیب تماشا پیش نظر ہوتا ہے۔ یہاں دُنیا بھر کے انقلاب پسند مزدوروں کے نمائندے آ کر جمع ہوتے ہیں۔ بیالیس ۴۲ قومیں پہلو بہ پہلو بیٹھتی ہیں اور نوعِ انسان کی پسینہ بہانے والی جماعت کا دُکھڑا سُنتی ہیں۔ تقریریں چار زبانوں میں ترجمہ کی جاتی ہیں رُوسی جرمن فرانسیسی اور انگریزی۔ ہر تقریر کے بعد گھنٹی بجتی ہے اور کوئی پکارتا ہے "ترجمے"۔ لوگ ہر مترجم کو احاطہ کر لیتے ہیں اور کہی ہوئی بات کو اپنی زبان میں سُنتے ہیں۔ کہیں کوئی چینی کہیں عرب کہیں انتہا پسند ترک کہیں کوئی انگریز اپنے اپنے وطن کی مُشکلات بیان کرتا ہے۔ غرض اس طرح یہ مزدوروں کی کانگرس اپنا اجلاس قائم کر کے طبقۂ اسفل کے مطالبات دُنیا کے سامنے پیش کرتی ہے۔

علاوہ اس معاشرتی انقلاب کے رُوس میں تعلیمات میں اک عظیم تبدیلی واقع ہو رہی ہے جیسا کہ مفصلہ ذیل اعداد سے ظاہر ہو گا:۔

سن	ابتدائی اور ثانوی مدارس	تعداد طلباء
سنہ ۱۹۱۱ء	۴۷,۸۵۵	۳,۰۶۰,۴۰۰
سنہ ۱۹۱۹ء	۶۳,۳۱۷	۴,۷۹۶,۲۸۴
سنہ ۱۹۲۱ء	۹۱,۵۰۰	۷,۲۰۰,۰۰۰

رُوسی محکمۂ تعلیم کا سب سے بڑا کام "عوام کا مدرسۂ متحدہ" قائم کرنا ہے جس میں تمام جماعتوں کے بچّوں کو یکساں تعلیم دی جاتی ہے۔ مدرسے کے دو درجے ہیں پہلے درجے میں ۸ سے ۱۲ برس کی عمر تک کے بچے پڑھتے ہیں دوسرے میں ۱۲ سے ۱۷ برس تک کے لڑکے۔ ان مدرسوں میں لڑکوں کو کار آمد چیزوں کی صنعت سکھائی جاتی ہے۔ مثلاً چوب کاری آرہ کشی باغبانی وغیرہ۔ اور کھانا

اور کپڑے انکو مہیا کیئے جاتے ہیں۔ دوسرے درجے میں انکو اپنے منتخب شدہ پیشے کا کام سکھایا جاتا ہے،
اسکے علاوہ رُوس کے مختلف حصوں میں لڑکوں کی نو آبادیات ہیں جہاں وہ تعطیلات کا زمانہ
بسر کرتے ہیں اور دیہات کی تازہ آب وہوا سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

انقلاب رُوس کے بعد ایک سال میں اڑتالیس لاکھ ان پڑھ مردوں عورتوں کو پڑھنا لکھنا
سکھایا گیا اور "سُرخ فوج" میں اب جماعتِ کثیر خواندہ سپاہیوں ہی کی ہے۔ رُوس میں نسل و مذہب کے
فرق کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور سب کے ساتھ یکساں سلوک برتا جاتا ہے۔

جرمنی کی حالتِ زار ۔ سنتے ہیں کہ آجکل برلن میں چار ہزار چھوٹی چھوٹی دوکانیں اس غرض سے کُھل گئی
ہیں کہ متوسط الحال یا فلاکت زدہ لوگوں سے قیمتی جواہرات یا دیگر عجائبات معاشرت خرید کر انہیں
بیرونی ممالک میں نفع پر فروخت کریں۔ کوئی خاتون اپنا گلوبند یا کرن پھول بیچنے آتی ہے دوکاندار
اُسے چند ہزار مارک پیش کرتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اسے چند سو مارک میں قبل جنگ کے زمانے میں خریدا
تھا بُرا سودا نہیں۔ پھر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ مارک کا نوٹ تو ردی کے کاغذ کے برابر بکتا ہے لیکن ساتھ
ہی یہ خیال آتا ہے کہ بچے گھر میں بھوکے ہیں اُن کے لئے بُری بھلی مٹھائی یا ڈبل روٹی تک بھی موجود
نہیں مجبوراً اپنی آرائش اُتار کر سٹے باز کے حوالے کر دیتی ہے۔

یہ ہے جرمنی کی حالت۔ مغرور عظمت کبھی دیر تک اپنی رفعت پر قائم نہیں رہتی۔ ایک دن آتا ہے کہ مظلوم
کی فریاد آسمان تک پہنچتی ہے اور نخوت پسند اپنے کیئے کی سزا پالیتا ہے۔ اس سے اُن قوموں کو سبق سیکھنا
چاہیئے جن کا تکبر ابھی انہیں دنیا کے مُلک مُلک میں فتح و تسخیر کے نشے میں چور لئے پھرتا ہے!

فرعون بے سامان ۔ ہم لوگ ماہر اثریات نہ تھے اس لئے ہم نے فرعون کو "بے سامان کہا"۔ موجودہ اثری
انکشاف نے اس فقرے کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ "سامان" کے لئے فراعنہ کی خواہش (جو مذہبی اعتقاد کا
نتیجہ تھی) اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ انکے مقبروں میں بھی اُنکے لئے گویا ایک آراستہ و پیراستہ محل تیار کیا جاتا تھا
صوفے، کرسیاں، زریں و سیمیں برتن۔ مرمریں بُت یہ صرف زندگی تک کی چیزیں نہ تھیں بلکہ موت کے
بعد بھی ان عشرت پسندوں نے اپنی قبروں کو مزین کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ لیکن اُن کی بے سامانی
پر رحم آتا ہے کہ جو کچھ چوروں کی دست بُرد سے بچا وہ اب مہذب لُٹیروں کے ہاتھ آیا اور آخر اُنکی لاشوں
کو گھسیٹ کر چیر پھاڑ کے لئے پھر اُسی بھری دُنیا کے بازاروں میں لایا گیا۔ طوطی خانم (طوطن خامن

اصلی نام ہے جس کا طوطی کبھی دُنیا بھر میں بول رہا تھا چند ماہ میں اُسکی لاش منظرِ عام پر لائی جائیگی اور صدیوں کی بھولی ہوئی باتیں انسانیت کو پھر یاد آ جائیں گی!

پنجاب میں تعلیم - پنجاب کی پنجسالہ تعلیمی رپورٹ (۲۲-۱۹۲۱ء) سے ظاہر ہے کہ تمام قسم کے مدارس و مکاتب کی تعداد اس عرصے میں بقدر ۲۰۴۶ کے بڑھ کر ۱۱۴۰۴ ہوگئی اور طلباء ۴۹،۹۵۲ زائد ہو کر ۶۲۶،۶۹۰ ہو گئے۔ اخراجات میں تقریباً اکیاسی لاکھ کا اضافہ ہوا اور میزانِ کل ۱،۸۹،۶۲،۲۸۷ ہو گیا۔ میونسپلٹیوں کو تعلیم کے جبری کر دینے کا اختیار دیا گیا جس سے ابتدائی تعلیم میں ترقی ہوئی چنانچہ ملتان اور لاہور میں اس پر عمل درآمد ہونا شروع ہو گیا۔ ملتان اور لدھیانہ میں دو درمیانہ درجے کے کالج قائم کئے گئے اور مغل پورہ میں میکینکل انجینیرنگ کالج کھولا گیا۔ علاوہ بریں ملکی زبانوں میں تعلیم دینے اور پھیلانے کے لئے ایک نظامِ عمل تیار کیا گیا ہے۔ دیکھئے کب انگریزی صرف و نحو سے ہمارے بچّوں کو رہائی ہوتی ہے؟

حال میں بنارس میں ایک نیشنل ایجوکیشن کانفرنس منعقد ہوئی جہاں یہ تجویز منظور کی گئی کہ ہندی کو ہندوستان کی عام زبان بنایا جائے۔ اس کانفرنس کا نام اگر ہندی ایجوکیشن کانفرنس رکھا جاتا تو بہتر تھا۔ آج کل ہندو مسلم اتحاد کے بہت سے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں شاید ایک اُن میں یہ بھی ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اُسے چھوڑ کر ہندی کو قومی زبان بنایا جائے مولانا اکبر مرحوم نے خوب لکھا ہے کہ

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں ۔ اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں کہ شیخ امراء القیس بنیں ۔ پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

ایک متّقی اخبار - کرسچن سائنس مانیٹر ایک ایسا اخبار ہے جو اپنے پڑھنے والوں کو گناہوں اور جرائم کی داستان سُنانا اک گناہ کبیرہ سمجھتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ آیا بُری باتوں کا ذکر کرنا اور سُننا بُرائی میں اضافہ کرتا ہے؟ یا اس خیر اندیشی کا نتیجہ صرف یہی ہوتا ہے کہ بُرے کام خاموشی کے ساتھ کئے جاؤ مگر مُنہ سے کچھ نہ کہو۔ ہمارے خیال میں مزے لے لے کر بُرائی کا ذکر کرنا بلاشبہ سُننے والے کو بُرائی کی چاٹ دینا ہے لیکن بُرائی کا بیان کر کے انسانی معاشرت پر اُس کے اثرات کا اندازہ کرنا موجب عبرت ضرور ہے البتہ عبرت پکڑنے والے خال خال ملتے ہیں!

نسوانی دنیا

مصر میں چند سال سے طبقۂ نسواں کی بیداری کا آوازہ بلند ہورہا ہے۔ جنگِ عظیم سے پہلے ہی عورتوں نے ایک انجمن خاتونِ جدید کے نام سے قائم کی تھی جو ملک کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کی معاون بنی، ایک اور ایسی انجمن محمد علی سوسائٹی بھی ہے۔ ۲۲، دسمبر ۱۹۲۱ء کو جب زاغلول پاشا کو مصر سے جلاوطن کیا گیا بیگم زاغلول نے اُس کی جگہ اپنے وطن کی آزادی کا کام سنبھال لیا۔ لارڈ ایلنبی نے اُسے کہا، "آپ کو اجازت ہے کہ اپنے شوہر کے ہمراہ چلی جائیں"۔ اُس نے انکار کیا اور کہا کہ "میں اپنے شوہر کی جگہ کام کرونگی تم اُسکے جسم کو جلاوطن کردو۔ سعد کی رُوح کو تم جلاوطن نہیں کرسکتے۔ وہ اب بھی یہیں ہے اُسی کے گھر میں موجود ہے میں اُسکی بیوی اُس کی واپسی تک سعد بنوں گی۔ یاد رکھو کہ تم دیر تک اُسے قید نہ رکھ سکو گے۔ برادرانِ وطن یہ گوارا نہ کرینگے۔ وہ مر بھی جائے تو اور ایسے ہی لوگ پیدا ہوجائیں گے۔ جہانتک میرے بس میں ہے میں آزادیٔ مصر کا مقدّس کام نہ چھوڑونگی۔ بس یہ ہے میرا پیغام"۔

خاتون کے وفد نے انگریزی مال کی خریداری کے خلاف ایک زبردست تحریک شروع کردی۔ اس غرض سے قاہرہ میں چالیس خاتونوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور صوبے صوبے میں سب کمیٹیاں پھیلادی گئیں۔ بیگم زاغلول کا خیال ہے کہ پردے کی بندشیں چند برس یا شاید چند مہینوں میں رفع ہوجائینگی وہ جب عوام النّاس کے سامنے تقریر کرتی ہے تو بے نقاب ہوکرآتی ہے اور صرف اپنے سر پر ایک دوپٹہ ڈال لیتی ہے۔

مصطفیٰ کمال پاشا نے حال میں بروصہ کی انجمن اساتزہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "وقت آگیا ہے کہ ہماری عورتیں برقعہ اتار کر باہر نکل آئیں اور قومی کاموں میں مستعدی سے حصّہ لیں۔ ہمارا مذہب اتنی بندش پر مصر نہیں۔ مذہبی احکام کو بالکل مسخ کردیا گیا ہے۔ عورتوں کا اپنے تئیں چھپائے رکھنا مناسب نہیں کہ اس سے اجتماعِ قومی کو نقصان پہنچتا ہے۔ ترکی عورتوں نے لڑائی کے دَوران میں سامانِ حرب و رسد کی نقل و حرکت میں بے انتہا خدمتِ قوم کی ہے۔ یہ میدان درست ہے اور اب وقت ہے کہ وہ عالم، قصّہ نویس مقرر اور معلّم بنیں۔ اور قومی زندگی میں عمل کی لہر پیدا کردیں"۔

دولتِ انگورا نے عمر رسیدہ کنواروں کی جبری شادی کا قانون نافذ کیا ہے۔

معصوم لڑکی

"تُو مجھے عزیز ہے!" بھولی لڑکی نے بکری کے بچے سے کہا اور اُس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ "تُو مجھے سب سے بڑھ کر عزیز ہے!" "لوگ جو شہروں میں گھومتے ہیں سرِ شام بازاروں کی سیر کو نکلتے ہیں۔ رات کو ناچ رنگ دیکھتے ہیں میں سُنتی ہوں کہ اُن کے زرق برق لباس کی شان، اُن کی اٹھلاتی ہوئی چال کا انداز اُن کی گفتار کی شستگی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے" "لیکن یہ مجھے کسی نے کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ اُن میں تجھ سا قدرتی حُسن تجھ سی ہمدردی اور تجھ سی سچائی بھی ہوتی ہے"؟

تُو جب ندی کے کنارے مخملیں گھاس پر لیٹا ہوتا ہے اور یونہی دھوپ میں پڑا رہتا ہے تو میں نہیں جانتی کہ تیرے دل میں کیسے کیسے خیالات موجزن ہوتے ہیں۔ پھر تو اپنی اگلی دونوں ننھی سی ٹانگیں زمین پر ٹیک کر اُٹھتا ہے اور میری جانب دیکھتا ہے۔ میری آنکھیں تیری آنکھوں سے ملتی ہیں اور تُو لپک کر میری گود میں آجاتا ہے! کیا اُن لوگوں کو جو تمدنی ترقی کی دُنیا میں رہتے ہیں خدا کے اُن بھیدوں کا پتہ ہے جو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تیرے کان میں آ پھونکتے ہیں؟ کیا اُن کے دل و دماغ اِن سادہ خوشیوں سے معمور ہوتے ہیں۔ جو بے طلب تیرے جی میں آکر آباد ہوتی ہیں؟ کیا اُن کے سینے میں اُس محبت کا سویا ہُوا جذبہ موجود ہے جو خدا کی کسی مخلوق کو دیکھ کر تیرے سراپا میں اطمینان کے ساتھ بیدار ہو جاتا ہے؟ ہوگا! میں نہیں جانتی! مجھے اُن سے نفرت نہیں کہ میں جانتی نہیں وہ کیسا دل رکھتے ہیں اور اُن کا برتاؤ کیسا ہے؟ لیکن تُو میری راحت کا حصّہ دار نہیں پھر بھی تجھے مجھ سے اُلفت ہے۔ اس پر میں تجھ سے کیونکر پیار نہ کروں، تجھے کیوں اپنے سے نہ لپٹا لوں کہ شاید اسی طرح وہ خالص خدائی جو تجھ میں پوشیدہ اور تجھ سے ہویدا ہے میرے جسم و جان میں سرایت کر جائے اور میں پھر وہی وجود بن جاؤں جو اس دُنیا میں آنے سے پہلے تھی!

بشیر احمد

معصومیت

خوش ہیں معصوم جنکے خیالات لغزشوں سے پاک وصاف ہیں اور ندامت سے خالی!

جو صاف دل ہیں اُنکے لئے سب کچھ پاک وصاف ہے

معصوم ہمیشہ انجان ہوتے ہیں!

معصومیت شکی مزاج نہیں۔

جو خود بُرا نہیں وہ اوروں کو بُرا نہیں سمجھتا

دلبری ہے تو معصومی میں اور استقلال ہے تو حقداری میں۔

جہاں گفتار ناکام رہے وہاں معصوم خاموشی اکثر بازی لے جاتی ہے

اپنی زندگی کو برفانی میدان کی طرح پاکیزہ بنالے جہاں تیرے قدم نشان تو چھوڑ جائیں لیکن گرد مطلق نہ اُٹھے

کسی خوفناک آنکھ سے نہ ڈرنا کسی دھوکے باز زبان پر شک نہ کرنا! یہ معصومی ہی کا کام ہے اور یہ اک ایسی خوبی ہے جو صرف خالص نیکی کے حصے میں آئی ہے۔

اے خدا مجھے معصوم ہی رکھ اوروں کو بُرا بننے دے!

جو کمینگی سے دور بھاگتا ہے اُسے کسی کا ڈر نہیں

بھولےپن سے بڑھ کر کوئی ناز نہیں!

سب سے بڑی نیکی بھولاپن ہے اسکے بعد شرمیلاپن

جسکا دل معصوم ہے اُسکا جسم مسلح ہے

معصومی چمکدار زرہ کی طرح ہے وہ زینت بھی دیتی ہے اور بچاتی بھی ہے۔

گلچیں

تاریخ ادبیات دراصل ایک تاریخ خیالات ہے۔ عہد بعہد کے مطالعۂ ادبیات کا صرف یہی مفہوم نہیں ہے کہ انسان ہر زمانے کے عَلم المحاورات۔ شاعرانہ موشگافی اور علم الالسنہ کا مطالعہ کرے بلکہ اسکے ساتھ ہی ہر عہد کے انقلاباتِ خیالات کا جو مختلف مُلکوں میں مختلف اوقات میں پیدا ہوئے ہیں موازنہ کرنا بھی لابدی ہے، اور اس مضمون کو آپکے سامنے پیش کرنے میں، مَیں زیادہ تر اس بات کی کوشش کرونگا کہ ظاہری صورت کی طرف متوجہ نہ ہوکر، ہندو مسلم السنہ کی ترقی کے اصلی وجوہ و اسباب کو بیان کردں، اور خیالات کی بلندی اور حیاتِ انسانی کی ترقی کو محض الفاظ کی تاریخ کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح عرض کردں۔

آفرینش تاریخ کے وقت وسط ایشیا کے تاریک و بعید مرفوع مقامات سے ہمارے آباؤ اجداد اُترتے ہیں بحر اخضر و ارل کے درمیان والے غیر مسطح ملک ترکستان میں "انڈو جرمن" خاندان دو حصّوں میں بٹ جاتا ہے، نہ ہمکو اسکی خبر ہے کہ کن اقتصادی یا طبعی ضروریات نے انہیں آبائی وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا اور نہ ہم اسکو کبھی جانیں گے۔ اس کوہ قافی قسم کی شاخوں میں سے ایک بر اعظم یورپ

میں پھیل گیا اور دوسرے نے جنوب کی طرف حرکت کرکے ایران و ہندوستان کو اپنا مسکن قرار دیا، ہمارے ان اجداد نے اپنا نام آریہ یا احباب رکھا اور بعض اسکے معنی شریف "معزز" "اعلیٰ" یا "مقدس" بھی بتاتے ہیں ہم اور دوسری وہ قومیں جو بحر اخضر اور کوہ قاف کے اس جفاکش قبیلہ کی نسل ہونے کا دعوے کرتی ہیں اپنے کو ابتک آریہ کہتی ہیں، لیکن ماہرین فن نے "انڈو جرمن" اصطلاح کو ترجیح دی ہے کہ یہ زیادہ وسیع اور صحیح تر ہے، بہرحال ہمکو اس وقت نہ اس کی ضرورت ہے کہ ہم ان دونوں اصطلاحوں کی ترجیح پر بحث کریں اور نہ ہمکو علم الانسال (نسلیات) اور علم الانسان کی دلیلیں اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرنی ہیں، نظر عام میں دونوں اصطلاحیں ہم معنی ہیں اور ہمکو بھی اس وقت یہی فرض کرلینا چاہیئے،

جیساکہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ کوہ قاف کے جنوب کی جانب نئے مرغزاروں کی تلاش میں حرکت کرنے والی جماعت جدید وطن کی تلاش میں ایران میں پھیل گئی اور پھر غیر مسطح ممالک اور کوہ ہائے افغانستان کی برفپوش چوٹیوں کو عبور کرتی ہوئی ۲۰۰۰ سنہ قبل مسیح میں درہائے خیبر و گلگت سے وادی کشمیر اور پانچ دریاؤں والی زرخیز سرزمین داخل ہوگئی۔ تدریجاً لیکن یقیناً جب جب انکو موقعے ملے اور ضرورتیں پیش آتی گئیں، وہ وادی گنگ اور نربدا ہوتے ہوئے مشرق میں آسام کی سرحد تک اور جنوب میں کوہ ہائے نگرہی تک متوطن ہوگئے۔ یہاں کے اصلی باشندے یا اسیر ہوئے۔ تاہم ان میں سے چند اس خوفناک طوفان سے جانبر ہوسکے اور قبل آریہ کی قوموں کی نشانیاں سیلون و مدراس کی تلنگو و تامل قومیں ہیں۔

یہ ہے آریوں کے حملہ کی ایک مختصر تاریخ لیکن قبل اسکے کہ میں ترقی خیالات و رسوم کو بیان کروں شاید یہ بے موقع نہ ہوگا اگر میں مختصراً تحریر کی ابتدا کو بتاؤں۔

ابتدائے تحریر کی تاریخ خواہ ہندوستان کی ہو یا کسی دوسرے ملک کی، دو مختلف مگر باہم متعمد اہم شاخیں رکھتی ہے اولاً حروف تہجی کی ابتدا جو صدائے کلام کے حامل ہیں اور دوسرے تحریر کی ابتدا جو حروف تہجی کا واسطہ ہے۔

سنسکرت کے حروف تہجی کی ابتداء کا ماہرین فن کو ابتک کوئی معقول پتہ نہیں چلا ہے اور وہ اس معاملہ میں اس وقت تک غیر متیقن اور مختلف الآراء ہیں، پروفیسر رائز ڈیوڈ

(Prof: Rhys David) کا جو عہد بودھ کے بڑے ماہر ہیں، خیال ہے کہ سنسکرت حروف تہجی کی ابتداء "قبل۔ سامانی" زبان کے ہے جو کہ وادی فرات دجلہ (عراق عرب) میں بولی جاتی تھی اُوسے ہے، دُر یوپڈین تاجر نہ کہ آریہ، ان حروف کو قدیم بابل سے ۸۰۰ ق م میں ہندوستان لائے؛ سر الگزینڈر کننگھم Sir Alexander Cunninghem کہتے ہیں کہ یہ حروف تہجی بلا امداد غیرے خود ہندوستان ہی میں مرسوم و مرقوم ہوئے؛ ان دونوں متضاد رایوں کی موافقت و مخالفت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن ہمکو اس میں اُلجھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؛ کیونکہ یہ بحث علمی (اور علم الآثاری) ہے۔ اس وقت سے ابتداء کرتے ہوئے جبکہ حروف تہجی ہندوستان میں موجود تھے۔ ہمکو اب دوسری شاخ کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

قدیم اہل بابل اپنے اعلانات۔ قانونی اسناد اور کتابیں۔ مٹی کی تختیوں اور اینٹوں پر لکھا کرتے تھے، مگر نہ معلوم کسی نہ کسی خاص وجہ سے یہ تختی نویسی کبھی بھی ہند میں عام نہیں ہوئی تانبے اور سونے کے پتروں پر احکامات کندہ کئے جاتے تھے۔ اور درختوں کی چھالیں اور تاڑ کے پتے بھی اس ملک میں بہت مقبول تھے، ان قلمی نسخوں کے اوراق لمبے مستطیل ہوتے تھے، جن کے بیچ میں ایک سوراخ ہوتا تھا جس کے ذریعہ سے تمام منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کیجاتی تھی؛ اس قسم کی تحریرات بہت شاذ ہیں اور مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں، لیکن ان سے تاریخ پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور ادبیات و علم الاثار کے طلباء کے لئے بہت کچھ مفید ہیں۔ آپ یہ سُن کر خوش ہونگے کہ ہماری ذاتی لائبریری میں اس قسم کے دو عجیب نسخے موجود ہیں اور گو وہ اب تک پڑھے نہیں گئے ہیں تاہم مجھے اُمید ہے کہ بہت جلد وہ راز ہائے سربستہ جو ان دونوں کتابوں میں مخفی ہیں پبلک کے سامنے آجائینگے؛

ابتدائی ادبیات ہند زیادہ تر مذہبی تھیں اور سختی سے مذہبی فرقہ انکی حفاظت کرتا تھا وید اور دوسری مذہبی کتابیں ایک عرصہ دراز تک لکھی بھی نہیں گئی تھیں اور صدیوں تک باپ سے بیٹے کو اور استاد سے شاگرد کو زبانی پہنچتی رہیں؛ اور یہ شائد ایسا بے مثال کمال ہے جو کسی قوم کی تاریخ ادبیات میں نہیں، ذیل کے بیان سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ حصول تعلیم کے مواقع ان ایام میں کس قدر محدود تھے "اگر کوئی شودر عمداً وید کو سُن لے تو اسکے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈالدو

اگر زبان سے وید کی قرأت کرے تو اُسے کاٹ دو اور اگر اسکے دماغ میں محفوظ ہو تو اس کے جسم کو پیس ڈالو" اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ قدیم ترین مادی اور حجری کتبے عہد بودھ کے ہیں۔ اور قدیم ترین چھال یا پتے کی کتابیں بھی اسی زمانہ کی ہیں،

قبل اس کے کہ ہم ہندِ قدیم کی ادبیات کو سمجھیں ان کی زبان کی ترقی کا کچھ علم ناگزیر ہے۔ پراکرت کا ایک اہم درجہ ہے اور اس کی آبائی زبان کا رشتہ بھی قبل اسکے کہ ہم ادبیات کے اصول بیان کریں سمجھ لینا چاہیئے،

ویدی مناجاتیں جنکو ہم آئندہ چل کر بیان کرینگے قدیمی سنسکرت میں لکھی گئی ہیں پراکرت بعد کی چیز ہے اس کا تعلق ویدی ادبیات یا سنسکرت سے ایسا ہی ہے جیسا اطالوی زبان کا لاطینی (Latin) سے اس لئے جس طرح ٹیسیٹس (Tacitus) کی ہر تصنیف ڈنٹی کی تصانیف سے قدیم تر ہوگی اسی طرح سنسکرت کی ہر تحریر پراکرت کی ہر تحریر سے زیادہ پرانی ہونی چاہیئے، لیکن حیرت یہ ہے کہ واقعہ بالکل اسکے متضاد ہے پراکرت کی تمام کتابیں تقریباً ہر حیثیت سے سنسکرت کی تمام کتابوں سے قدیم تر ہیں بودھ نے سنسکرت میں تبلیغ و اشاعت نہ کی بلکہ اپنی مادری زبان پراکرت یا مگدھی میں۔ بودھ مذہب کی تمام تحریریں بلا استثنا اسی زبان میں ہیں اور اسی طرح سے ادبیات کا ایک کافی ذخیرہ جمع ہو گیا۔

اس وقت جبکہ پراکرت بلا شرکت غیر سارے ملک کی رانی ہو رہی تھی اور اپنی ماں سنسکرت سے گوے سبقت لے گئی تھی ٹھیک اسی وقت ۴ صدی ق م میں سنسکرت کا ایک بہت بڑا نحوی پیدا ہوا پنینی گوتم بدھ کی وفات کے ۵۰ یا ۲۰۰ برس بعد پیدا ہوا، اسکی پیدائش تاریخ ادبیاتِ سنسکرت کا ایک نیا دور شروع کرتی ہے جس کا وہ بلا اختلاف باوا آدم کہلاتا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ صرف اسی کی بدولت ہم لطیف، دقیق اور صاف و شستہ سنسکرت (سام سکریت) پاتے ہیں۔ کالیداس اور بھوبھوتی کی تمام تصانیف اس جید عالم نحو کی ممنونِ احسان ہیں،

پراکرت نے بودھی ادبیات کی بنا پر جو مقام حاصل کیا تھا وہ اس قدر بلند تھا کہ پنینی کے احیائے سنسکرت کے بعد بھی وہ اپنی جگہ پر زمانہ دراز تک قائم رہی۔

ایک توضیح بطور جملہ معترضہ یہاں پر ضروری ہے۔ میں نے اس وقت تک جہاں جہاں پراکرت کا تذکرہ کیا ہے اس سے میری مراد مگدھی زبان ہے۔ پراکرت میرے خیال میں فرانسیسی زبان کے "پٹنالیش" کے مرادف ہے۔ ہر وہ زبان جو قدیم ہند میں مقبول عام تھی پراکرت کہلاتی تھی لیکن جب مگدھی زبان نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی تو ماہرین فن نے اس زبان کو جو مگدھ اور اس کے اطراف میں بولی جاتی تھی پراکرت کے نام سے موسوم کر دیا۔ قدیم ہند کی مختلف السنہ یا پراکرت سے جو زبانیں ابتک نکلی ہیں وہی وہ زبانیں ہیں جو آجکل ہندوستان کی مختلف السنہ ہیں اور جن پر میں اور کہیں بحث کرونگا۔

ہمارے آباواجداد نے جب پنجاب اور وسط ہند کے جنگلوں کو اپنی بھدی پتھر کی کلہاڑیوں سے کاٹ ڈالا تو تمام خوفناک سرزمین ایک زرخیز و سرسبز و شاداب خطۂ ارضی بن گئی۔ ہمارے یہ بزرگ زمینداری کو ایک بہت معزز پیشہ خیال کرتے تھے اور کاشتکاری کو غلاموں کی مشغولیت سمجھتے لیکن بہت جلد اس خوفناک دیو نے جسے ہم "ضرورت" کہتے ہیں انہیں کاشتکاری کے لئے مجبور کیا اور بہت جلد کامیاب اہل کاشت بن گئے۔ آرین ہمیشہ دو نمایاں جذبات کے لئے مشہور ہیں۔ (۱)۔ حب حرب و حریت (۲) کشف و کرامات، پہلے کے نتائج پنجاب کے بہادر سکھ۔ جفاکش مرہٹے۔ انتھک پٹھان۔ پرجوش جرمنی اور فرانسیسی ہیں، اور انکشافی قسم نے شاندار یونانی۔ و رومی سلطنت کی دلفریب شکل میں روپ دکھایا اور سکندر۔ و نپولین سے سپاہی پیدا کئے۔ فلسفہ، ادبیات، صنائع۔ علم کی حیثیت سے مدون کئے گئے، فلسفہ میں بھی جز و کشفی نے بہت کچھ کمال دکھایا۔ زنو (Zeno) اور اپیکورس (Epictetus) کی دہریت شکسپئیر و کالیداس کے تمثیلات۔ تان سین، موزرٹ اور بیتھوون کی موسیقی نیوٹن اور گلیلیو کا مطالعۂ فطرت ان تمام جواہرات سے جو آرین دماغ کے خزانہ میں موجود ہیں۔ چند انمول رتن ہیں۔

بحر اخضر کے قبائل نے جب اپنے نئے گھر اور جدید مسکن آباد کر لئے اور پنجاب کی زمین کو حسب خواہش تیار کر لیا تو ان کے دماغ خیالات فتح و جنگ سے ایک بہترین تصور کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہی وہ تخیل اور ماوراء الطبیعات تصور ہے جس نے ہمیں وید دیا۔ جس میں ایک

ایسے فلسفہ کے بیج تھے جس کی مثال دنیا کے کسی گوشہ میں نہیں مل سکتی۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ ادبیاتِ سنسکرت و فلسفیات پر ایک عام نظر تھی۔ اب ہمیں الگ الگ ہر چیز بوضاحت بیان کرنا چاہیئے اور اس کی ابتداء ویدی مناجات سے ہوتی ہے۔

آریئے جو مصر کے پنجاب کے اصلی باشندوں (واسیس) سے لڑے، وہی ویدوں کے اصلی مباحث ہیں۔ ویدی مناجاتیں دراصل قدیم ہند کی مختلف توصیف و ستائیش ہیں۔ جو ہند میں اسی عزت و حرمت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں جس طرح انجیل ممالک نصاریٰ میں۔ اور قرآن شریف عالم اسلامی میں۔ منتروں کا مجموعہ مقدس سردنی برہمہ کی غیر فانی سانس ہے جسے عہدِ قدیم کے رشیوں نے سُنا۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ وید مناجاتوں اور دعاؤں کے مجموعے ہیں وہ سمہیت کہلاتے ہیں اور مختلف رسوم کے ادا کرنے کی غرض سے مرتب کئے گئے ہیں (بہر حال سوامی دیانند اس بیان پر معترض ہیں) مناجاتیں کثرت سے فطرت کی مختلف اشیاء کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہیں اور یہ رگ وید کا اہم آخر حصہ ہے جس میں بعض غیر مادی دیوتاؤں سے تخاطب کیا گیا ہے رگ وید۔ ۳۳ دیوتاؤں کی مدح کرتا ہے لیکن ان میں اگنی۔ سوما۔ اندرا۔ گاما۔ درد نا۔ سوتیری۔ وشنو۔ اور رُدرا سب سے زیادہ اہم دیوتا ہیں۔ اگنی۔ خدائی آتش ہے۔ اور اسکے گرد وید کے تمام رسمی دیوتا حرکت کرتے ہیں آندرا موسم بہار کی برسات کا کریم دیوتا اور دیوتاؤں کا دیوتا ہے۔

"سات روشن شعاعیں اس کی ابرو کو مزیّن کرتی ہیں"، "سات بڑے دریا اُس سے نکلتے ہیں"، "زمین و آسمان کو اس کی حکومت کا اقرار ہے"، "لرزاں پہاڑیاں حقِ اطاعت ادا کرتی ہیں"، "رعدِ خداوندی کا برق انداز ہے"، "اُس کی عزت و حرمت بڑھتی رہے" "قوی اندرا (جو) صادق و مضبوط (ہے) تیرے لئے مناجات اور تحفے ضروری ہیں"،

"یاما"، موت کا خوفناک دیوتا ہے "رُدرا" اُسی کا دوسرا نام ہے اگرچہ درون کے لئے بہت کم مناجاتیں ہیں، تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ اندرا کے بعد دوسرا اہم دیوتا یہی ہے وہ مذہب

کی روحی صورت کی تجسیم پیش کرتا ہے وید کی مقدس ترین مناجات آندرا کی بجائے اسکے نام سے منسوب کی گئی ہے ؎

،، لاکھوں زخم جو مندمل ہوتے ہیں وہ تیرے ہی ہاتھوں کی برکت وجودِ فانی پر ہے،
لاکھوں برکتیں جو نازل ہوتی ہیں وہ سب کی سب تیرے ہی غیر مختتم خزانۂ رحم سے ہیں ہمکو آئندہ گناہوں سے بچنا سکھا۔
او خدا! ہم نے جو گناہ کئے ہیں ان سے ہمیں نجات دلا،،

دوسری جگہ ہے۔

،، کاش یہ حقیر عبادت ادا ہو سکے او خدائے ویرونا! تیرے تخت تک پہنچ سکے۔ کاش محبت کا یہ ادنےٰ راگ او شاہ فلک! تیرے قلب کو متحرک بنا سکے ہماری راحتوں میں اور ہماری مصیبتوں میں ہمیشہ ہمیں اپنی برکتوں میں غرق رکھ،،

یوشاس صبح کی منور دیوی ہے جو اپنی گلابی چمک سے ظلمتِ شب کو دُور کرتی ہے، سوتیری غیر طلوع آفتاب ہے جو ایک منکوح دیوتا ہے جس کی ،،نصفِ بہتر،، نیلگوں زرین ملبوس یوشاس ہے، وشنو تاریخی حیثیت سے ایک اہم ترین دیوتا ہے۔ یہی وہ دیوتا ہے جس نے دُنیا کو دیوؤں سے بچایا اور یہی وہ وجود ہے جس نے بہبودیٔ عالمِ انسانی کے لئے کئی مرتبہ انسانی اوتار لئے، اور اس طرح وہ شاندار تعریف کا مستحق ہُوا، دوسرے دیوتا لاتعداد ہیں لیکن ہمیں ان سے بحث نہ کرنی چاہیئے۔ رگ وید کسی حیاتِ مستقبل کا یقین نہیں دلاتا لیکن اس میں بھی روح کو غیر فانی بتایا گیا ہے، بعد از مرگ جزاء و سزاء کا تذکرہ ہے لیکن تمام چیزیں مخلوط ہیں۔ ہندو ماہرینِ فن مغربی ماہرین سے جو وید کے آفرینش عالم کو الحاد و شرک بتاتے ہیں۔ اختلاف کرتے ہیں، ہندؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ وید کے دیوتا اس ،،ہستی اعلیٰ،، کی مختلف اشکال ہیں اور میں بھی اس کو ماننے کے لئے تیار ہوں۔

رگ وید کے علاوہ بھی اور وید ہیں جو بعد کی تصنیف اور کم اہم ہیں، ان میں سے سام وید رگ وید سے ماخوذ ہے اور سام کے رسمی قانون کی نظموں کا اختصار ہے، اتھروا وید رگ وید کی طرح موقع قربانی کی مناجاتوں کا مجموعہ ہے ایک اور وید یجر وید ہے وہ بھی ایسے ہی مواقع میں مستعمل ہوتا ہے، یہ راہ

فلسفہ ویدی میں ایک اور قدم بڑھاتا ہے۔

مرورِ ایام کے ساتھ ویدی نظمیں بھی کم سمجھی جانے لگیں، بہت سے ابواب عام نظر میں مشکل ہوگئے اور ویدی زبان نے قدامت کی صورت اختیار کرلی۔ مذہبی فرقہ جو نشۂ علمی میں چور ہو رہا تھا اسکے مختلف معنی بتاتا اور ملک کے ہر گوشہ سے مذہبی عقیدتمندوں کی جماعتیں برہمنوں کی حلقہ بگوش ہوگئیں۔

انکے فقہی۔ نحوی اور فلسفیانہ مباحث رفتہ رفتہ جمع ہوتے گئے اور اُن سے ایک نئی ادبیات "برہمنا" پیدا ہوگئی۔ یہ مذہبی کتابیں نثر میں لکھی گئیں اور آریہ زبان کی قدیم ترین نثری سرمایہ ہیں۔

اوپنشد ہند و عالم فکر کے بلند ترین زینے ہیں دراصل وہ برہمنوں کے عقدے ہیں، وہ بذات خود کافی ادبی مرتبہ رکھتے ہیں اوپنشد کا تخیل خالق مخلوق، ویدی نظموں کی تفکر سے کہیں زیادہ فلسفیانہ ہے، یہ کتابیں ... برس قبل مسیح سے بہت پہلے کی لکھی ہوئی نہیں ہیں کیونکہ انکے اکثر اہم اصولوں کا بودھ ادبیات میں حوالہ دیا گیا ہے۔ بزرگ ترین دیوتا برہما آغاز عالم ہے جو کچھ بھی مادی یا روحی حیثیت سے پایا جاتا ہے سب اسی کے اجزا ہیں

"یہ تمام عالم برہمہ ہے"
"تمام چیزیں جو زندہ ہیں متحرک ہیں یا فانی ہیں"
"اُسی سے پیدا ہوئی ہیں اسی سے ملتی ہیں"
"اُسی ہستی بزرگ میں ختم ہوئی ہیں"

. . . .

"تمام وہ عالم جو نظر آتے ہیں"
"اور یہ تمام افلاک جو متحرک دائمی ہیں"
"اور وہ تمام قوت جو پیدائش کی طرف منعطف ہے"
"وہ صرف وہی روح عالم ہے"
"تمام نادیدہ ہے لیکن عیاں ہے"

"تمام زمین میں اور تمام وسیع آسمان میں"
"ہر جگہ متحرک اور ہر جگہ موجود ہے"
"وہی برہمہ ہے وہی خدا ہے"

زبان کی شیرینی، نقطۂ نظر کی لطافت، اور خیالات کی علویت، ہی وہ چیزیں ہیں جنہوں نے ہندوستانیوں کے دل میں اوپنشد کی غیر فانی محبت پیدا کر دی ہے، ایک ہندو کے گھر میں اوپنشاد سے بڑھ کر کوئی نہ محبوب ہے نہ مقدس۔ ایک مورخ اس کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہے "آغاز آفرینش کے بارے میں دنیا میں اوپنشد سے بڑھ کر کوئی کتاب بہتر جامع اور زندگی بخش نہیں ہے؛ یہ زندگی میں میرے لئے باعث آرام حیات رہی ہے اور بعد از مرگ باعثِ تسلی جان رہیگی"

ایک سال کے بعد دوسرا گذرتا جاتا تھا اور زمانہ کی درازی کے ساتھ ہی ساتھ برہمنہ اور اس کے دیباچے اوپنشد بھی دوچند ہوتے جاتے تھے، حتیٰ کہ خوف پیدا ہو گیا کہیں یہ ضائع نہ ہو جائیں، تمام تعلیمات عموماً اور برہمنہ کی تعلیم خصوصاً ممنون کتابت نہیں ہوتی تھیں، بلکہ زبانی طور پر استاد سے شاگرد حاصل کرتا تھا اور انہیں حفظ کر لیا کرتا، پس طلباء کے لئے اس دفتر عظیم کا خلاصہ کیا گیا جو سترہ کے نام سے مشہور ہیں عام طور سے لوگ انہیں سمرتی کے نام سے پکارتے ہیں اور ادبیات ویدی کی یہ آخری کڑیاں ہیں۔ علامہ بدرائن کے سترول پر عہد شنکر تک تشریحیں لکھی گئی ہیں۔ شنکر فلسفہ کے مدرسہ (مذہب یا اسکول) ویدانت کا جس نے گذشتہ صدی میں بہت کچھ اہمیت حاصل کر لی ہے بانی تھا۔

۶۰۰ برس قبل مسیح میں بنارس کے قریب کپیلا وستو کے شہر میں گوتم بدھ پیدا ہوئے انکے والد ایک جمہوریت کے صدر تھے گوتم کے لڑکپن ہی سے اسکے افکار ذہنی نمایاں تھے اسے اپنے ساتھیوں کے کھیل کود اور ہنسی مذاق سے زیادہ فطرت کے رازہائے سربستہ کے انکشاف و دریافت میں حظ حاصل ہوتا تھا۔ زندگی اسے صاف خواب نظر آئی طفلی نمود صبح ہے۔ اور موت آغازِ شام۔ ایام حیات عرصۂ محدود ہے۔ مسرت و شادمانی سرحد غم سے متحد ہے۔ جب کبھی انسان نے امتیاز و بلندی کی کوشش کی اسکے راہِ سعی میں تلخی تھی۔ یہ نقشۂ زندگی ہے۔

بعد از موت کیا ہوتا ہے اس سے کوئی انسان آگاہ نہیں اور یہی راز ہائے موت و حیات اور شادی و غم و مسرت و الم۔ اور حیات بعد الموت کے رموز تھے جنہیں بودھ نے حل کرنیکی کوشش کی۔ اس نے گھر۔ بیوی۔ بچے۔ والدین۔ سلطنت کو الوداع کہا اور ان اشکال حیات کے لئے جو اسکی دماغی آنکھیں رہی تھیں۔ مصروفِ کار ہوگیا۔ اس کے پہلے رہنما بھی برہمنہ تھے لیکن انکے غیر متیقن اصول فقہی اور ویدی تعلیمات کے اصطلاحی ڈھکوسلوں سے وہ گھبرا گیا اور ذاتی تجربات اور تپسیا سے انکو حل کرنیکا ارادہ کر لیا۔ گوتم نے اِس صداقت کو پالیا، اِس کا مفہوم "او دیستھا! وہ شخص جو مہربان، محب کامل، صاف دل اور قادر علی ذاتہ ہے، وہ نروان کے قرب میں ہے"

بودھ نے "قانون" کی تعلیم دی اور اسکی مقدس تحریرات کے ساتھ ادبیات کا ایک دفتر عظیم جمع ہوگیا ہیون شنگ کے زمانے تک بلکہ اس سے بعد تک بودھی فقہا اپنے آقا کی تحریرات پر شرحیں لکھتے رہے۔ جس طرح عبرانی۔ عیسائیوں کے لئے، عربی۔ مسلمانوں کے لئے، اور سنسکرت۔ ہندوں کے لئے مقدس صحائف کی زبانیں ہیں۔ اسی طرح پالی یا پراکرت بودھ مذہب والوں کے لئے ہے اگر مجھے ادبیات بودھی کے بیان کرنیکا موقع ملتا تو میں بہت خوشی سے اس خدمت کو انجام دیتا۔ لیکن وقت کی کمی سے مجبور ہو کر میں صرف سنسکرت اور دوسری عام زبانوں تک اپنے خیالات کو محدود رکھونگا۔

ویدوں کے علاوہ نظم و نثر کا بڑا دفتر بھی جمع ہوگیا جو دنیا کی بہتر سے بہتر اختراعات دماغیہ کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے آریہ آبا و اجداد دیوتاؤں کی مدح کے علاوہ اپنے بادشاہ و ملکہ۔ اپنے ہیرو اور اقطاب اپنے فتوحات جنگ و صلح کی تعریف میں بھی رطب اللسان ہیں اسی عہد عجیب میں رامائن اور مہابھارت نے عالم وجود میں قدم رکھا۔

مہابھارت جیسا کہ ہم جانتے ہیں مجموعی طور پر ایلیڈ اور اوڈیسی سے آٹھ گنی بڑی ہے۔ اس کے مختلف موضوعات اور چند در چند تعلیمات کو دیکھتے ہوئے یہ تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام چمنستان ایک ہی شاعر کا کھلایا ہوا ہو، اس جنگ بھارت میں ہمیں بادشاہوں۔ رشیوں اور فلسفیوں کی غیر مختتم ہستیاں حرکت کرتی نظر آتی ہیں۔ پانچوں پانڈوں کے واقعات کی بنیاد پر اخلاقی اور نتائج فلسفہ کی عمارتیں کھڑی ہیں۔ علم الاخلاق۔ منطق۔ حربیات۔ اور فلسفیات۔ تمام

کی مستقل بحثیں درج ہیں۔ بھگوت گیتا جو ہندؤں کے لئے اسی مرتبہ کی ہے جیسے Book of Psalms عیسائیوں کے لئے، معرکۂ کرک شترہ کا نتیجہ ہے شہزادہ ارجن آئندہ جنگ سے لرزاں و خوف زدہ ہے کیونکہ وہ اپنا ہاتھ اپنے اعزا کے خون سے رنگین کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن کرشن اس کو اس کی بزدلی اور بیجا خوف پر ملامت کرتے ہیں۔

"اپنا فرض ادا کرو!

اپنے نام کا خیال رکھو اور مطلقاً خوف زدہ نہ ہو!

کوئی چیز حربی جذبہ (روح) کو اس قدر جوش میں نہیں لاسکتی جس قدر کہ ایک جنگ حق،،

اس کے بعد وہ مذہبی اور عقلی اعمال کو علم۔ حلم۔ عبادت۔ کثرت و وحدت، مادہ۔ روح۔ تقدس وغیر تقدس نجات و آزادی کو فلسفیانہ اصول پر بحث کر کے سمجھاتے ہیں" سادہ لیکن بہترین الفاظ میں انہوں نے فلسفیانہ نظام بتایا ہے جو ابتک برہمنی عقیدہ ہے اور اپنے اندر کپیلا، پتنجلی اور ویدی اصول بھی شامل کر رکھے ہیں۔

اگر میں مہابھارت کی ان خصوصیات کو جن کی وجہ سے اس نے انجیل ہند لقب پایا ہے اور ایام طویل تک اس نے جو اسباق و اصول اہل ہند کو سکھائے ہیں اور جن کا اثر ظاہر تھا ہے اور رہیگا، بیان کروں تو شاید یہ آپکے وقت عزیز پر ایک بے باکانہ حملہ ہوگا میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر حضرات دروپدی اور پانڈوں کے دلکش افسانے انکی مختلف المحالات فاتحانہ زندگیاں، اور نل دمینتی ساوتری، سنجیون کی داستان ہائے دل فریب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اول اول جب یہ قصے یورپ میں شایع ہوئے تو انہوں نے یہاں ادبی و معاشرتی حلقوں میں ہلچل پیدا کردی، زبان کی لطافت۔ خیالات کی بلندی نے اس براعظم میں بھی ان کے سر پر مقبولیت کا تاج رکھا شیگل Achlegal اور گوئٹی Goethe ان ہندی نظموں کی تعریف میں حیران ہیں اور Achopenbain نے خواتین ہند کی خصوصیات شریفہ سے متاثر ہو کر مغربی عورتوں سے اسکا ایک دلچسپ تنقیدانہ موازنہ کیا ہے۔

راماین سے بھی اہل مغرب اچھی طرح واقف ہیں اس نے ہندوستان میں مہابھارت

سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے شہزادہ رام و شہزادی سیتا کی داستانِ واقعاتِ عجیبہ آج بھی اسی جوش و محبت سے سارے ہندوستان میں پڑھی جاتی ہے جیسے وہ اسکے مصنف بالمیکی کے زمانہ میں زبان زد تھی۔ "رام ہند کا کامل ترین ہیرو ہے" لاکھوں پرستاران مردانگی اسی طرح آج بھی اسکی فقیرانہ اور شجاعانہ داستان سے مستفید ہوتے ہیں جس طرح بادشاہ آرتھر (Arthur) عرصہ دراز تک صدہا قلوب کا ماوا و ملجا رہا ہے" ہندوستان کی خواتین کی اگر واردات قلبی کی تفتیش کریں تو شاید ۹/۱۰ کے دل میں آپ سیتا کو ان کا نقطۂ نظر پائینگے، انکے دل میں اس کی اتنی ہی عزت ہے جتنی کہ عیسائی خواتین کو "پاک مریم" سے ہے۔

کالیداس تاریخ ادبیاتِ ہند کی صف اولین میں ہے۔ غریب گھر کا چراغ، جوانی میں نشانۂ مذاق احباب، دُنیا کے بہترین شاعروں میں شامل ہو گیا، اس کی نظمیں، اس کی تمثیلات، اس کی رزم دُنیا کے بہترین اختراعات دماغیہ کے دوش بدوش ہے، روایاتِ ہنود اُسے پہلی صدی قبل مسیح کا بتلاتی ہیں۔ کالیداس وکرمادت کے نورتن کا ایک انمول جواہر تھا۔ مورخین و ماہرین فن ابتک اس وکرمادت کے وجود کے بارے میں مختلف الاراء ہیں بعض اسے داستانہائے ماضی کا ایک فرد تصور کرتے ہیں اور بعض اسے چوتھی اور پانچویں عیسوی صدی کا حکمران چندر گپتا ثانی بتلاتے ہیں۔ میں نے دونوں گروہوں کے دلائل کو بڑی غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا جس پر برسوں سے مسٹر ولسن پہنچے ہیں کہ ہمیں روایات ہنود کو نہ ماننے کی کوئی خاص دلیل مانع نہیں ہے۔ مزید براں میں نے ایک مضمون میں جو میں نے کالیداس پر لکھا تھا دکھایا تھا کہ منگولین فاتح قوزیکی (Kozhiuzkhi) یا کادافیس اول (Kadaphises) ۵۰ ق م نے یونانیوں کو فتح کیا تھا سیتھین (Scythians) کو جو درہائے گلگت سے ہندوستان میں تقریباً ۷۰ ق م میں داخل ہو گئے تھے ۵۷ ق م میں وکرمادت نے شکست فاش دی تھی۔ اسی سال "سمت سال" کا اجراء ہوا اور شاید یہ دور از قیاس نہیں ہے کہ اسی زمانہ سے ادبیات ہند کا ایک دور جدید شروع ہوتا ہے کالیداس جس کی زندہ منور مثال ہے۔

کالیداس کی طرف جن تصانیف کا انتساب کیا جاتا ہے وہ لاتعداد ہیں لیکن ان میں اہم ترین رزمیہ نظمیں "رگھوبنس" اور "کمار سنبھو"، مثنویوں میں "میگھ دت" "دہتو سنہار"، تمثیلات میں "شکنتلا"

"وکرم اروسی" اور مالویگن منتر" ہیں۔

"رگھوبنس" شاعر کے وسطِ حیات کی تصنیف ہے۔ اور اس میں "اکشاوکو" یا سورج بنسی راجاؤں کا تذکرہ ہے۔ ایک نہایت دلچسپ رزمیہ نظم ہے لیکن "کمار سنبھو" سے کچھ کم ہے۔

"کمار سنبھو" یا ولادت خدائے جنگ بلاشبہ کالیداس کی اختراعات فائقہ میں سے ہے اسکے بائیس بندوں میں صرف سات ہم تک پہنچے ہیں مگر اس قدر دلچسپ ولطیف ہیں کہ بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ملک کی کسی وقت کی بھی رزمیہ نظم سے کم نہیں۔

ثنوی "رینوسنہر" یا "دور موسم" شاعر کے عہدِ طفلی کی یادگار ہے اس میں ہم شاعر کو اس کی طفلی زندہ دلی میں پاتے ہیں۔ لیکن ہمیں اس میں پھولوں کی کلیاں بھی نظر آتی ہیں اس کی لطافت اس کی روانی اور اس کا انتخاب ہمیں پہلے ہی سے لطیف ترین۔ دقیق "میگھ دت" کی خبر دیتا ہے۔

ناقدین آج تک اس کا فیصلہ نہیں کرسکے کہ میگھ دت اور شکنتلا میں بہتر کون ہے اس کا فیصلہ ایک مشکل کام ہے "میگودت" صرف ۱۱۵ قطعوں پر مشتمل ہے اور اگر دنیا کی بہترین نہیں تو بہت زیادہ بہتر ثنوی ضرور ہے۔ اس کے خیالات کی سحر انگیز رو جسے شاعر نے بہترین مشرقی خیالات سے غیر فانی بنادیا ہے صرف پڑھ کر معلوم ہوسکتی ہے۔ اور اسی وقت انسان ان سے لطف اندوز ہوسکتا اور اس کی داد دے سکتا ہے۔

تمثیلات جن کا انتساب قلم کالیداس کی طرف ہے "وکرم اروسی" مالویگن منتر" اور شکنتلا" ہیں "وکرم اروسی" ایک دلچسپ و دل فریب کتاب ہے جس میں مذہبیت و روحانیت کی بو بھی آتی ہے یہ نوجوان بہادر بادشاہ "وکرم اور حسین دیوی اروسی کی داستان محبت ہے" مالویگن منتر" ایک شاندار تمثیل ہے "شکنتلا میں کالیداس بام شاعری کے بلند ترین زینہ پر نظر آتا ہے۔ گوئٹے Goethe نے شکنتلا کی تنقید بکمال ایجاز ایک رباعی میں لکھی ہے۔

"اے نوبہار گلہائے نوشگفتہ اور اس کے ثمر ہائے زوال پذیر!

اور اے تمام وہ اشیاء جن سے روح مسحور ہوجاتی ہے، وجدی کیفیت طاری ہوتی ہے اور اس کی غذا ہے۔

اور اے زمین و آسمان والو سب کے سب کیا چاہتے ہو کہ سب کو ایک ہی نام میں متحد

کردیا جائے تو میں شکنتلا کہوں گا اور بس سب کچھ کہا جا چکا،،

قبل اسکے کہ میں دوسرے مباحث کی طرف متوجہ ہوں میری دلی خواہش ہے کہ میں تصنیفات کالیداس پر ادبی اور روحانی حیثیت سے نظر ڈالوں۔

کالیداس کی تمام خصوصیات میں سب سے زیادہ نمایاں اس کی حسن لطافت کی غیر محدود محبت ہے اس کی ہر تصنیف میں اس کی صاف جھلک نظر آتی اور اس کے ساتھ کمال یہ ہے کہ آورد بالکل نہیں۔ جب کبھی وہ کسی حسین شئے کو منظوم کرتا ہے اور تشبیہات و استعارات کے چمن لگا دیتا ہے تو اس کی شاعری بالکل فطرتی اور نتیجہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کے تبحر کے بارے میں اس وقت میں کچھ کہنا نہیں چاہتا بلکہ اس مضمون سے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے چند سطریں ہدیہ ناظرین کرتا ہوں ,, کالیداس کی محبت فطرت نے مباحث شاعری کے لئے اس کے سامنے غیر مختتم موضوعات کا خزانہ کھولدیا۔ اس کی بلند خیالی نے انہیں انمول جواہر بنا دیا۔ اسکے تبحر علمی اور اپنے ملک کے شاندار علم الاصنام کے کمال علمیت نے اس کی تصانیف میں عجیب و غریب جان و شان اور حسن رنگینی کی لہر پیدا کردی کالیداس سرچشمہ۔ آبشار۔ اور پہاڑ کی روایات ماضیہ سے اچھی طرح واقف تھا ملک کی تاریخ و جغرافیہ اسکے دماغ میں محفوظ تھا، شہنشاہی عظمت و شوکت جاہ و جلال، سحاب و غروب شمس کی آتش شفق۔ اسلحہ کی جھنکار۔ میدان جنگ کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ رتھوں کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ۔ ہوا میں پرواز تیر کی سنسناہٹ۔ بہار کی شگفتگی۔ ہمالیہ کی برف، پوشیدہ چوٹیوں کی چمک اور سمندر کی شوکت (جنہیں کالیداس کا قلم بکمال حسن فصاحت و بلاغت پیش کرتا ہے) کالیداس کے اصلی موضوع نہیں ہیں بلکہ ایک معصوم۔ پاک، حسین عفت و عصمت کی دیوی اس کا اصلی موضوع بحث ہے اور اسی سے اسکے کمال قدرت کا پتہ چلتا ہے کالیداس ایک مجموعۂ خصوصیات شریفہ، قابل مثال عورت پیش کرنا چاہتا ہے۔ گوئٹی *Goethe* نے شکنتلا کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ کالیداس کی تمام ہیروئن پر صادق آتا ہے،،

یہ کالیداس اور اس کی شاعری کا حال تھا۔ لیکن قبل اسکے کہ میں عہد اسلامی کی ادبیات کی طرف آپکی توجہ منعطف کروں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً ادبیات کے عہد جدید کی جو کالیداس سے چند سال قبل شروع ہو کر اسلامی حملہ و فتح تک قائم تھا کچھ حالت ہدیہ ناظرین کروں۔

سنسکرت کے آخری دور مثنوی کی "سرنگ راستک" یا صدی" محبت" مصنفہ راجہ بھرتھری ایک یادگار ہے "بیلہن" کی چور پنسیکھ" بھی ایک نہایت دلچسپ تصنیف ہے مگر "گیتا گوبند" جو یورپ میں The song of songs کے نام سے مقبول و مشہور ہو چکی ہے آخری دور کی بہترین یادگار ہے "جئے دیو" اس کا مصنف ہے نظم ایک تمثیل ہے "کرشنا" روح ہے جسے "گوپیاں" نفسانی خواہشات اپنی اپنی طرف کھینچتی ہیں تا آنکہ رادھا۔ محبت الٰہی اُس گم گشتہ راہ کو صراط مستقیم پر چلاکر منزل مقصود تک پُہنچا دیتی ہے"

کالیداس کے بعد "بھوبھوتی" ایک مشہور شاعر ہے۔ اسکی "ملتی مادہو" بہت مقبول ہے "دندین" بھی ایک کامل مثل Dramatist ہے اس کی "مرچ چتیکا" یورپ میں بھی Tella Toy cart کے نام سے مشہور ہے وہ ایک ناول نویس بھی تھا۔

"لطائف اسوپ[1]" کے مقابل ادبیات ہنود میں بھی ایک کتاب موجود ہے "میتھوپادیش" یا کتاب نصائح زرین سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے "جاتکس" آریہ قوم کی قدیم ترین افسانی تصنیف ہے اس میں ولادت گوتم اور اُس کے حالات کے متعلق افسانے ہیں۔

حکومت گپتا کا زوال اور اسلام کا عروج شام سنسکرت ہے، چند ہی سال میں وہ ناپید و مستور ہو جاتی ہے۔

گیارھویں و بارھویں صدی میں مسلمانوں کے لشکروں نے ہند میں آنا شروع کر دیا۔ اور غارت گری و سفاکی۔ جنگ و جدال سے ملک کو فتح کر لیا اور بدھ کی جگہ قرآن پاک اور مندر کی جگہ مسجد نے لے لی۔ دفاتر کی زبان پر عربی و فارسی نے چھاپا مارا۔ مسلمانان ہند کی ادبیات کا شمار عربی و فارسی کے ساتھ ہونا چاہئیے مورخین ہند مورخین مسقط و ایران کے ساتھ بزرگی میں شریک و ہم نوا ہیں۔ اگرچہ فردوسی سلطان محمود کے دربار کا ایک ایرانی رزمیہ شاعر تھا تاہم ہندوستان کو اس پر ناز ہے اور دوسرے زیب النساء[2] ہے جس کی تعریف میں ایرانی د

[1] Asopaes fabels

[2] مضمون نگار کا تمام تر ماخذ انگریزی کتابیں ہیں، اس لئے اس نے زیب النساء کے متعلق عام غیر صحیح روایات پر اعتماد کر کے یہ رائے ظاہر کی ہے۔

ہندوستانی دونوں رطب اللسان ہیں۔ جس طرح سیفو یونان کے لئے مایۂ ناز تھی اسی طرح یہ ہند کے لئے باعث فخر ہے۔ اس کی غزلیں آجتک زبان زد خاص و عام ہیں اور اس کے دیوان مخفی میں ہندو مسلم دونوں کے قلبی جذبات کا کامل انکشاف و اظہار رہے۔ وہ نواں کوٹ لاہور[1] میں مدفون ہے۔ آہ وہ مقبرہ جو کسی وقت میں سنگ مرمر و جواہرات سے مزین گلہائے رنگارنگ سے محیط اور آرائشات گوناگون سے مزین و مرصع تھا آج بیکسی کے عالم میں ویران پڑا ہے (اور کوئی نہیں جو اس پر دو آنسو بھی بہائے) وہ زبانِ حال سے اپنی مالکہ کی پیشینگوئی کی تصدیق کر رہا ہے۔

برمزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اکبر و اورنگ زیب کے زمانہ میں ادبیات اسلام کا آفتاب نصف النہار پر تھا ہمیں اسی عہد میں "ابو الفضل" "اکبر نامہ" لکھتا ہوا نظر آتا ہے اور اسی دور میں ہم شہنشاہ اعظم کی بڑی لڑکی شاعرہ زیب النساء کو صوفیانہ اشعار کا راگ الاپتے سنتے ہیں۔

مسلم فاتحین ممالک ایران و تاتار سے نیا تمدن اور نئی زبان اپنے ساتھ لائے یہ تمدن و زبان عربی و ایرانی تھی ۵ - ۶ سو سال کے باہم اتحاد قیام و جذبات نے جو عہد مغلیہ۔ اور پٹھانوں کے زمانہ میں ہندو و مسلم میں رہا ایک نئی زبان اور ایک جدید انداز بیان پیدا کر دیا۔

اردو، یا لشکری زبان مختلف خیالات۔ جذبات۔ عناصر و السنہ کا مرکب ہے اردو مرکب ہے۔ عربی۔ فارسی۔ اور بھاشا کا اور گو بعض اوقات اس کی بہت بتذل حالت بھی رہی ہے تاہم وقتاً فوقتاً ہم نے اسے ترقی کے اعلےٰ ترین زینوں پر بھی دیکھا ہے۔ حکومت مغلیہ کے زوال کے ساتھ اس کا عروج ہو گیا مگر اس پر

---

[1] تاریخی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ زیب النساء کا مزار دہلی میں تھا۔ نہ کہ لاہور میں۔ گذشتہ سال اس کی قبر کا بھی پتہ نہ چلا تھا اور محکمۂ آثار کے ایک رکن مسٹر ظفر احسن صاحب اس کی تحقیقات کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ لیکن معلوم نہیں کہ ان کی تحقیقات کا کیا نتیجہ ہوا۔

بھی ایک صوبوی زبان سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں کرسکتی[1]- اور اس وقت بھی بہترین اُردو صرف دلی، لکھنؤ۔ اور انکے اطراف میں جو مغلیہ ترقی وتمدن کے مرکز رہے ہیں، بولی جاتی ہے۔

اُردو نے بھی بہت سے بہترین شاعر ونثار پیدا کئے ہیں۔ مثلاً سودا۔ میرتقی میر۔ حالی۔ ذوق۔ غالب اور ناول نویسوں میں نذیر احمد۔ محمد حسین آزاد۔ وغیرہ موجودہ شمالی ہند کے ملک الشعراء اقبال ومحروم ہیں۔

ہندوستان کی مروجہ زبان کی ادبیات زیادہ تر مذہبی ہیں تلسی داس فلک ہندی کا روشن ترین ستارہ ہے "تلسی داس کی پرورش جسے اسکے والدین نے چھوڑ دیا تھا ایک رشی نے کی ہندوستان کی وسیع آبادی میں ۹ کروڑ سے زاید افراد اسے اپنا رہنما سمجھتے ہیں۔ بالمیکی کی راماین کا ترجمہ ایک بہترین اختراع علمیہ ہے۔ اس میں اکثر حصے خود اسکے اضافہ کردہ ہیں۔ کبیر ایک مسلم نورباف گھر کا چراغ "کبیر پنتھی" فرقہ کا بانی ہے۔ اس نے ہندؤں کی بت پرستی اور مسلمان علمائے

---

[1] مسٹر کنھیا لال کیمبرج یونیورسٹی کے ایک ذی استعداد متعلم ہیں اُنہوں نے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے سامنے یہ مضمون پڑھا تھا، ادبیات ہند کے متعلق اُنکے معلومات بہت وسیع ہیں، لیکن عہد اسلامی کے مساعی علمیہ کے فقدان علم میں اُنکے نزدیک نثر میں ابو الفضل اور شعر میں زیب النسا مخفی" خصوصیت کے ساتھ قابل تذکرہ ہیں، اردو کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ وہ ایک صوبوی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے متعلق ہم خود کچھ کہنا نہیں چاہتے بلکہ صرف اس قدر عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک قدیم ریٹائرڈ آئی۔ سی۔ ایس مسٹر کولڈ سٹریم کے خیالات کو آپ کے سامنے پیش کردیں۔ مسٹر موصوف نے اس مضمون کے سننے کے بعد اس طرح اظہار خیال کیا:-

"شمالی ہند میں اُردو کے شاعر ونثار موجود ہیں، جو ایک ترقی پذیر زبان ہے مگر ہنوز پوری پختگی کو نہیں پہنچی ہے: وہ ایک طریقہ خاص پر ترقی کررہی ہے، یعنی انگریزی اور دوسری مروج زبانوں کے الفاظ سے اپنے سرمایہ کو بے تکلفانہ مالامال کررہی ہے، چنانچہ اگر آج ہم کسی اردو اخبار کو اُٹھا کر دیکھیں تو اُس میں پچاسوں انگریزی الفاظ ملینگے۔ اور اُردو کو انکے استعمال کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، اردو کا مستقبل بہت شاندار ہے، تعجب ہے کہ مقرر نے اُسے صوبہ کی زبان سے تعبیر کیا ہے حالانکہ اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے، حقیقت یہ ہے کہ صرف اُردو ہی کو ہندوستان کی مشترک زبان (لنگوفرانکا) بننے کی صلاحیت کا کیا ذکر ایک بڑی حد تک وہ بن بھی چکی ہے"۔

تعصب و تنگ خیالی دونوں پر سخت تنقید کی ہے۔ مذہب سکھ کے بانی گرو نانک کی تعلیم کبیر کے اصول کی ایک شاخ ہے، گرو نانک اور انکے نو جانشینوں کے مکاتب "ادی گرنتھ" میں جمع کئے گئے ہیں۔

"ادی گرنتھ" کے مضامین بہت متضاد ہیں۔ اسکے اشعار مختلف الالسنہ ہیں اور یہ اشتمال و ترکیب ہمیں ایک نئی وسیع زبان کی خبر دیتی ہے۔ جو آگے چل کر شاید ہندوستان کی تمام مروجہ زبانوں سے گوئے سبقت لیجائے۔ "پنجابی" ہے "ہیر و رانجھا" ایک رزمیہ نظم ہے جو سارے شمالی ہند میں مشہور ہے اور پنجابی اسکی اکثر روایات و حکایات سے کم و بیش واقف ہیں۔

مرہٹی ادبیات کا تکارام بہترین فرزند ہے وہ سنہ ۱۶۰۸ء میں پیدا ہوا ایک دوکاندار کا لڑکا تھا لیکن سیاحی کی ایسی جی میں آئی کہ خاندان وطن کو خیرباد کہا اور فقیر بن گیا۔ اس کی "ابھنگاس" سارے مہاراشٹر میں مشہور ہے "نامو ید" شاعر کا ہمیں گرنتھ کی نظموں اور اسکے دوسرے مشہور اشعار سے پتہ چلتا ہے۔

"یتومنوں" اور "بیسچی" اٹھارھویں صدی کے بہترین ٹامل مصنف ہیں۔

ویجانگر کے راجہ "الاسنی رایہ" مصنف "اموک تمل باد" اور الاسنی پدواثہ فلک ادبیات تلنگو کے درخشاں ستارے ہیں۔ برہمی اسامی اور کناری زبان کے الگ الگ ملک الشعراء ہیں اور انہوں نے مروجہ السنہ کی ترقی میں اپنا پارٹ بحسن خوبی ادا کیا ہے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی کے درمیان ۱۵۰ برس تک ادبیات بنگال دیوتا شیو اور کالی دیوی (یا درگا دیوی) کی طرف منسوب تھیں۔ قدیم تصانیف میں مکندرام چکرورتی کی "سری منت سوداگر" بہترین ہے۔

آخری صدی کی ابتدا سے ادبیات ہند کے ایک عہد جدید کی صبح نمودار ہوتی ہے۔ اور اس دور جدید کی شعاعوں کی حرارت سب سے پہلے بنگال نے محسوس کی۔ مذہبی مصلح رام موہن رائے نے نثر کا ایک عجیب دل فریب طرز ایجاد کیا اور اس کے دوش بدوش یادھوسودھن داس نے شاعری میں ایک لاجواب و بے مثال کمال حاصل کیا بنکم چندر کے ناول "درگیش نندنی" نے عالم ادبیات میں ایک حشر برپا کر دیا اس کے علاوہ اس کی اور بہت سی ملکی نظمیں بھی مقبول عام

ہیں، دین سندھو متر نے اپنی ہجویات (نل درپن) سے جن کی بنا پر اسے سزا بھی ہوگئی تھی ایک سنسنی سی پیدا کردی تھی اس کتاب کا تقریباً ہندوستان کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔
(۳) رابندرو ناتھ ٹگور موجودہ بنگالی ادبیات کے بلند ترین مقام پر نظر آتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ صرف انکی ایک ذات تمام ادبیاتِ ہند پر محیط ہے وہ کلکتہ کے ایک شریف و دولتمند گھر میں پیدا ہوئے اور نو۔ دس برس کے سن ہی سے شاعری شروع کردی آپنے لندن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی گیتا نجلی آپ کی بہترین تصنیف ہے یہ فلسفیانہ قطعات کا مجموعہ ہے اور صرف اسی ایک کتاب کی وجہ سے آپ تمام دنیا کے کسی فاضل اکمل سے کم عزت۔ مرتبہ وشہرت نہیں رکھتے ٹیگور ایک ممثل کی حیثیت سے بھی بہت مشہور ہیں۔ اور آپکی نثر کنار ہگلی سے برِ اعظم امریکہ تک مقبول ہے اور عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔

اِس طرح ہم اپنے عہد موجودہ میں قدم رکھتے ہیں، نئی صدی کا اغاز تاریخ السنہ وتاریخ ادبیاتِ ہند کے ایک دور جدید اور عہد نو کی خبر دیتا ہے پنجاب میں ہمیں اقبال نظر آتا ہے جو ہمارے فارسی وعربی کے بلند ولطیف خیالات کو جامہ نو پہنا رہا ہے گجرات کی شاعری کی کلی کھلتی نظر آتی ہے مارہشٹرہ کی نثر بلند ہوتی جاتی ہے اور ٹگور بنگال کی ادبیات میں وہ روح پھونک رہا ہے جو اسے دنیا کے بہترین ادبیات کے سامنے بھی عرصہ تک زندہ و قائم رکھے گی۔

لیکن یہ عہد جدید یہیں پر آکر ختم نہیں ہوجاتا۔ ایک نئی ادبیات اور ایک جدید طرز اظہار ہندوستانی دماغ میں جگہ پکڑتا جاتا ہے۔ ہندوستانیوں کو اپنی شیریں مادری زبانوں کے علاوہ ایک اور زبان ایسی مل گئی ہے جس میں وہ اپنے خیالات جذبات ومحسوسات کو اچھی طرح ادا کرنے کے عادی ہوتے جاتے ہیں اور وہ انگریزی زبان ہے اسکا پہلا شاعر گذشتہ صدی کے آخر میں بنگال سے پیدا ہوا اس کے بعد بلند خیال شعراء باکمال ممثلین کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے ان میں انڈین سول سروس کے مایہ ناز رکن رمیش چندر دت اور دو شاعرہ "تورو دات" اور سروجنی نائیڈو کامل ترین ہستیاں ہیں، ان ناموں سے اس ملک کے تمام لوگ واقف ہیں ابتک انگریزی کا کوئی بڑا انشار پیدا نہیں ہوا ہے مگر یہ ایک فطرتی بات ہے کیونکہ دنیا

کے ادبیات کی تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ نثر سے پہلے نظم نے ترقی کی ہے۔

مسٹر رامش کا ترجمہ نظمہائے رزمیہ انکے کمال کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ انگریزی پر کس قدر عبور رکھتے ہیں۔ تورودت ایک بڑی شاعرہ ہوتی لیکن اجل نے اسے عین عالم شباب میں جبکہ وہ صرف بیس سال کی تھی ہم سے چھین لیا۔ لیکن ان کی چند نظمیں اور چند قطعات ادبیات ہند میں ہمیشہ زندہ رہیں گے بقول ایڈمنڈ گوسی (Edmund Gosse) اس نے ادبیات انگریزی میں ایک صفحہ۔ ایک بہترین صفحہ کا اضافہ کیا ہے۔"

مسز سروجنی نائیڈو اس جدید ادبیات کی روح رواں ہیں۔ انکی شاندار۔ دلچسپ اور پرلطف نظمیں یورپ میں بھی مشہور ہیں، ہندوستان میں وہ اس تحریک کی لیڈر اور یہاں کے باشندوں کی منظور نظر تصویر ہے۔ "آشیانۂ زریں" (The golden threshold) "مرغ وقت" (The bird of time) "بازوئے شکستہ" (The broken wings) ان کے رشحات قلم کے نتائج ہیں۔

اس طرز جدید کی شاعری کا سب سے مشہور شاعر مسز نائیڈو کا ۱۹ سالہ بھائی ہرندرناتھ چٹوپادھیا ہے۔ اس کی "دعوت طفلی" (Feast of youth) ہمیں آئندہ کے متعلق بہت کچھ اُمید دلاتی ہے میں ہندوستان کے ایسے بہت شاعروں کو جانتا ہوں جو انگریزی میں اظہار خیالات کرتے ہیں لیکن اولاً تو وقت کی کمی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں ان کا تذکرہ آپکے سامنے کروں۔ دوسرے میں خود اس وقت تک جبکہ وہ خود اپنی تصنیفات آپکے سامنے نہ پیش کریں ان کا تعارف قبل از وقت سمجھتا ہوں۔

اشکال ماضی کا نتیجہ حال ہے اور حال سے مستقبل مستنبط ہوتا ہے پس آئیے تاریک عظیم الشان مستقبل کو حال کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں۔

اس وقت ہندوستانی دماغ مختلف کشش کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ریل کی وسعت تجارت وصنعت کی روزافزوں ترقی ملک کو مغرب و مشرق سے قریب تر کر رہی ہے۔ لوگ نہایت سرعت سے مغربی خیالات مغربی جذبات۔ مغربی طریقے اور مغربی عادات اختیار کرتے جاتے ہیں مصنفین و اہل الرائے کی ایک جماعت اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی۔ لیکن

ہمیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ نہ مشرق مغرب ہو سکتا ہے نہ مغرب مشرق مگر دونوں مل ضرور سکتے ہیں مغربی خیالات کی مادیت اور مشرقی نقطۂ نظر کی تنگی دونوں ایک جگہ نہایت دلچسپ طریقہ سے ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اور مجھے اس کی اُمید قوی ہے۔

آجکل ہندوستان میں بیداری کی بڑی لہر دوڑ رہی ہے۔ قومیت وخودداری کی ہوا سارے مُلک میں چل رہی ہے۔ علوم ماضیہ کی تجدید ہو رہی ہے اور تاریخی وعلم الاثاری تحقیقات ہماری گُم شدہ عظمت وشوکت کی مٹتی ہوئی مدفون نشانیوں کو ہمارے سامنے لارہی ہیں۔ ہر دیہاتی لڑکے اور لڑکی کی یہ خواہش ہے کہ وہ انگریزی پڑھے۔ تو کیا پھر ان تمام قوتوں کو جو ہندوستان کے دماغ کو اپنی طرف متوجہ کئے ہیں دیکھتے ہوئے یہ کہنا کہ ہندوستان میں جدید طرز ادائے مطالب ایک جدید زبان ایک جدید دور ادب کا آغاز ہوگا۔ کوئی غیر معمولی پیشینگوئی ہے؟ وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ ہندوستان میں سینکڑوں امرسن (Amerson) اروِنگ (Irving) اور لانگ فیلو (Long fellow) پیدا ہونگے اور ہندوستان کے خیالات کی بلندی اس کے جذبات کی نفاست ونزاکت بہت جلد مغربی جامہ میں اپنے کو ملبوس پائیگی، دتورودت، سروجنی نائیڈو اور "ہرندرناتھ چٹوپادھیا" کے کلام کی جن حضرات نے زحمت مطالعہ گوارا کی ہوگی وہ اس دورِ جدید کے امکان میں ضرور میرے ہمنوا ہونگے،

اگرچہ میں نے مستقبل کے بارے میں ایک عالمگیر انگریزی زبان کا امکان ظاہر کیا ہے اور موجودہ علامات بھی اس کی مؤید ہیں۔ لیکن اس سے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ہندوستان کے تمام بہترین دماغ ایک غیر ملکی زبان کے اسیر ہونگے اور خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ ہندوستان کی ادبیات کی تین شاخیں ہونگی:۔

(۱)۔ انگریزی ادبیات۔

(۲)۔ صوبجاتی زبانوں کی ادبیات اور

(۳)۔ سنسکرت ادبیات اور آئندہ نسلیں ادبیات ہند کو انہیں تین ناموں سے یاد کرینگی۔

ہندوستان وسعت ملکی اور آبادی کے لحاظ سے یورپ کے برابر ہے اور وہاں بھی ایک لنگوا فرنکا (عام زبان)۔ ہو سکتی ہے مگر اسکے ساتھ یہ خیال رکھنا کہ کشمیری۔ پنجابی۔ مرہٹی۔ راجپو بنگالی۔ مدراسی۔ سب کے سب ایک ہی زبان بولنے اور لکھنے لگیں اور تمام ہندوستان

ایک ہی ادبیات کا مالک ہو محال ہے جس طرح جرمن۔ فرانسیسی۔ روسی۔ اور انگریز اپنے خیالات اپنے جذبات اور محسوسات کو ایک انداز ایک طرز اور ایک طور سے بیان نہیں کر سکتے۔ بالکل اسی طرح سارا ہندوستان ایک زبان واحد میں مساویاً بول اور لکھ نہیں سکتا۔ اس لئے ہمیں اس بات کے دیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ ادبیات ہند ان تین اقسام میں کامل ہوتی ہیں۔

پس ہم نشاط و رنج، خوف و مسرت۔ اور امید و بیم کی حالت میں مستقبل کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور اب جبکہ اس ظلمت باطلہ کا پردہ آہستہ آہستہ اٹھ رہا ہے جو ۱۹۱۴ء سے پڑا تھا تو ہمیں اسکے پیچھے ایک صبح امید اور ایک چمنستان آرزو نظر آرہا ہے اور اب جبکہ دنیا کا طوفانِ عظیم ساکن ہو گیا ہے ہمیں ساحل عالم خیال۔ عالم امید۔ اور عالم مثال کی طرف اپنی کشتی کھینا چاہیئے۔

(ماخوذ از ایشیاٹک ریویو)

سید نجیب اشرف ندوی رفیق دار المصنفین
شبلی منزل، اعظم گڈھ،

ہندوستان کی متحدہ مجلس کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے مدراس کی "ہندی ساہتیہ سمیلن" کو مدراس میں ہندی زبان کے پرچار کے لئے "تلک سوراج فنڈ" سے پانچہزار روپیہ دیا ہے۔ ہمیں ہندی اور اسکی ادبیات کی اشاعت سے کوئی رنج نہیں لیکن مدراس میں جہاں ملک کی مشترکہ زبان کو رائج کرنا مقصود ہے کانگریس کا ہندی کی اشاعت کیلئے روپیہ دینا دوسرے معنی میں یہ فیصلہ کر دینا ہے کہ ہندوستان کی ملکی زبان اُردو نہیں بلکہ ہندی ہے۔ ہم اس فیصلہ کو اس حد تک تو ماننے کو تیار ہیں کہ عربی و فارسی الفاظ کم کر کے سنسکرت آمیز زبان ہندوستان کی ملکی زبان قرار دیجائے۔ ہم اس پر بھی راضی ہو جائینگے کہ اس سنسکرت آمیز زبان کا نام اُردو کی بجائے ہندوستانی بلکہ ہندی ہی رکھ لیا جائے۔ لیکن چونکہ سنسکرت کیرکٹر سے سات کروڑ مسلمان تمام عیسائی۔ کُل پارسی اور کروڑوں ہندو بھی ناآشنا ہیں اس لئے ہم اپنی ملکی زبان کو اُردو کی بجائے سنسکرت کیرکٹر میں منتقل کرنے کے کسی فیصلہ کو بھی نہیں تسلیم کر سکتے اگر ورکنگ کمیٹی کی مدراس میں ہندی کے پرچار سے یہ غرض ہے کہ سنسکرت رسم الخط میں ہندی کی اشاعت ہو (یعنے ہندوستان کی ملکی زبان مصطلحہ ہندی ہے) تو یہ کہنے میں ہمیں باک نہیں کہ کانگریس کا موجودہ طرزِ عمل سوراج ملنے کے بعد کے رویہ پر روشنی ڈال رہا ہے۔

تاجور

کیا آپ "مہذب" ہیں؟

ممکن ہے کہ ہر شخص "فرشتہ خصلت" کہلائے جانیکا متمنی نہ ہو مگر پھر بھی ہم میں سے ہر ایک اس بات کا ضرور خواہشمند ہے کہ اُسے "دیانتدار" "سلیم الطبع" اور "نیک طینت" کہا جائے۔ اور اسی طرح ہر عفت مآب خاتون عمدہ سلوک اور عزت کی تمنائی ہے۔

اس امر کے اظہار کے لئے ایک بہترین اصطلاح "مہذب" ہے کیونکہ یہ اُن تمام الفاظ پر محیط ہے جو ہر شخص اپنی نسبت سننے کا آرزومند ہے۔ چونکہ یہ ایک عام لفظ ہے اس لئے "آبائی شرافت" سے اسکو کوئی تعلق نہیں۔ یہ ذاتی چلن کی طرف اشارہ ہے اور اسے صرف آپکی ذات ہی سے تعلق ہے آپکے آباؤاجداد کے ساتھ نہیں۔ یہ آپکی ذاتی شرافت پر دال ہے خواہ وہ آبائی ہو یا نہ ہو۔

میں اس بات پر بحث نہیں کرونگا کہ ہر انسان کے چال چلن کا کہاں تک اُسکی خاندانی شرافت و وجاہت اور تربیت یا مجہولیت نسب سے تعلق ہے کیونکہ میرے نزدیک کسی آدمی کے چلن کا صحیح معیار قایم کرنے کے لئے یہ ضروری و لابدی امر نہیں کہ اُسکا موروثی شرف مدنظر رکھا جائے میں بیسیوں ایسے نوجوانوں کو جانتا ہوں جن پر آکر انکی "آبائی شرافت" ختم ہوگئی اور بہت سے ایسے ہونہاروں کو بھی جانتا ہوں جن سے اُن کا خاندانی عروج شروع ہُوا۔ پس میں آپ کی ذاتی صفات کو مدِنظر رکھونگا نہ اس بات کو کہ آپ نے کن ذرائع سے اُنکو حاصل کیا۔

میں اس بات کو بھی نظرانداز کرنا چاہتا ہوں کہ آپ دنیا میں کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ایک محنتی مزدور بھی "راستباز" "سلیم الفطرت" اور "صاف دل" ہوسکتا ہے برعکس اس کے ایک طلائی شاندار کلاہ پر لپٹا ہوا طرہ دار ریشمی صافہ اور زرق برق پوشاک پہننے والا نواب اور راجہ بھی "دروغگو" "کجرو" اور "بد باطن" ہوسکتا ہے۔ اس لئے میرے مطمح نظر سے "مہذب" ہونا اس بات سے فی الحقیقت کوئی تعلق نہیں رکھتا کہ آپ کی حیثیتِ عُرفی کیا ہے یا آپ کی "پوزیشن" سوسائٹی۔ مجلسِ وضع قوانین۔ مجلسِ قومی۔ مجلسِ خلافت یا مجلسِ کانگرس میں کیسی ہے

یہ صرف اس بات سے نسبت رکھتا ہے کہ آپ کس قسم کے "بنی نوع انسان" ہیں +

اِس مضمون سے میرا مطلب آپ کو یہ معلوم کرنے میں مدد دینا ہے کہ آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔ میں آپ کو ایک ایسا "معیار" بتاتا ہوں جس سے اُمید ہے کہ آپ خود کو بخوبی جانچ لینگے۔ ممکن ہے کہ آپ "اسفل ترین" یا اسکے برعکس ثابت ہوں۔ میں آپکو کسی بات کا مجرم نہیں گردان رہا۔ جب آپ آئینہ میں دیکھ رہے ہوں اور اپنے صافہ یا قمیص کے کالر پر آپکو کوئی سیاہ داغ دکھائی دے تو آپ آئینہ کو مطعون نہیں کرینگے اور بس جو کچھ میں یہاں کرنا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ آپکے سامنے ایک ایسا آئینہ تھامے رکھوں جس میں آپ اپنا "کیرکٹر" دیکھ لیں +

یقیناً آپ یہ دیکھ کر حیران ہونگے کہ بعض باتوں میں آپ "کامل واکمل" ہیں اور بعض میں آپ کو ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے اور اگر ہم دیانتداری سے غور کرینگے تو بلاشبہ اُن باتوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہونگے جن میں ہم ناقص ہیں اور جن میں کامل ہونے کے لئے ہمیں تمام عمر سعیٔ مسلسل کرنا چاہیئے۔ اپنے آپ سے استفسار کیجئے۔ لیکن سوال کرتے وقت کوئی عذرِ لنگ پیش نہ کریں۔ اپنے آپ پر متاسف ہونا بھی جادۂ سلیم سے دُور پھینک دیگا۔ سچائی کا اظہار کیجئے لیکن شرم کو بالائے طاق رکھ کر۔ اگر آپ تسلی بخش اور درست طور پر اُن سوالات کے صحیح جوابات بتائیں تو اُسکے آگے ۱۰ نمبر لگا دیجئے۔ اور اگر آپ اُس میں بالکل صفر ہوں تو ۰ (صفر) لگا دیں اور اگر "کچھ کچھ" ہوں تو ایمانداری سے جواب کی حیثیت دیکھ کر ۳۔ ۵ اور ۶ نمبر دے ڈالیئے۔ یہ مضمون صرف "اپنے آپ کو" انسانیت کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے ہے "دوسروں" کے لئے نہیں۔ غیروں کی جانچ پڑتال کرنا حماقت ہے۔ اور امتحان کیجئے اپنا ایک منصف کی حیثیت سے نہ کہ ایک وکیل کی حیثیت سے۔ اِن باتوں پر غور کرتے وقت "قانونی نقطۂ نظر سے دیکھ کر ہر ایک بات کو اپنے حق میں وارد کرنے کی سعی بے سود آپکو صحیح نصب العین سے ہٹا دیگی اور نہ ہر بات کو اپنے مخالف خیال کرتے ہوئے اپنے آپ کو بدبختی اور سیاہ کاری کا مجسمہ قرار دو۔ ایمان دار اور دیانتدار رہیئے۔ آپ کسی بات کو "ثابت" نہیں کر رہے بلکہ آپ کسی بات کو "تلاش" کر رہے ہیں +

آیئے ہم اُن صفات کو لیں جن پر ہر شخص خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو اپنا اطمینان ظاہر کریگا کہ یہ ہر انسان کے لئے لازمی ہیں۔ اور اس امر کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ اسوقت

ہم "پرہیز گار"، "مجسمۂ زہد و تقویٰ"، اور "فلک خو" بننے کے لئے نہیں بحث کر رہے بلکہ ہمارا مقصد صرف اس بات کے بیان کرنیکا ہے کہ ہر شخص کیا ہونا چاہتا ہے؟ خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ پنڈت ہو یا بھاٹ۔ تحصیلدار ہو یا جاٹ۔ خان بہادر ہو یا تارکِ موالات شہری ہو یا دیہاتی مندرجہ ذیل سوالات اپنے آپ سے کیجئے اور دیکھئے کہ آپ میں کیا کیا معائب و محاسن ہیں:—

کیا آپ
(۱)۔ صاف دل
(۲)۔ ایماندار
(۳)۔ خوش اخلاق
(۴)۔ مہربان
(۵)۔ دیانتدار
(۶)۔ خود اعتبار
(۷)۔ بہادر
(۸)۔ ہنرمند
(۹)۔ صادق
(۱۰)۔ سادگی پسند
(۱۱)۔ صفائی پسند
(۱۲) خود پسند
(۱۳) خوش مزاج
(۱۴) خود پرست
(۱۵) توہم پرست
(۱۶) نمائش پسند
(۱۷) بلند ہمت
(۱۸) حاسد
(۱۹) ضرورت سے زیادہ ہمدرد
(۲۰) دور اندیش
(۲۱) ذکی الحس
(۲۲) وفادار
ہیں؟

اگر آپ نے ان سوالات کے جواب دیکر نمبر لگا دئے ہیں تو اب ان میں سے ہر ایک کی مندرجہ ذیل تشریح بنگاہ تعمق دیکھئے اور اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر کے حکم سُنا دیجئے!!

(۱) کیا آپ صاف دل ہیں:—کیا آپ کی رائے اس بات سے متاثر ہوتی ہے کہ زید عدم تعاونی ہے اور آپ موالاتی۔ وہ ہندو ہے اور آپ مسلمان۔ وہ شیعہ ہے اور آپ سُنی وہ آریہ ہے اور آپ سناتن دہرمی۔ وہ بنگالی ہے اور آپ پنجابی۔ وہ انگریز ہے اور آپ ہندوستانی؟ کیا کبھی تفریق ملت۔ فرقہ بندی۔ مُلکی و نسلی امتیاز۔ مذہبی تعصب اور اسی قسم کی سینکڑوں باتیں آپ کے موازنہ اشخاص میں مداخلت کر سکتی ہیں؟ کیا آپکا اِنصاف "پسندیدگی"

اور "ناپسندیدگی" کی رو میں بہہ سکتا ہے۔ کیونکہ آپ ایک شخص سے محبت رکھتے ہیں اور اُس کی ہر جائز و ناجائز حرکت کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا شخص ویسی ہی ناجائز حرکت کرے جیسا کہ آپ کا محبوب ترین دوست تو کیا آپ اُسکو ذلیل یا کمینہ کہہ کر پکارینگے؟ کیا آپ اُس شخص کی ارفع صفات کو نظرانداز کر دینگے جس نے کسی بات پر آپ کو ملامت کی ہو؟ یا آپنے کبھی سُنا ہو کہ بکر آپ کے مضامین پر نکتہ چینیاں کرتا ہے یا آپ کے کسی فعل کو بنظر استحسان نہیں دیکھتا۔ یا آپ کی نسبت نا ملائم الفاظ استعمال کرتا ہے تو یہ آپ کے دل پر کس طرح اثر کریگا؟ اور اُس کا جوہر قابلیت پرکھنے کے لئے کیا آپ کے دل میں کوئی انسانیت کی موج غیر متلاطم رہ بھی سکیگی جو آپ کے ہوش و حواس کی کشتی کو ناانصافی کے بھنور سے بچا لے؟

لیکن اس سے میری یہ مراد نہیں کہ مہذب شخص کسی قسم کے جذبات و محسوسات نہیں رکھتا۔ یا یہ کہ وہ کسی آدمی کو پسند یا ناپسند کرنا نہیں جانتا بلکہ وہ اُس وقت بھی پر ہمت بشاش اور مستقل مزاج رہتا ہے اور اپنی رائے ایسی ہی بے لوث اور تعصب سے بیگانہ وش رکھتا ہے جبکہ اُس پر کوئی طعن و تشنیع کی گئی ہو یا جب اُس کے اور خالد کے درمیان مذہبی منافرت اور مغائرت کی وسیع خلیج حائل ہو۔ وہ اپنے دل کو کدورت سے ہر وقت بچا سکتا ہے۔

(۲)۔ کیا آپ ایماندار ہیں؟ کیا آپ ہر ایک کام شب دیجور کی "تاریکی" میں بھی ویسی ہی احتیاط سے کرتے ہیں جس طرح آفتاب عالمتاب کی "روشنی میں"؟ اگر آپ کے سر کسی آدمی کا قرض چڑھا ہوا ہو اور وہ اس دُنیائے فانی سے رحلت کر جائے تو کیا آپ وہ رقم اُسکے جائز وارثوں کو ادا کر دینگے جب آپ کو یہ بھی معلوم ہو کہ آپکے مقروض ہونیکی اُن میں سے کسی ایک کو بھی خبر نہیں؟ کیا آپ ہمیشہ اپنے الفاظ پر قائم رہتے ہیں جب کوئی بات آپ کے برعکس ثابت ہو جائے؟ کیا آپ دوسرے لوگوں کے خطوط پڑھ لیا کرتے ہیں۔ جب کوئی دوسرا آپ کی اس حرکت کو نہ دیکھ رہا ہو؟ کیا آپ کسی کوچہ و بازار سے گذرتے وقت کسی مکان کے اندر دیکھتے ہیں جس کا دروازہ کھلا ہو؟ کیا آپ دوسروں کے پرائیویٹ اور خانگی معاملات کے متعلق گفتگو سُنتے ہیں جب آپکو یہ یقین ہو کہ کوئی شخص آپکو نہیں دیکھ رہا؟ کیا آپ کسی ایسی افواہ کو سرگرمی سے پھیلاتے ہیں جب آپکو یہ بھی معلوم ہو کہ وہ خبر بے بنیاد ہے۔ اور

اس سے کسی دوسرے شخص کی حیثیت عرفی یا کسی اور چیز کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچیگا۔ اور جس سے آپکو کوئی تعلق نہیں ؟

اب اس آئینہ میں غور سے دیکھئے کہ آیا آپ مطمئن ہیں؟ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ایسے فقرات استعمال نہ کریں "مجھے معلوم ہے کہ میں کامل نہیں" یا یقیناً میں ایسی بہت سی باتیں کرتا ہوں جو مجھے سزاوار نہیں" بلکہ یہ سوال کیجئے "کیا میں مخبر ہوں"؟ "میرا بدترین دشمن مجھے کیا سمجھیگا؟" دنیا میں صرف ایک واحد شخصیت ہے جسے تمام اقسام کی نکتہ چینیاں نا ملائم۔ کرخت و ترش الفاظ اور بیرحم انصاف خوشگوار معلوم ہوتا ہے ـــــ آپکو ـــــ آپکی طرف سے !!

(۳)۔ کیا آپ خوش اخلاق ہیں:۔ کیا آپ اوصافِ حمیدہ رکھتے ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ کسی محفل یا مجلس میں کس طرح داخل ہوکر کہاں بیٹھنا چاہیئے؟ کیا آپ نرم زبان ہیں اور ہر ایک قسم کی محافل و مجالس آپ کے لئے باعثِ سکونِ قلب و تسکین دل ہو سکتی ہیں لیکن یہ باتیں تو ایک وحشی انسان کو بھی سکھلائی جا سکتی ہیں میری مراد اس سے کچھ اور ہے۔

کیا آپ کو کبھی کسی غریب ہمسایہ کی آسایش کا بھی خیال ہُوا ہے جو دن بھر کی سخت ایماندارانہ محنت کے بعد اپنے بال بچوں کو آرام نہیں پہنچا سکتا؟ کیا آپ اپنی کرسی سے اُٹھتے ہیں جب ایک معمر یا مذہبی بزرگ کمرہ میں داخل ہُوا ہو؟ کیا ریل گاڑی میں آپ نے اپنی جگہ ہمیں سفید ریش بزرگ کے لئے پیش کی ہے جو عصائے پیری پر ہاتھ رکھے جگہ کی تلاش میں حسرت بھری نظر سے ہر چہار طرف دیکھ رہا ہو؟ کیا آپ نے کبھی اپنے ساتھی مسافر سے تمباکو نوشی کے لئے اجازت حاصل کی ہے جب ریلوے کا قانون بھی یہی ہے؟ کیا آپ لوگوں کی گفتگو میں اُس وقت مداخلت کرتے ہیں جب آپ کسی بات کا اظہار لازمی سمجھتے ہوں یا اُس لمحہ کا انتظار کرتے ہیں جبکہ گفتگو میں کوئی وقفہ پیدا ہو جائے؟ کیا آپ جذبات سے متاثر ہو کر بلند آواز سے بولنے لگتے ہیں؟ کیا آپ ریلوے تھیئٹر یا دنگل کے ٹکٹ گھر پر ایک قطار میں کھڑے ہوکر ٹکٹ خریدنا پسند کرتے ہیں۔ یا قوتِ بازو سے لوگوں کو دھکیل کر آگے نکل جانے کے خواہشمند ہیں؟ کیا آپ نے کبھی

اس بات کا فخر سے اظہار کیا ہے کہ کسی مشاعرہ۔ کسی تماشہ۔ کسی لیکچر یا مجلسِ وعظ میں آپ سب سے پیچھے آئے اور سب سے عمدہ نشست حاصل کرلی؟ کیا آپ "عملی مذاق" کی حد تک پہنچ جایا کرتے ہیں؟ کیا آپ اس وقت مسرور ہوتے ہیں جب دوسرا خفت زدہ ہو یا جب کوئی راہ چلتے بائیسکل سے گر پڑے یا کسی پھسلنی چیز سے پھسل پڑے؟ کیا آپ اُس وقت قہقہہ لگاتے ہیں جب کوئی فاش غلطی کر رہا ہو؟

(۴)۔ کیا آپ مہربان ہیں:۔ کیا آپ ملازمین سے صرف اس لئے بُرا سلوک کرتے ہیں کہ وہ آپ کے ملازم ہیں؟ کیا آپ بچوں کی توتلی اور بے رُخی گفتگو اُسی مسرت اور اُسی توجہ سے سنتے ہیں جس طرح شادی کے دوسرے دن اپنی خوبصورت بیوی کی سُنی تھی۔ یا اپنی کرخت آواز اور ڈراؤنی صورت سے آنکھیں نکال کر اُنکے حواس گم کردیا کرتے ہیں؟ کیا آپ اپنے ماتحتوں سے ایسے ہی سنجیدہ الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جس طرح اپنے کسی مالدار دوست یا کسی گاہک سے؟ کیا آپ اُن لوگوں کے سامنے انگریزی میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں جو اس زبان سے بے بہرہ ہوں؟ کیا آپ کوئی ایسا فعل کرتے ہیں جس سے دوسروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ عمر و لیاقت۔ علمیت اور دُنیوی تجربات میں بہت خام ہے؟ کیا آپ ہر ایک غریب و امیر معمر مرد یا عورت کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں خواہ وہ آپ کے متعلقین میں سے ہو یا نہ ہو؟ کیا آپ ہمیشہ اُن آدمیوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں جو کسی بات میں آپ سے کمزور اور کم حیثیت ہوں؟

(۵) کیا آپ دیانتدار ہیں؟ کیا آپ اپنی کسی تقریر یا کارگذاری کا ذکر کرتے وقت رنگ آمیزی سے بھی کام لیتے ہیں تاکہ آپکی نسبت دوسروں کا حسنِ ظن بڑھے یا اُس سے بڑھ کر داد حاصل کرنا چاہتے ہیں جو کچھ فی الواقعہ آپ نے کہا یا کیا تھا؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کو نوعمر۔ پُرمذاق۔ ہوشیار۔ اعلیٰ تعلیمیافتہ۔ جہاندیدہ۔ مشہور و معروف یا عالیجاہ مصنف یا دولتمند کہہ کر پکاریں۔ حالانکہ آپ نہیں ہیں؟ کیا آپ دَورانِ تکلم میں "مجھے معلوم نہیں" کہتے ہوئے شرماتے ہیں یا زمانہ سازی و بہانہ بازی سے دوسروں پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کو سب کچھ معلوم ہے اور خصوصاً اُس حالت میں جبکہ فی الواقعہ اُس امر کی نسبت آپ کو کوئی واقفیت

نہیں ؟ اگر ریلوے ٹکٹ کلکٹر آپکا ٹکٹ دیکھنا بھول جائے تو کیا آپ اُسے بتا دینگے۔ کہ آپ کے پاس ٹکٹ ہے یا نہیں ؟ کیا آپ نے کبھی ریلوے[۱] تغلب پر اظہار تاسف کیا ہے ؟ کیا آپ کسی ہوٹل یا اپنے میزبان کے گھر سے رخصت ہوتے وقت ایسی چیزیں اُٹھا لے جاتے ہیں جو آپ کی ملکیت نہ ہوں ؟ اگر ڈاک کا ہرکارا کسی غیر کا پارسل غلطی سے آپکے ہاں دے جائے تو کیا آپ واپس کر دینگے جب آپکو کھولنے پر یہ معلوم ہو کہ اُس میں ایسی قیمتی چیزیں ہیں جو آپکو درکار تھیں ؟ اگر کوئی دوکاندار یا ٹکٹ گھر کی کھڑکی والا کلرک آپ کو آٹھ آنے کے پیسے اصل رقم سے جو اُسے آپ کو واپس کرنی تھی زائد دے ڈالے تو کیا آپ خاموش ہو کر اُسے رکھ لیتے ہیں ؟ اگر میونسپل کمیٹی یا محکمہ برق کے کسی بل میں کوئی رقم آپ سے کم وصول کی گئی ہو تو کیا آپ افسرانِ مجاز کی توجہ اُس طرف منعطف کرائینگے ؟ اگر کسی کلرک کی غلطی سے رسالہ ہمایوں کے خریداروں کی فہرست میں دو مختلف جگہ آپ کا نام لکھا گیا ہو اور ہر ماہ بجائے ایک کے دو پرچے آپکو موصول ہو جایا کریں تو کیا آپ فوراً منیجر کو اطلاع دیں گے یا اپنے کسی دوست کے حوالہ کر کے دفتر کی غلطی پر تمسخر اڑائینگے ؟ اگر آپ کو شہر کی کسی گذرگاہ پر ایک پاکٹ بک مع یکصد روپیہ کے نوٹ کے مل جائے۔ تو کیا آپ اُسکے مالک کا پتہ نکالنے کی کوشش کرینگے ؟ مختصراً کیا آپ دیانتدار ہیں۔ اسلئے کہ یہ باتیں اصول اور مذہب کے منافی ہیں یا اس بات سے خائف ہیں کہ مبادا آپ کی اِن حرکات سے کوئی واقف نہ ہو جائے ؟

(۶)۔ کیا آپ خود اعتبار ہیں :۔

کیا آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں یا ایم۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد بھی والدین کے دستِ نگر ہیں ؟ کیا آپ اوروں سے تحائف وصول کیا کرتے ہیں اور اُنکی

[۱] اس سے میری مراد یہ ہے کہ اگر آپکے پاس ٹکٹ کی حیثیت سے بوجھ زیادہ ہے تو کیا آپ ریلوے افسران کی نظر بچا کر اسٹیشن سے باہر نکال لے جائینگے ؟ اگر درمیانہ درجہ میں رات کے وقت زیادہ ہجوم ہے تو کیا آپ سیکنڈ کلاس کے خالی کمرہ میں جا کر سو رہینگے ؟ یا آپکے ہمراہ بارہ سال سے زاید عمر کا بچہ ہے تو کیا آپ اُس کا پورا ٹکٹ خریدینگے یا افسرانِ ریلوے کے استفسار پر اُس کی عمر دس سال سے کم بتائینگے وغیرہ وغیرہ ۔

کسی طور "واپسی" نہیں کرتے ؟ کیا آپ اپنے دوستوں۔ رشتہ داروں یا عام ملاقاتیوں سے قرض یا خطوطِ تعارف حاصل کر لیتے ہیں یا اپنی ضروریات کے وقت اُنکے دروازے نظر انداز کر دیتے ہیں ؟ کیا اپنے فایدہ کے لئے آپ دوسروں کا وقت ضایع کرتے ہیں جب وہ آپکے زیر بار احسان نہیں ؟ کیا آپ اپنے دوستوں کا "استعمال" کرتے ہیں ؟ کیا آپ اپنی "حقیر قوت" سے کام لکالا کرتے ہیں ؟ یعنی اگر آپ صنف نازک سے ہیں تو کیا آپ مُنہ بسورتی ہیں۔ چلاتی ہیں یا سخت بیماری اور کسل کا بہانہ کر کے اپنا راستہ صاف کر لیتی ہیں اور اگر آپ صنف قوی سے ہیں تو کیا آپ اپنا کام نکالنے کے لئے ایسے ذلیل کام بھی کرینگے جو ایک مرد کے شایانِ شان نہ ہوں یا مکاری و چالاکی سے اپنی راہ نکال لینگے ؟

(۷)۔ کیا آپ بہادر ہیں :۔ بہادری سے میں مَیدانِ جنگ میں لڑنے سے مراد نہیں لوں گا بلکہ اخلاقی جرأت سے :۔

اگر آپ سے کوئی غلطی ہو جائے تو کیا آپ اسکا اعتراف کر لینگے یا اپنی بات پر اڑے رہینگے اور لاحاصل براہین و لاطائل دلائل سے اُسے درست ثابت کرنیکی کوشش کرتے ہوئے آگ بگولا ہو جائیں گے ؟ اگر کوئی شخص غیر منصفانہ طور پر آپ سے بُرا سلوک کرے تو کیا آپ بہادری سے اُس کا مقابلہ کرینگے یا خفیہ طور پر سازش کی کھچڑی پکاتے رہینگے ؟ کیا آپ اُس طریق پر زندگی بسر کرتے ہیں جیسا آپکا دل چاہتا ہے اور جس قدر آپکی آمدنی ہے یا اُس طریق پر جس طرح شمیم کی امی اور سعید کا ابا، جو آپکے ہمسایہ ہیں، آپ جیسی پوزیشن کے آدمی سے توقع رکھتے ہیں ؟ اگر نہیں تو کیا آپ اپنے ہمسایوں ۔ اپنے رشتہ داروں۔ اراکین بلدیہ یا ہم پیشہ لوگوں سے خائف ہیں ؟ کیا آپ اُس وقت بستر استراحت پر چلے جاتے ہیں۔ جس وقت سونے کو آپکا دل چاہے یا اس خیال سے بیٹھے جمائیاں لیتے ہیں کہ "مولانا بے وقت" اُٹھیں تو آرام کروں ؟ کیا آپ کھاتے وہی ہیں جو آپکا من چاہے اور اپنے مذاق کی پڑھنے اور تفرج میں مطابقت کرتے ہیں ؟ یا آپ وہ کتب پڑھتے ہیں جو ذہنی و دماغی اضمحلال کا باعث ہوں مگر اس لئے کہ وہ علامہ "رائج الوقت" کی تصنیف ہے اور آپکے ایک دوست پڑھنے کو دے گئے تھے ؟ کیا آپ متحرک تصاویر کا تماشہ یا کسی سیاسی رہبر کا لیکچر سننے اس لئے جاتے

ہیں کہ وہ آپکے مذاق کے مطابق ہیں یا اس لئے کہ آپکے دوست وہاں لیجانے پر مصر ہیں؟ کیا آپ فیشن کے غلام اور کورانہ تقلید کا شکار ہیں؟

(۸)۔ کیا آپ ہنرمند ہیں:۔ کیا آپ لوگوں کو ایسا کام کرنے پر مائل کرلیتے ہیں جیسی آپکی خواہش ہو لیکن پھر بھی وہ خوشی ومسرت کا اظہار کریں؟ کیا آپ اپنی بیوی کو ہر بات میں ایسے طریق پر رضامند کرلیتے ہیں کہ اسکو آپکی بے اعتنائی کا شمہ بھر وہم بھی نہ رہے؟ کیا آپ ایسے طریق پر لوگوں کے کپڑوں۔ سامانِ آرائش۔ گھڑیوں۔ موٹر گاڑیوں اور دیگر اشیاء کی قیمت دریافت کرسکتے ہیں کہ اُنکو بُرا معلوم نہ ہو؟ اور کیا اُسی طریق سے اَوروں کو اپنی مملوکہ ومقبوضہ اشیاء کی قیمت بتا سکتے ہیں؟

(۹) کیا آپ صادق ہیں؟ کیا آپ کسی دوست کی نسبت گفتگو کرتے وقت کبھی اظہار تملق بھی کرتے ہیں؟ کیا آپ دوستوں کے عیوب و راز اُس وقت طشت از بام کردیا کرتے ہیں جب وہ آپ سے ناراض ہوگئے ہوں یا جب رشتۂ موانست منقطع ہوچکا ہو؟ کیا آپ اُس شخص کی مجلس میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں جس سے آپکو دلی نفرت ہو مگر جس کے ہاں آپ کے مذاق کے مطابق سامان عیش وعشرت۔ فواکہات ومیوہ جات اور قوت لایموت کا بہترین انتظام ہو اور آپکو ہر چیز پر دست قدرت حاصل ہو؟

(۱۰)۔ کیا آپ سادگی پسند ہیں؟ کیا آپ فوق البھڑک لباس پہنتے ہیں۔ کیا مجلس وضع آئین میں جاتے وقت شوخ رنگ کی نکٹائی۔ جاذب توجہ واسکٹ اور نہایت شاندار کلاہ پہن کر جاتے ہیں یا ویسے کپڑے جب آپ ننھی کے لئے جرابوں کا جوڑا خریدنے بازار گئے تھے؟ کیا آپکا مکان۔ اُسکا سامانِ آرائش۔ آپکا لباس۔ آپکی موٹر کار۔ فٹن یا لینڈو اور ملازمین کی "فوج" یا آپ کے اخراجاتِ روزمرہ آپکی آمدنی کے تناسب پر ہیں؟ کیا آپ اپنی امارت اور تمول کے اظہار کی خاطر جواہرات کی کئی ایک انگوٹھیاں پہن لیا کرتے ہیں؟ کیا آپ تیز خوشبوؤں اور عطریات کا استعمال کیا کرتے ہیں؟ اور محض اپنی علمی قابلیت کا سکہ جمانیکی خاطر اپنی تقریریں میں گرانڈیل الفاظ اور غیر مانوس محاورات کا استعمال کرتے ہیں؟ کیا آپ اس بات کا فخریہ اظہار کرتے ہیں کہ آپ نے کبھی کوئی مخرب اخلاق فعل نہیں کیا یا برعکس اسکے دوسروں کے معائب وعیوب ظاہر کرکے مسرور ہوتے ہیں؟

(۱۱)- کیا آپ صفائی پسند ہیں؟ کیا آپ اپنے بدن۔ دانتوں۔ ناخنوں اور لباس کو صاف رکھتے ہیں۔ کیا آپ کا دل صاف ہے؟ کیا آپ رحم یا ہمدردی کے نام سے ناآشنا ہیں یا برعکس اسکے ایسے سریع الاحساس ہیں کہ آپکے دل پر ہر ایک بات رنج وغم کی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے جسکا ایک تندرست دل کو احساس بھی نہ ہونا چاہیئے؟ کیا آپ سعدی۔ بھگت کبیر اور شکسپیئر کی کھری کھری باتوں سے ناراض ہوجاتے ہیں؟ کیا آپ صنف مقابل کا احترام بھی کرتے ہیں یعنی اگر آپ مرد ہیں تو عورتوں کا یا اگر عورت ہیں تو مردوں کا؟ کیا آپ کسی آدمی کے کندھے پر تھپکی دینا پسند کرتے ہیں جبکہ وہ ایک باعزت آدمی کے سامنے آپکے اس فعل کو بد تہذیبی پر محمول کرتا ہو؟ کیا آپ کسی راہ چلتے دوست کی پیٹھ پر تھپکی دیکر کہا کرتے ہیں "کہو دوست کدھر کا رخ ہے" اور کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی باتیں دوسرے کے لئے باعث خفت ہیں؟

(۱۲) کیا آپ خود پسند ہیں؟ کیا آپ ہر ایک بات یا ہر ایک آدمی میں نقص نکال لیتے ہیں؟ کیا آپ شاذونادر ہی کوئی ایسی کتاب۔ کھیل تماشہ یا آدمی دیکھتے ہیں جو آپکے لئے باعث مسرت ہوسکے یا آپکے مذاق کے مطابق ہو؟ کیا آپ اس بات کے خواہشمند ہیں کہ لوگ آپکو عام انسانوں سے "برتر" خیال کریں؟

(۱۳)- کیا آپ خوش مزاج ہیں؟ کیا آپ ہمیشہ ناخوش۔ چڑچڑا۔ زود رنج اور تند مزاج رہتے ہیں یا قدرتی طور پر مہربان۔ ہنس مکھ اور بشاش رہنے کی کوشش کرتے ہیں؟

(۱۴)- کیا آپ خود پرست ہیں؟ کیا آپکو اپنے حسن۔ جوانی۔ "پوزیشن"۔ امارت اور دنیاوی کامیابی پر کسی قسم کا غرور ہے؟ کیا آپ ہمیشہ اپنی نسبت ہی گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں یعنی جو کچھ لوگ آپکی نسبت کہتے ہیں یا جو کچھ آپ خیال کرتے ہیں۔ یا جو کچھ آپکی ملکیت ہے؟ کیا آپ ضرورت سے زیادہ اپنے بچوں اور ملازمین کا ذکر کرتے ہیں؟ کیا ہر گفتگو میں آپ اپنی سیر و تفریح کا تذکرہ کرتے ہیں یا اُن مقامات کا جو آپ نے دَورانِ سیاحت میں دیکھے تھے؟ کیا آپ اُن مشاہیر عہد کا ذکر کرنا پسند کرتے ہیں جن سے آپ متعارف ہیں۔ کیا آپ مشیخت کے طور پر اپنے کسی وزیر دوست یا گورنر۔ یا کسی مصنف یا ایکٹر یا جج اور بیرسٹر کا تذکرہ کرنا پسند کرتے ہیں اور اس حالت میں کہ آپ اُن سے صرف ایک دفعہ ہی ملے تھے؟ کیا آپ کی

گفتگو کا جزو عظیم سفیروں۔ شمس العلماؤں۔ مہو مہا پادیاؤں۔ کروڑ پتیوں اور صاحب رسوخ آدمیوں کے ذکر اذکار پر مشتمل ہوتا ہے؟ جب آپ اخبار میں ایسی دعوت یا ایک ایسے وفد کا ذکر پڑھ رہے ہوں جس میں گورنر اور آپ شریک تھے تو کیا آپ غور سے دیکھتے ہیں کہ دیگر بڑے آدمیوں کی فہرست میں آپکا نام بھی شایع ہوا ہے یا نہیں؟

(۱۵)۔ کیا آپ توہم پرست ہیں:۔ کیا آپ اس بات کے محتاط ہیں کہ سگریٹ پیتے وقت دیکھیں کہ "قینچی" کا منہ نیچے ہے یا اوپر؟ کیا کسی کام کو شروع کرتے وقت چھینک کا آجانا آپکے دل میں اُس کام کے حُسن انجام کا خدشہ ڈال دیتا ہے؟ کیا آپ نئے مکان میں داخل ہونے کے لئے یا سفر کو چلتے ہوئے مہورت تلاش کیا کرتے ہیں؟ اگر آپ صنفِ لطیف سے ہیں اور خدانخواستہ آپکا کوئی بچہ تلف ہو جائے تو کیا آپ عورتوں کی اُن باتوں پر دھیان دیتی ہیں جو آپکے ایمان میں خلل ڈالیں مثلاً کوئی کہتی ہے مسان کا دُکھ ہے رمضان شاہ سے گرنت کراؤ۔ کوئی کہتی ہے مکان اچھا نہیں میر حلیم سے کلواؤ۔ کوئی کہتی ہے سفر میں آئی گئی ہو کوئی چڑیل لپٹ گئی ہے بڈھے شاہ کی چوکی دو۔ کوئی کہتی ہے کوکھ کا خلل ہے مہر علیشاہ کا عِلاج کرو۔ کوئی کہتی ہے دُود پر نظر ہے چوراہے میں اوتارا رکھواؤ۔ گنڈے۔ تعویذ۔ عمل۔ ٹونے۔ ٹوٹکے کراؤ۔ کیا آپ نے کبھی مرادوں کے بر آنے کے لئے بیوی آس کا روزہ رکھا ہے؟ یا گھر میں کسی پیر پیغمبر کا گذر سمجھ کر وہاں چراغ جلائے یا پھول چڑھائے ہوں؟ کیا آپ پرمی۔ بھوت۔ دیو یا سایہ پر یقین رکھتی ہیں۔ کیا آپ رمالوں۔ نجومیوں۔ پنڈتوں۔ اور راؤلوں کے ہاں "قسمت کے ستارے کی گردش" دیکھنے جاتی ہیں اور کیا آپ اُنکی باتوں پر اعتماد کُلی رکھتی ہیں؟ جو یہ لوگ آپکی اور آپکے متعلقین کی نسبت کہدیں؟ کیا آپ مولی کو صرف اس لئے "پتوں والی" کہکر پکارتی ہیں اور اُس کا اصلی نام نہیں لیتیں کہ یہ عموماً اُس گھر میں کھانے کے لئے ملتی ہے جہاں کوئی موت وقوع پذیر ہوئی ہو؟ کیا آپ چیل کو چیل کہتی ہیں یا "اوپر والی"؟

(۱۶) کیا آپ نمایش پسند ہیں:۔ کیا آپکے نزدیک معیارِ انسانیت "شہرت" اور "نام" پر ہے یا انسان کی ذاتی صفات پر؟ کیا اس بات کو فخر سمجھتے ہیں کہ کئی مالدار اور برسرِ حکومت

آدمیوں کو آپ جانتے ہیں؟ کیا آپ اپنے خاندان پر فخر کرتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی اس بات کو بڑے تحکم سے بیان کیا ہے کہ آپکا چچا عدالت عالیہ کا جج یا آپکا بھانجہ بینکر یا آپکے ماموں قلمدانِ وزارت سنبھالے ہوئے ہیں؟ کیا آپ اس قسم کی مشیخت کی باتیں ادنےٰ درجہ کے لوگوں اور متوسط الحال شرفا کے سامنے بیان کرتے ہیں؟ یا برعکس اسکے آپ سرمایہ داروں۔ برسر اقتدار لوگوں۔ قوم پرستوں اور ماڈریٹوں کو بُرا جانتے ہیں؟ کیا آپ اس بات کو زور سے بیان کرینگے کہ آپکے چچا کے پاس شہر میں سب سے قیمتی گھوڑی یا نایاب موٹر کار ہے؟ کیا آپ یہ بھی بیان کرینگے کہ آپ کے لاولد کروڑپتی ماموں نے آپکو تبنہ بنا لینے کا ارادہ کیا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے؟ کیا آپ یہ بیان کرنا پسند کرینگے کہ موجودہ سیاسی دور کا ایک بڑا لیڈر آپکی والدہ کا رشتہ دار ہے۔ یا کل آپکے والد کمشنر صاحب کے ہمراہ کوئی نمائش یا میلہ دیکھنے گئے تھے؟

(۷) - کیا آپ بلند ہمت ہیں:- کیا آپ اُس وقت خفیف ہو جاتے ہیں جب کرکٹ۔ ٹینس شطرنج یا گنجفہ کی بازی آپکے حق میں مات ہو گئی ہو۔ یا اُس وقت مسرت سے اُچھل پڑتے ہیں جب آپ نے بازی جیت لی ہو؟ جب آپکو کسی بیوپار میں نقصان ہو۔ جب آپکا مدِمقابل بلدیہ یا کابینۂ وزارت کے انتخاب میں کامیاب ہو گیا ہو۔ جب کسی انعامی مقابلہ میں آپ کا حریف بازی لے گیا ہو۔ جب آپ اُس وقت پلیٹ فارم پر پہنچے ہوں جب گاڑی اُسی وقت متحرک ہوئی ہو۔ یا جب کسی مجلس میں آپ داعیان کی توجہ کا مرکز نہ بنے ہوں جبکہ آپکا حق تھا اور جس سے آپکو دلی صدمہ پہنچا ہو تو کیا آپ ان تمام مواقع پر فرخندہ مزاجی اور پُرتبسم ہونٹوں سے گفتگو کرینگے؟

(۸) - کیا آپ حاسد ہیں:- کیا آپ اپنے عزیز ترین دوست کی ترقی مناصب درجات اعزازی پر سرفرازی سے دل میں جلتے ہیں؟ ہر ایک آدمی ستم رسیدہ اور مظلوم سے ہمدردی رکھتا ہے لیکن کیا آپ اُسی ہمدردی سے اپنے اُس غریب ہمسایہ یا غریب رشتہ دار کو دیکھینگے جو کل تک تو آپکا دستِ نگر تھا لیکن آج خلاف توقع ایک امیر کبیر بن گیا ہو؟ اگر آپ عورت ہیں تو کیا آپ نے کسی کے قیمتی زیور پر حسد کیا ہے۔ یا اگر حامد کی بیوی حُسن اور سیرت میں بے مثال ہے اور تم سے کئی درجہ خوبصورت تو کیا اُس کی نسبت تم ویسے ہی الفاظ میں ذکر

کروگی جس طرح اپنی غریب ہمسائی بنّو کی نسبت ؟ کیا تم حسین لڑکیوں سے اس لئے تنفر ہو کہ تمہاری اپنی شکل بھونڈی ہے ؟

(۱۹)۔ کیا آپ ضرورت سے زیادہ ہمدرد ہیں :۔ کیا آپ ہر شخص کو اپنی رائے دینے یا نصیحت کرنے کے خواہشمند ہیں ؟ جب آپ سے ایسی باتوں کی درخواست نہ کی گئی ہو ؟ کیا آپ بیمار آدمیوں کو اکثر ایسی ادویات کے نام بتلاتے ہیں جو آپکے خیال میں اُنکے لئے فائدہ مند ہونگی حالانکہ آپ طبیب نہیں ہیں ؟ کیا آپ لوگوں کی بھلائی کے لئے اُنہیں مختلف قسم کی تجاویز بتلانے رہتے ہیں ؟ کیا آپ جمہور کو بتلاتے ہیں کہ اُنہیں کیا کھانا اور کیا پہننا چاہیئے ؟ کیا آپ آدمیوں کو سلیم الفطرت بنانے میں کوشاں رہتے ہیں ؟ کیا آپ عام لوگوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں ؟ کیا آپ دوسرے لوگوں کی صرف نحو کی غلطیاں صحیح کرتے ہیں اور اُن کا تلفظ درست کرنے کے عادی ہیں ؟ کیا آپ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ اُنہیں فلاں قسم کی کتب پڑھنا چاہئیں

(۲۰)۔ کیا آپ دُور اندیش ہیں ؟ کیا آپ اُس بات کا اعادہ کردیتے ہیں جو راز سمجھ کر آپ سے کہی گئی ہو ؟ کیا آپ محض شناساؤں سے بھی نہایت ضروری خانگی امورات کا ذکر کردیا کرتے ہیں ؟ کیا آپ ناواقف آدمیوں سے بھی اپنے کاروبار یا دفتر کے راز بیان کردیتے ہیں ؟ کیا آپ اُن افواہوں کو پھیلاتے ہیں جو آپنے سُنی ہوں اور جو ممکن ہے بے بنیاد ہوں ؟ کیا آپ لوگوں کی غیر حاضری میں ویسی گفتگو کرتے ہیں جیسی اُنکی موجودگی میں کرنیکا آپکو حوصلہ نہ پڑے کیا آپنے کبھی کوئی گمنام چٹھی لکھی ہے ؟

(۲۱)۔ کیا آپ ذکی الحس ہیں :۔ کیا آپ ہر بات کو نہایت بُری طرح محسوس کرتے ہیں ؟ کیا آپ ہر بات کو اس طور محسوس کرتے ہیں کہ آپکی حساسیت دوسروں کے لئے باعث رنج ہو ؟ کیا آپ کا مزاج ایسا ہے کہ کسی کو کچھ کہنے کی جرات ہی نہ پڑے ؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ تمام دنیا آپکے برخلاف ہے ؟ کیا آپ ہمیشہ اپنے آپکو ملامت کرتے ہیں کہ آپکا کوئی دوست نہیں۔ آپکا کوئی ہمدرد نہیں۔ یا آپ ایسے غریب ہیں یا آپ ہر بات میں ناکام رہتے ہیں یا اسکے بالکل برعکس ؟ کیا آپ ذرا سی خلافِ مزاج بات ہوجانے پر آگ بھبوکا ہوجاتے ہیں ؟

(۲۲)۔ کیا آپ وفادار ہیں :۔ کیا آپکا دوست ہر حال میں آپ پر یقین رکھتا ہے ؟ کیا آپ

اُس کی غیر حاضری میں اُسکی طرفداری کرینگے اگر اُسکے برخلاف آلف کوئی ناواجب بات کہہ رہا ہو؟ کیا آپ اُس کے پس پشت نہایت زوردار الفاظ میں اُسکی تعریف کرتے ہیں یا اُسکے روبرو؟ کیا آپ اپنے خاوند یا اپنی بیوی کے وفادار ہیں؟ کیا آپکے والدین آپ کے لئے باعث ندامت ہیں؟ کیا آپ اپنے ملک اور تخت و تاج کے وفادار ہیں؟ کیا آپ اُس بات میں حصّہ لینے سے محترز رہیں گے جو آپکے مُلک کے لئے باعث نقصان ہو؟ کیا آپ اپنے مُلک کے معاملات میں ایسی دلچسپی لیتے ہیں کہ آپ کو ایک وفادار شہری کہا جائے؟

اِن بائیس تجربات سے اگر ہمیں معلوم ہوگیا ہو کہ ہمارے "کیرکٹر" میں کوئی نقص ہے تو ہمیں پست حوصلہ نہ ہونا چاہیئے۔ اگر ہم کسی بات میں خام ہوں تو ہمیں وہ کمی پوری کرنے کے لئے ہر قسم کی مساعی جمیلہ سے کام لینا چاہیئے اور اگر ہم اُس میں پورے اُتریں تو اپنی نیک صفات و عادات کو لوگوں کے لئے ایک نمونہ بنانا چاہیئے۔ سالہا سال گذرے یونان قدیم کی خاک سے ایک شخص پیدا ہُوا تھا جس نے اپنے ہمقوموں کو ایک نصیحت کی تھی جس پر ہم بھی آج عمل پیرا ہو کر منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں، اور وہ صرف تین الفاظ تھے" اپنا آپ جانو" !!

محمد ضیاء الدین شمسی

شہیدِ تغافل

ھا

۱

شادی کے بعد تین مہینے کا عرصہ ریاض نے ایک نشے کی حالت میں گذار دیا۔ ریاض کے والدین اُس کی آزاد طبیعت اور اُسکے شاعرانہ خیالات سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اپنی مجلسِ احباب میں اور دیگر اعزا کے سامنے بھی کئی مرتبہ اِس آزادی کا اظہار کر چکا تھا۔ بالخصوص شادی کے معاملہ میں تو وہ اپنے تئیں تمام قیود اور پابندیوں سے آزاد خیال کرتا تھا۔ "والدین کی خدمت" وہ کہتا تھا اولاد کا فرض اولین ہے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ محبت میں بھی ہم والدین کی رضامندی کے ماتحت چلیں۔ محبت طبعی ہے، کسی کے کہنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ تو پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایسی لڑکی سے جس کو ہم نے عمر بھر نہیں دیکھا۔ جس کے مذاق اور خیالات کے متعلق ہمیں قطعی کوئی علم نہیں۔ اور جو سوئے اتفاق سے ہمارے ساتھ وابستہ کردی گئی ہے محض والدین کی خوشنودی اور جبر کی وجہ سے محبت کریں۔ یاد رکھو وہ محبت جو کسی بیرونی زور سے پیدا ہو یا جس کی بنا کوئی خود غرضانہ ہوس ہو ہرگز محبت نہیں ہوتی۔ خود غرضی کی ابتدا محبت کی موت ہے۔ ایسی ہی جبری اور خلاف طبیعت شادیاں ہمارے ہاں رائج ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی خاوندوں کو اپنی بیویوں سے عشق نہیں بلکہ ہمدردی ہوتی ہے — عورت ہی تو دنیا کا بہترین سرمایہ ہے۔ عورت ہی تو خالق ازل کی حسین ترین صناعی ہے۔ اور عورت ہی تو درس ادب و اخلاق کی سب سے بڑی معلمہ ہے اور جب اسی نایاب نعمت کو حاصل کرنے میں جو ہماری تنہا مسرتِ حیات ہے ہمارے جذبات و انتخاب کی پروا نہیں کی جاتی تو کیا یہ ظلم نہیں؟ حیف ہے اُس شادی پر جس کی بنیاد عشق پر نہ ہو۔"

ریاض اپنے اِن خیالات کی وجہ سے یا اُس کی بڑھی ہوئی خوش قسمتی کہئے کہ وہ ہندوستان کے جذبات کش طرزِ انتخاب سے بچ گیا۔ اُس کی بیوی اُس کی برسوں کی محبت کا نتیجہ تھی رسمی شادی سے قبل وہ بارہا ایک دوسرے سے ملاقات کر چکے تھے۔ اور اُنکو یقین تھا کہ

باہم ملنے پر انکی روشن و زرّین زندگیاں ایک ناقابل بیان انبساط و سرور سے معمور ہو جائینگی اور فی الحقیقت ایسا ہی ہوا۔ تین مہینے تک ریاض اپنی متاعِ حیات و مایۂ زیست گوہر میں جذب ہو کر رہا۔ وہ خود کو ایک جسدِ بے جان تصور کرتا تھا اور گوہر کو روحِ رواں۔ دوستوں سے ملنا تو تقریباً اُس سے چھوٹ گیا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ وہ گھر ہی میں رہتا۔ سیر یا ہوا خوری کے لئے باہر جانا بھی وہ بے سود سمجھتا تھا۔ کائنات کا تمام حسن۔ بیرونی دنیا کی تمام دلچسپیوں کا ماحصل اب اُسکے پاس موجود تھا۔ وہ باہر کیوں جاتا؟

ریاض بی اے کر چکا تھا۔ اُس کی آئندہ زندگی کا پروگرام اُسکے والدین نے مرتب کر رکھا تھا۔ اُسکو اب انگلستان جانا تھا کہ وہاں سے چار سال کے مطالعہ اور محنت کے بعد انجنیئر بن کر واپس آئے۔ اس پروگرام کو تبدیل کرنے کی ہمت اُس میں نہ تھی اور نہ ایسا کرنا وہ جائز سمجھتا تھا کیونکہ اُسکی ترتیب میں بہت حد تک خود اُسکی رائے کا دخل تھا۔ گوہر سے علیحدگی بظاہر اُسکے لئے قیامت خیز تھی لیکن جب وہ خیال کرتا کہ چار سال کی جدائی کے بعد ایک پُرامن و آسائش زندگی اُنکی منتظر ہے۔ وہ زندگی جس کا خوشگوار خواب وہ کئی سال سے دیکھ رہا تھا تو اُسکے فراخ چہرہ پر ایک مخفی تبسم ظاہر ہو جاتا۔ اُسکی نیم وا آنکھیں اُس موہومہ زندگی کے دلفریب مناظر کی سیر میں مصروف ہو جاتی تھیں۔

۲

روانگی انگلستان سے کچھ روز قبل ریاض اپنے عالیشان مکان کے ایک خوبصورت آراستہ کمرہ میں بیٹھا گوہر کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ گوہر اس آنے والی جدائی سے بے خبر نہ تھی لیکن وہ کیا کر سکتی تھی؟ سب سے زیادہ ڈر اُسے اس بات کا تھا کہ کہیں انگلستان کی گوناں گوں دلچسپیوں میں محو ہو کر ریاض اُسکو بھلا نہ بیٹھے۔ ریاض کا تغافل وہ اپنے لئے موت سے بدتر سمجھتی تھی۔ لیکن اُس کا یہ خدشہ غلط نہیں کہا جا سکتا۔ یہ محض امکان ہی نہ تھا بلکہ اس کے سامنے اس امر کی کئی زندہ شہادتیں موجود تھیں۔ وہ دیکھتی تھی کہ ہندوستانی نوجوان طلباء جنکے دل اور دماغ ابھی غیر پختہ ہوتے ہیں انگلستان کی مادیت آباد زمین میں اثرات ماحول اور وہاں کی معاشرت سے مغلوب ہو کر اپنے تئیں کھو بیٹھتے ہیں۔ اور

اُن کے عزیزوں کی وہ تمام توقعات جو اُن کے یورپ بھیجنے سے وابستہ ہوتی ہیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ لیکن جب وہ ریاض کے بے تابانہ اظہارِ تعشق پر نگاہ ڈالتی تو اُس کو اپنا گمان غلط معلوم ہوتا تھا۔ اِن خیالات سے متاثر ہو کر اُس نے ریاض سے کہا:۔

گوہر: "ریاض پیارے تم انگلستان جا رہے ہو۔ تمہیں وداع کرنے کو دل تو نہیں چاہتا مگر حصولِ آرام کا یہی طریقہ ہے کہ پہلے تکلیف اُٹھائی جائے۔ چار سال بڑا لمبا عرصہ معلوم ہوتا ہے عیش و امن کی زندگی میں چار سال آنکھ جھپکتے گذر جاتے ہیں مگر فراق کے چار سال ایک کوہِ گراں ہے۔ دیکھو پیارے مجھے وہاں جا کر بُھلا نہ دینا"!

ریاض بے تاب ہو گیا۔ اُس نے گوہر کے حنا آلود ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں نرمی سے دبایا "پیاری گوہر" وہ بے خود ہو کر بول رہا تھا اور اُس کی آواز میں نمایاں تھرتھراہٹ تھی۔ "میری مسرت اور راحت تم ہو۔ میری دنیا بھر کی خوشیاں تمہارے ساتھ وابستہ ہیں۔ تمہاری خدمت میری عین راحت ہے۔ تمہیں بھول جانا اپنی خوشی کو عمداً ضائع کرنا ہے۔ تمہاری یاد ہمیشہ میری رُوح کے لئے تقویت کا باعث ہوگی تمہارا رُوح پرور تصور میری زندگی کے تمام لمحوں میں میرے دماغ میں موجود رہیگا۔

جان سے پیاری گوہر اگر محبت بھی کوئی مادی شئے ہوتی اور اُسکی مقدار مقرر ہوتی تو شاید میں تمکو بتا سکتا کہ میرا دل تمہیں کس شدت سے پیار کرتا ہے۔ چار سال کی جدائی کے بعد ہم ہمیشہ کے لئے یکجا ہو جائیں گے۔ میں تو جب کبھی اُس زندگی کا اُن لاتناہی مسرتوں کا تصور کرتا ہوں جو تمہارے ساتھ رہنے پر پیدا ہونگی تو میرا رواں رواں خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے۔ گوہر! یہ چار سال کا عرصہ گذار لو اسکے بعد ایک نشاط آمیز زندگی ہمارے لئے چشم براہ ہے"

ریاض انگلستان روانہ ہو گیا۔ جدا ہوتے وقت دونوں کی آنکھیں ملیں۔ وفورِ غم سے الفاظ گلے میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں اُنہوں نے الوداعی پیغام کہدیا۔ گوہر کا چہرہ یاس و حسرت سے پژمردہ ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنی جان و دل کے مالک ریاض کو اپنے سے ہزاروں کوس دو چار سال کے طویل عرصے کے لئے علیحدہ کر دیا تھا۔ مستقبل کے متعلق وہ کوئی صحیح رائے قائم نہ کر سکتی تھی۔ شعاعِ اُمید اُسکے سامنے تھی لیکن اُس کا مستقل

ہونا یقینی نہ تھا۔ ریاض نے بمبئی سے جہاز پر سوار ہوتے وقت اور پھر جہاز میں سے کئی خطوط گوہر کے نام لکھے۔ اُسکو درحقیقت گوہر سے عشق تھا۔

۳

انگلستان کی مصروف اور لاأبالی مشترک زندگی ہندوستانی نوجوانوں کو ہمیشہ ایک معمہ نظر آتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے گردوپیش کی حسین اور جاذب توجہ اشیاء سے آنکھ بند کر کے اپنے کام میں لگے رہیں اور فراغت کے وقت دماغ کو تمام فرائض کے احساس سے محروم کر کے وہاں کی جدید دلچسپیوں میں بدرجہ اُتم حصّہ بھی لیں۔ لیکن تجربہ کی خامی اور وہاں کی طرز معاشرت سے کماحقہ، واقف نہ ہونے کے سبب وہ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور کام اور تفریح میں جو مساوات وہ قائم رکھنا چاہتے ہیں نہیں رکھ سکتے۔ ریاض گلاسگو کی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ اور اپنا چہار سالہ کورس شروع کر دیا۔ اپنے لئے موزوں جائے رہائش تلاش کرنے اور دیگر ابتدائی ضروریات پورا کرنے میں مصروف رہنے کی وجہ سے وہ گوہر کو بہت مفصل خط نہ لکھ سکا۔ فرصت کے وقت اُسکو اکثر گوہر یاد آتی تھی۔ لیکن خط لکھتے وقت وہ اس بات کی احتیاط رکھتا تھا کہ مصائبِ فرقت کا اُس سے بے تابانہ اظہار نہ ہونے پائے وہ گوہر کو ہمیشہ محبت آمیز تسلیاں لکھ کر بھیجتا تھا۔

۴

ریاض کو انگلینڈ میں دو سال گذر چکے تھے۔ انگلستان کی پُرمشاغل سرزمین میں رہ کر اب اُسکو کہاں فرصت تھی کہ دہ اپنی توجہ ہندوستان کی طرف بھی مبذول کرتا۔ ڈیڑھ سال تک تو وہ گوہر کو برابر خط لکھتا رہا۔ مگر اب اُسکے دل میں گوہر کے عشق کی چنگاری بجھ رہی تھی۔ ولایت کے نمائشی اور فوق البرق لباس والی نازنین لڑکیاں اُسکو مبہوت کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھیں۔ لیکن پھر بھی اس قدر احساس باقی تھا کہ وہ ہستی جسکا رواں رواں اُسکے ساتھ وابستہ ہے اُس پر کچھ نہ کچھ اپنا حق رکھتی ہے۔ محض اس حق کو ادا کرنے اور ایک ناگوار فرض کو پورا کرنے کے لئے اب وہ خط لکھتا تھا۔ محبت خط لکھنے پر مجبور نہ کرتی تھی ـــــ گوہر نے اس تبدیلی کو بخوبی محسوس کیا۔ وہ اظہارِ جذبات کے طریقوں سے واقف تھی۔ اب وہ ریاض

کی تحریروں میں صاف طور پر تصنع، آورد، اور بناوٹ پاتی تھی۔ اُس کی محبت اُسے جھوٹی نظر آنے لگی۔ اس تلخ اور خوفناک حقیقت کا انکشاف اُسکی جان کا روگ ہوگیا۔ اُس نے ریاض کو درد و حسرت سے لبریز خط لکھے۔ مگر ریاض، ہندوستانی ریاض، گوہر کا عاشق زار ریاض نہیں، بلکہ انگریزیت پرست۔ دلدادہ نمائش ریاض کو کہاں فرصت تھی کہ ہندوستانی نادان لڑکی کی چیخ پکار کی طرف متوجہ ہوتا۔ وہ اُن خطوں کو جو ایک وقت میں اُس کے لئے نوید عیش و مسرت ہُوا کرتے تھے اب نوحہ غم سمجھتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اُسکی جدید پُرعشرت زندگی میں اُس کے کان جو نغمہائے شیریں سے مانوس ہوچکے ہیں اس نوحے سے ناآشنا ہی رہیں۔ آہ وہ کس قدر ظلم کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس نے گوہر کو خط لکھنا بالکل بند کر دیا۔ ہفتے اور مہینے گذر جاتے ہیں۔ مگر گوہر بدستور انتظار مجسم ہے۔ اُس کی آنکھیں ریاض کی تحریر دیکھنے کی منتظر ہیں مگر ریاض کی سنگین خاموشی اُسکی آرزؤں کو ہمیشہ کے لئے سُلا رہی ہے۔ ہزاروں کوس کے فاصلہ پر صرف خط و کتابت کا ہی سلسلہ تھا جس نے دونوں کی روحوں کو باہم پیوستہ کر رکھا تھا۔ مگر اب وہ تعلق بھی منقطع ہوچکا تھا۔ گوہر اب اس آس پر زندگی بسر کرتی؟ وہ شخص جسے وہ اپنا تصور کر رہی تھی۔ جس کی محبت پر اُسے ناز تھا اب وہی اُسے ایک غیر ضروری چیز سمجھ کر اپنے سے علیحدہ کر رہا تھا۔ جب وہ مستقبل کے متعلق خیال کرتی تو بیم و یاس کی ہولناک تاریکی سے اُس کا دل لرز اُٹھتا تھا۔ "کیا ریاض کی تمام اُلفت ایک مسلسل منافقت تھی؟ کیا ریاض کا تمام عشق ایک دھوکا تھا؟" وہ اُس کی پُرشوق نگاہوں کا، اُس کی وارفتگی محبت کا تصور اپنے دماغ میں لاتی اور پھر اُس کا مقابلہ موجودہ سرد مہری سے کرتی تو اُسکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ریاض کے الوداعی الفاظ کہ "گوہر یہ چار سال کا عرصہ گذار لو۔ اِسکے بعد ایک نشاط آمیز زندگی ہمارے لئے چشم براہ ہے" اب اُسے ایک بے حقیقت خطرناک مردانہ مذاق معلوم ہو رہا تھا۔ مہینوں گذر گئے مگر ریاض کے دلخراش سکوت میں مضبوطی ہی پیدا ہوتی گئی۔ گوہر کو اب یقین ہوگیا کہ یہ سارا ماجرا ایک خواب تھا جس کی مصنوعی دلفریبیاں ابتک اُسے مسحور کئے ہُوئے تھیں۔ اُسے اب معلوم ہوا کہ مرد کی محبت بیت عنکبوت سے زیادہ کمزور اور ناپائیدار شئے ہے، اُس پر اعتبار رکھنا آگ کے شعلوں سے کھیلنا ہے۔ کاش کہ ریاض اپنی

دلبستگیوں میں یہ بھی خیال کرتا کہ ایک اور ذی روح ہستی اپنا تمام متاعِ حُسن و انبساط اُس کے سامنے ڈال کر اُس کی ایک متبسم نگاہ کی متوقع ہے۔ مانا کہ ریاض کے دل سے اب گوہر کی محبت زائل ہو چکی تھی مگر اُسکو چاہیئے تھا کہ اُس کی زیست کی بقا کے لئے وہ کم از کم اُسکو خط ہی لکھتا رہتا۔

:: ۵ ::

اس تغافل کا لازمی نتیجہ گوہر کی صحت پر ظاہر ہوا۔ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو شائید اس قدر اثر پذیر نہ ہوتی۔ مگر گوہر تو غیر معمولی طور پر سریع الاحساس تھی۔ عورت کو اگر انتہائی یاس کے عالم میں دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھو جب وہ ناکام محبت ہو۔ گوہر کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا وہ اب بھی حسین تھی مگر پژمردہ کلی کی طرح۔ وہ گھنٹوں محوِ خیال رہتی اور بسا اوقات اپنی کمزور طبیعت پر قابو نہ پاکر پہروں رویا کرتی تھی۔ ریاض کی بیوفائی نے اُس کی رُوح کو پگھلا دیا تھا۔ نیرنگی دہر کا بہ تکلیف وہ سبق اُس نے حیرت کے ساتھ پڑھا اور اُس پر اب واضح ہُوا کہ مرد کس قدر چاپلوس۔ کتنے بے مروت۔ اور کیسے بیوفا ہوتے ہیں۔ اپنی غرض کے لئے وہ مفادِ غیر کو کس سنگدلی سے قربان کر دیتے ہیں۔ گوہر کے والدین اُسکی صحت کی کمزوری سے بڑے متفکر ہو رہے تھے۔ انہوں نے بیسیوں علاج کئے مگر گوہر کے درد کا درماں ممکن نہ تھا عورت کی تمام بیماریوں کا علاج مرد کی محبت ہے۔ گوہر کا چہرہ ہر وقت آلام و تفکرات کا مسکن بنا رہا تھا اور وہ خود محسوس کرتی تھی کہ اُس کی رُوح اندر سے کشید کی جارہی ہے۔ ہلکا ہلکا بخار گوہر کی ہڈیوں میں ٹھیر گیا تھا۔ کھانسی اور زکام گھڑی بھر کے لئے جدا نہ ہوتے تھے۔ وہ بے انتہا لاغر ہو گئی تھی۔ اب اُسے صحت یاب ہونے کی قطعی امید نہ تھی۔ جب وہ چاروں طرف سے مایوس ہو چکی۔ جب امید کی آخری ٹمٹماتی ہوئی شعاع اُسکے سامنے بجھ کر رہ گئی۔ جب یاس کی ناقابل شگاف گھٹائیں ہر طرف سے اُس پر امنڈ آئیں تو اُس نے ایک رات بصد وقت لمپ کی روشنی میں ذیل کا خط ریاض کے نام لکھا۔

داغ کچھ در ہم نہ تھا جس کا انہیں ہوتا خیال
ہو گیا گم ہو گیا جاتا رہا، جاتا رہا

پیارے ریاض! اگر میری ندائے درد تمہاری عشرت خیز زندگی میں چند گھڑی کے لئے مخل ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ میرا کوئی حق نہیں کہ تمہاری خوشیوں میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کروں۔ میرا دل قابو سے باہر ہو رہا ہے۔ اور ایک موہوم خواہش سے میرا سینہ پھٹا جاتا ہے۔ کاش تمہیں اتنا معلوم ہوتا کہ تمہاری گوہر کی زیست کا سہارا تمہاری نگہ التفات ہے۔ تمہارے لئے انگلستان جیسی سدا بہار زمین میں بیسیوں سوسائٹیاں اور مجلسیں ہیں جہاں تمہاری کلفت کی تلافی ہر ممکن طریقہ سے ہو سکتی ہے۔ مگر مجھ حرماں نصیب کے لئے تمہارے نام کا وظیفہ ہی ہے۔ جب دل بہت بیقرار ہو جاتا ہے تو تمہارے گذشتہ خطوط جن سے محبت کی خوشبو آتی ہے پڑھتی ہوں، اور سینکڑوں بار چومتی ہوں۔ مجھے یقین نہ تھا کہ تمہاری محبت اس قدر جلد بدل جانے والی ہے۔ اُس مفروضہ زندگی کی آنے والی دلفریبیوں کے مناظر کا تصور کیا کرتی تھی جو تمہارے ہندوستان واپس آنے پر پیدا ہونگی۔ مگر آہ ریاض پیارے! میری اُمیدوں کا خون کس حسرتناک طریقہ سے ہوا۔ میری زندگی ویران ہو گئی ہے سُنا کرتی تھی کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ممکن نہیں کہ ایک شخص دوسرے کی محبت میں سرشار ہو اور دوسرا اُس کا جواب تغافل اور سنگدلی سے دے۔ مگر تجربہ نے اس پر مہر تصدیق نہ لگائی۔ اس وقت رات کے سناٹے میں جب سب خاموشی سے سو رہے ہیں میرا دل آگ کی طرح بھڑک رہا ہے۔ مجھے کسی پہلو کل نہیں۔ اور یہ حالت آج سے نہیں بلکہ مہینوں سے ہے۔ میری بیماری کا حال تو تم نے سُن ہی لیا ہوگا۔ والدین ڈاکٹری ادویات کے استعمال میں کوشاں ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ اگر ایک بار تمہارا پُر تبسم پیارا چہرہ دیکھ لوں تو یہ تمام بیماری کافور ہو جائے۔ ریاض! خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ میرا دل تمہاری پرستش کرتا ہے۔ میرے دن اور میری راتیں تمہیں کیا معلوم کیسے گذر رہی ہیں یہ زمانہ ایک پہاڑ ہے جس کے ٹلنے کی کوئی اُمید نہیں۔ یہ بیماری اب مجھ سے جدا نہیں ہونے کی۔ بیسیوں علاج ہُوئے مگر شفا تو تمہارے ہاتھ نہیں ہے۔ اب زندگی کی آس منقطع ہو چکی۔ میرا یہ آخری عریضہ تمہاری خدمت میں پہنچتا ہے۔ اسکے بعد تم انشاءاللہ یہی سنو گے کہ فرقت نصیب گوہر اپنے جان سے پیارے ریاض پر قربان ہو گئی۔ دل تو

یہی چاہتا تھا کہ جان تمہارے ہاتھوں میں نکلتی مگر قسمت نے یہ موقع بھی نہ دیا۔
پیارے ریاض! دل اندر ہی اندر ڈوب رہا ہے۔ ہاتھوں میں اب قوت نہیں رہی قلم بے طرح جنبش کر رہا ہے۔ اس سمع خراشی کی مجھے معافی دیدو۔ خدا کرے تمہیں زندگی کی بہاریں دیکھنا نصیب ہوں میں ہوں، پیارے ریاض ہمیشہ کے لئے تمہاری
گوہر!!!!

گوہر نے خط لکھنے کے بعد ایسا محسوس کیا کہ اُسکی رُوح پر سے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا ہے۔ وہ ایک ضروری فرض ادا کرچکی تھی۔ اب وہ اپنے تئیں زیادہ مطمئن پاتی تھی مگر وہ اطمینان کیفیتِ اضطراب سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھا۔ کمرے کی تاریک دیوار پر جو لمپ کی ناکافی روشنی میں دھندلی سی نظر آتی تھی اُسکی آنکھیں جمی ہُوئی تھیں۔ شاید وہ اپنی قوتِ متخیلہ سے عہدِ گذشتہ کے واقعات کو دوبارہ اپنے سامنے لارہی تھی۔ اُسکا چہرہ حسرت واندوہ کی زندہ تصویر تھا۔ اس بات کا تیقن کہ اب وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ریاض کو، جسکا خیال اُسکے دل و دماغ پر مستولی تھا، اب آخری مرتبہ بھی وہ نہیں دیکھ سکتی اپنی نامرادی اور بےبسی کا تصور۔ ان سب نے مل کر اُسکے دماغ میں ایک ہیجان پیدا کردیا۔ اُسکا دل، اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ کوئی ہاتھوں سے مسل رہا ہے۔ وہ اس بےچینی کی متحمل نہ ہوسکی۔ اُسکے بیتاب لرزتے آنسو اُسکے رخساروں پر گرے اور گھڑی بھر میں بستر کا تکیہ اُسکے اشکوں سے تر ہو چکا تھا۔

دوسری صبح گوہر کا یہ حال تھا جیسے کوئی غریب بےبس پرند قید سے تنگ آکر قفس سے نکلنے کی بےسود کوشش کرتا ہے اور چند گھنٹے کی سعیِ لاطائل سے تھک کر خود ہی نڈھال ہوکر گر پڑتا ہے آج وہ بے انتہا کمزور اور لاغر معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے چہرے پر رونق اور بشاشت نام کو نہ تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکی زندگی کی گھڑیاں پُوری ہو چکیں۔ اُسکے عزیز و اقربا اپنے غمگین و پریشان چہروں سے اُسکے گرد حلقہ کئے ہُوئے تھے کہ وہ شاید کچھ بولے مگر مریضۂ عشق کی آنکھیں چھت کی طرف لگی ہُوئی تھیں۔ شاید وہ اب بھی "اُس نام"، کو جس نے اُسے دُنیا سے بیگانہ کردیا تھا اپنے دل میں دُہرا رہی تھی کہ ایک ہچکی آئی اور ساتھ ہی اُسکی روح قیدِ حیات کے بندھنوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہوگئی ؎

یہ کس کا نام لیکر جان دی بیمارِ فرقت نے یہ کس ظالم کا چرچا رہ گیا تیمارداروں میں

عاشق بٹالوی (مشن کالج لاہور)

قوّت

گلی کے کنارے میں اس مجمع کو اکثر دیکھا کرتا تھا، مزدوروں کے قلیوں کے لڑکے غول کے غول دوپہر کو وہاں کھیلتے ہوتے تھے، آپس میں اُلجھتے تھے، چیختے چلاتے تھے۔

ایک دن میں اُس راستے سے گذر رہا تھا۔ لڑکوں کا مجمع تو تھا مگر کھیل نہ تھا بلکہ لڑکے حلقہ باندھے کسی چیز کا تماشہ دیکھ رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مزیدار تماشا انہیں بہت لطف دے رہا ہے سب کے چہروں پر مُسکراہٹ تھی، میں نے دیکھا کہ جیسے وہ اس ذوق شوق سے دیکھ رہے تھے، وہ ایسا تماشہ تھا جو غالباً اُن کی تفریح طبع کے لئے روز ہوتا ہوگا ایک بڑا لڑکا، جو سن میں سب سے زیادہ معلوم ہوتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ قریب قریب جوان ہوچکا تھا، متکبرانہ بیچ میں کھڑا تھا اور ایک چھوٹا لڑکا اُس سے دست و گریباں ہو رہا تھا۔ بڑا چھوٹے کو چپتیا رہا تھا، اور غلیظ گالیاں دے دے کر اپنے سے علیحدہ کر رہا تھا۔ چھوٹا لڑکا گھونسے کھا رہا ہے، تھپڑ کھا رہا ہے بڑے لڑکے کے ہر جھٹکے پر زمین پر گر پڑتا ہے، ہر گھونسے اور تھپڑ پر ہائے کی آواز اُس کی جگر گاہ سے نکلتی ہے، مگر گر کے اُٹھتا ہے، رونا جاتا ہے، رونے سے اور زمین پر گرنے سے اُس کے بال، اُس کا چہرہ خاک آلود ہورہے ہیں، لیکن وہ پھر بڑے لڑکے سے غصہ میں لپٹتا ہے۔ ہچکیاں بندھ رہی ہیں مگر کہے جاتا ہے ”میری ہے، لاؤ“

یہ کہہ کے ایک تیچی کو بڑے لڑکے سے چھیننا چاہتا ہے، ہر طلب محق کے مقابلہ میں اُسے ایک گھونسا ایک لات ملتی ہے جسے کھاکے وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹتا ہے۔ مگر پھر آگے آتا ہے۔ رونے اور چیخنے کی وجہ سے اُس کی آواز بیٹھ گئی ہے۔ اُس کا عجز و ضعف بڑھتا جارہا ہے لیکن اپنی تیچی اُس سے واپس لینے کی کوشش کئے جارہا ہے۔

آخرکار اس پر ایک ایسا لپڑ پڑا، جس سے وہ بھنّا گیا اور چکّر کھاکے زمین پر آرہا۔ اب اُس میں اُٹھنے کی بھی قوت نہ رہی تھی کمزوری سے زمین پر پڑا ہوا رو رہا تھا اور

بڑے لڑکے کو گالیاں دے رہا تھا، اور وہ جبر و قہر سے حاصل کی ہوئی قمچی کو مفتخرانہ انداز سے ہلا ہلا کے، اس چھوٹی مخلوق کی جو حلقہ باندھے کھڑی تھی اور (جو قوت کے مقابلہ میں عاجز کو ہیچ جانتی تھی) قہقہوں اور تالیوں میں جھومتا ہوا چلا گیا۔

عین اس وقت، اس منظر کے اوپر سے ایک کوا، جس نے ایک آشیانۂ شفقت میں گھس کر، ابھی ابھی انڈوں کو پھوڑا تھا اور انہیں کھاکر شکم سیر ہوا تھا، مصنوعی فرار کے انداز سے گذر رہا تھا؛ اور غیض مادرانہ سے بپھری ہوئی، ایک مینا، سادہ لوحی سے، ٹھونگیں مارنے کی کوشش کر کر کے، قوت اور حیلہ کو اپنے زعم میں مجروح کر رہی تھی!

یلدرم

اے کاش تم آجاتے اغیار ہی کو لے کر
کچھ تغیر مرے احوال پریشاں میں نہیں
مری اس سادگی پر رحم کھانا
نظر مدت سے یوں ہے جانبِ در
ہائے کس بزم سے نکالا ہے
عشق کی بے نیازیاں دیکھو

تاجور

کچھ عمر تو گھٹ جاتی گو رنج سوا ہوتا
ایسے عالم میں ہوں جو عالم امکاں میں نہیں
کہ تم سے آرزوئے دل بیاں کی
گئے ہیں وہ ابھی گویا یہاں سے
اے دلِ رشک آشنا تو نے
ہم کو اپنی بھی احتیاج نہیں

(سالک شاگرد غالب)

اگر ہم اپنے دورانِ حیات میں سے تمام افعال و خیالات کا جو ترقی کے لئے غیر ضروری ہیں، غیر مفید ہیں اور جنکی کچھ قدر و قیمت نہیں۔ استخراج کریں تو چند ہی سال میں ہم بہت کچھ فاصلہ طے کر لینگے!

(امیر زادہ ولی احمد خاں)

ناکامی، درحقیقت وقت کو برباد کرنے اور موقعہ کو کھونے کا خمیازہ ہے۔　　"

کسی کام کا معاوضہ، اور زیادہ کام کرنیکی صلاحیت پیدا ہو جانے میں مضمر ہے۔　　"

میرا زینہ

اپنی روح کی چور جیب میں میں نے ایک طے ہونیوالا زینہ احتیاط سے لپیٹ کر رکھ چھوڑا ہے۔ جب روپیہ پیسے کی ضرورت ہو مگر ہٹوا حکام کے وعدوں کی طرح ہو، یا کوئی ناحق مجھے ستانیکی کوشش میں کامیاب ہوتا نظر آنے لگے، یا بیمار ہوں تو میں اپنے اس زینہ کو نکالکر کھیل میں مصروف ہو جاتا ہوں اور یہ کھیل مجھے اس زندگی کے تمام دھندے بھلادیتا ہے۔ میرا یہ عجیب و غریب زینہ کھلتے ہی بڑھنے لگتا ہے اور کہیں کا کہیں پہنچتا ہے۔ میں سیڑھی بہ سیڑھی چڑھتا ہوں مگر پل کی پل میں زمین نیچے دور رہ جاتی ہے۔ بادلوں سے کھیلتا ہُوا انکو رستے سے ہٹاتا ہُوا۔ دن ہو تو سورج کی کسی یکہ و تنہا شعاع کی ڈوری کے سہارے، رات ہو تو کسی تارے کی کرن کو مضبوطی سے تھام کر میں بڑھا چلا جاتا ہوں بار بار کے آنے جانے سے دو چار مقام پر کچھ شناسائی سی بھی ہو چلی ہے اگر کبھی ان میں سے کسی جگہ ٹھیر جاؤں تو لطف مجلس عرصے تک نہیں بھولتا صرف ایک کمی ہے کہ ان سب جگہ بات کرنیکی اجازت نہیں، سنو، دیکھو، سونگھو، چھوؤ، لپٹو مگر کلام نہیں۔ جہاں بات کرنیکا خیال بھی دل میں آیا تو اڑا اڑا دھم۔ زینہ صاحب طے ہو کر جیب میں اور چوٹ مفت میں۔ یا یہ ہے کہ مجھے ان مقامات کی زبان سے واقفیت نہیں شاید زیادہ آؤں جاؤں تو کچھ سیکھ جاؤں مگر اسقدر فرصت کہاں جب گفتگو نہیں تو انسان سنتا کیا ہے؟ سنئے لطیف صدائیں، بزدل سے بزدل کو شجاع بنانیوالے بے لفظ نغمے، شرمیلے سے شرمیلے کو دلیر کرنیوالی سرگوشیاں، وہ دل ہلا دینے والے نعرے جن سے بجلی کا ناطقہ بند۔

میرا زینہ ہمیشہ ایک خاص مقام پر جا کر ختم ہو جاتا ہے میں اُترتا ہوں ادھر اُدھر پھرتا ہوں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ قبلہ رخ ایک عالیشان عمارت (جو کسی بہت عظیم الشان بارگاہ کی محض ڈیوڑھی ہے) کے مقابل پہنچ جاتا ہوں جو باغ اس عمارت کی قدمبوسی میں مصروف ہے اسکے پھولوں کو سونگھتا ہوں، ہونٹوں سے چھوتا ہوں نورانی موتیوں سے لدی ہُوئی زمردیں گھاس سے لپٹتا ہوں۔ وہ بوئے وفا سے معطر گھاس ہمیشہ یہی سمجھاتی ہے کہ پہلے ٹھکانا کرو پھر جی بھر کے تفریح۔ یہ سنتے ہی میں ہمیشہ اس عالیشان عمارت کی طرف بڑھتا ہوں مگر ایک مقدس اشارہ جسکے معنے یہی ہو سکتے ہیں "تمہیں سمجھایا جا چکا ہے۔ اب پھر بتلایا جاتا ہے کہ اجازت نامے کے بغیر تم داخل نہیں ہو سکتے یہ دروازہ تمہارے لئے نہیں کھلیگا تاوقتیکہ تم خود کسی کے بنو یا کسی اور کو اپنا بناؤ" مجھے ہمیشہ واپس کر دیتا ہے۔ میں فوراً اُتر آتا ہوں اپنے زینے کو طے کرکے لپیٹ کر چھپانے لگتا ہوں اور ہمیشہ اسے یہ کہکر مخاطب کرتا ہوں "اے میرے پیارے زینے! میں خود اپنا نہیں بنتا تو کسی اور کو اپنا کیسے بناؤں؟ کاش۔ کاش کوئی مجھے اپنا بنالے" +

"فلک پیما"

میں اس کا بن گیا

اُسکی اور میری گفتگو اِدھر کی اُدھر کی ہوتی رہی مگر اس نے نہ مجھے دیکھا نہ مجھے سُنا۔ کوئی آج کی سرگذشت نہیں تین سال سے برابر یہی ہو رہا ہے،

اس نے کبھی بھی مجھے نہ دیکھا کبھی بھی مجھے نہ سُنا۔

ممکن ہے کسی بڑی بوڑھی کو شاید میرے ہونٹوں کی غیر معمولی خشکی سے، میری آواز کے غیر محسوس لرزہ سے کچھ بھانپنے کا موقع ملا ہے مگر میں جب اسکے حضور میں گیا تو اپنے آپ کو پہلے بالارادہ اچھی طرح دم بخود کر کے، نہیں نہیں، اچھی طرح قتل کر کے لیئے آنکھوں کو یہ کہہ کے کہ اگر شوق کی شعاع تم سے چمکی تو تمہیں پھوڑ دیا جائیگا، زبان کو یہ کہہ کے کہ اگر رسمی بے تعلقی کے فقرات کے علاوہ کچھ نکلا تو کاٹ دیا جائیگا۔ گویا سرکار حسن میں، دائمی باغی بن کر پیش ہُوا۔ گلاب کے پھول کے سامنے بیجان خس کی طرح، قدرت کی گوناگوں دلفریبیوں کے سامنے بے حس دہقان کی طرح۔ نگاہ کبھی نہ اُٹھی۔ ہاتھ کبھی نہ بڑھا۔ دل کبھی نہ دھڑکا۔ دریا سے ہمیشہ پیاسا آیا۔

میں اسکا ہوں وہ کسی کی بھی نہیں

ابھی تک اسے آئینہ دیکھنا بھی نہیں آتا۔ میں نے اسے آنچل سر پر اگلی جانب کو ایک کافر ہاتھ سے کھسکاتے دیکھا ہے۔ وہ کبھی ایک ثانیہ بھی بہ تبسم اس آنچل کے ستم زا خم دیکھنے کے لئے آئینہ کے سامنے نہیں ٹھیری۔ اسے اپنے بالوں کی بغاوت کی شعریت کا کچھ بھی علم نہیں۔ کسی دن یہ ڈھیٹ شوخ، بال اسکے کان میں کچھ کہہ گذرینگے اور کلی پھول بن جائیگی مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ اسکی رعنائی کے گل ہزارہ لاکھوں روزانہ اسکے کمرے میں کھلتے ہونگے مگر وہ دیکھتی تک نہ ہوگی۔ بے پروا مسرف حسینہ گرانبہا دولت کو کس بے خبری سے پھینک رہی ہے۔

وہ خود اپنی بھی نہیں

قدرت نے اسے قد دیا ہے، قد کے ساتھ چال بھی لچک بھی مگر ابھی اسے اٹھلا کے اترا کے ٹھکرا کے چلنا تک نہیں آتا۔ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ فوٹو اُتروانے میں ایک جانب

کو الگ بیٹھ گئی۔ اسے پتہ ہی نہیں کہ وہ اگر کچھ سمٹ کر کچھ مڑ کر کھڑی ہوتی تو کیا کیا قیامت برپا ہوتی۔ اسے میں نے کالج میں مصوری سیکھنے کے لئے کہا۔ اتنا بھی نہ بولی کہ میں تو خود تصویر ہوں بغیر نقاشی جاننے کے دوسروں کو تصویر بنا دیتی ہوں۔ اگر وہ یہ کہدیتی تو مجھے یاد آجاتا کہ ایک دفعہ گاڑی میں سوار ہونے کے لئے جب میرے پاس سے ہو کر نکلی تو میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ برآمدے میں پاؤں گڑ گئے گاڑی تک نہ جا سکا۔ میں اس کا ہوں گو اس قابل نہیں اور اس لئے خدا کرے کہ وہ

کبھی مجھے نہ دیکھے کبھی مجھے نہ سُنے کبھی مجھے نہ سمجھے

کیونکہ مروجہ دنیاوی پیار کی لغت میری لغت نہیں۔ میری زبان اور آنکھیں اور دل اور۔ لوگ عین۔ شین۔ قاف کا سہ منزلہ کاغذی محل بنا کر وصل و ہجر کی لفظی کمند بازی کرتے ہیں۔ ہوا آتی ہے تو نہ وہ لبِ بام نہ وہ کمند۔ کہاں حسن پرستی کہاں یہ بوالہوس؟ میرا چاہنا الگ۔ میرا مرنا الگ۔ میری ساری دنیا الگ۔

چاہتا ہوں، مدت العمر چاہوں گا مگر ہاتھ لگ جانے کے لئے نہیں بلکہ محض اس لئے کہ بے لوث خدمت کا موقع ملے۔ دل، دل کی ہر نیک آرزو اسکی نذر ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ میرا فرض ادا ہو چکا۔ میرا انعام مجھے مل گیا۔

میں اسکا بن گیا

"فلک پیما"

چشمۂ حیات

اپنے دل کو کھود کہ وہاں نیکی کا چشمہ چھپا ہوا ہے وہ چشمہ جس کا پانی پھوٹ پھوٹ کر بہتا رہیگا اگرچہ تو اُسے ہمیشہ ہی کھودتا رہے!

قسمت نے جس دائرۂ حیات میں تجھے پیدا کیا ہے اُس پر قناعت رکھ اور زندگی کی راہ میں جو تیرے ہم سفر ہوں اُن سے سچے دل سے محبت کر!

جیسے تیرے خیالات ہونگے اُسی وضع کا تیرا دل ہوگا کیونکہ رُوح خیالات سے رنگ پکڑتی ہے۔ اِس خیال کو دل میں جگہ دے کہ قسّامِ ازل نے ہر ایک شے کو اُسکی بہبودی کے لئے پیدا کیا ہے اور قسمت جہاں بھی اُسے لے جاتی ہے وہی اُس کے لئے بہترین ہے!

سو اپنی قسمت پر گریہ وزاری نہ کر کہ اس سے تجھے کچھ فایدہ نہ پہنچیگا بلکہ فایدہ اسی میں ہے کہ اگر تو بُرے حال میں ہے تو اپنی قسمت کو بہتر سے بہتر جان!

اگر دوسروں کی خدمت تیرے سپرد ہوئی ہے تو خوش ہو کہ انسان نوعِ انسان ہی کی خدمت کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور یاد رکھ کہ جو شخص اپنے فرائض کو سچے دل سے سرانجام دینے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنا مدعائے زیست پورا کر رہا ہے اور اپنے دل کی بنیادوں پر ایک عالیشان عمارت تعمیر کر رہا ہے جو اُس کے لئے ایک ابدی گھر ہوگا!

عشرت سے پیار نہ کر خدا سے محبت رکھ کہ خدا سے محبت رکھنے والوں کی زندگی سچی عشرت کی گود میں پلتی ہے۔ وہ جو ماسوا سے رشتہ جوڑتا ہے وہ خدا کے سوا سب سے مدد چاہتا ہے اور آخر کار مایوس و ناکام ہی رہتا ہے!

لوگوں کی خدمت خدا کی عبادت ہے۔ اپنی زندگی کو تم جتنا بھی اوروں کی خدمت میں کھو ڈالوگے تم کو اُسی قدر خوشی ملیگی اور تمہارے لئے اک ایسی فصل تیار ہوگی جس کا حاصل دائمی سرور انبساط ہے!

(ماخوذ)　　**بشیر احمد بیگم**

محفل ادب

مُصطفےٰ کمال پاشا

دُنیا جب ایسے لوگوں کی فہرست باترتیب دیگی جنہوں نے تاریخ کے راستے بدل دیئے ہیں۔ تو اسے معلوم ہوگا کہ دُنیا کے جغرافیہ کو بدلنے والے اکثر وہ لوگ ہیں جو صرف اپنی اولوالعزمی وعلوہمتی کے بل بوتے پر خاک سے اُٹھ کر افلاک پر پہنچے یہی لوگ قوموں کے رہنما بنے انہوں نے اپنی تلواروں کی دھاروں اور قلموں کی نوک سے زمانے کے صفحات پر اپنی سوانح عمریاں لکھیں اور اپنے کارہائے نمایاں کی وجہ سے زمانے والوں کے دلوں پر اپنی یاد اس طور پر نقش کر گئے جسے لیل ونہار کی گردش کبھی محو نہ کرسکیگی انہیں حیرت فروز شخصیتوں میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے ترکی قوم میں قومیت کی لہر پیدا کی۔ ترکی قوم کو ازسر نو جوان بنا کر اسکے جنگی شجاعانہ کارناموں کو زندہ کیا۔ اور مشرقی اقوام میں حمیت وطنی اور غیرت قومی کی آگ لگادی۔

المقتطف (مصر)

قوم کا ہر فرد اپنی قوم سے وہی نسبت رکھتا ہے جو نسبت کسی عضو کو جسم سے ہوتی ہے کہ جسم کی حیات وممات پر عضو کی موت وزیست کا دارومدار ہے۔ بنا بریں انسان کا اپنے وطن کی جانب سے مدافعت کرنا گویا اپنی زندگی کی جانب سے مدافعت کرنا ہے۔ اسکے علاوہ جیسا کہ مختلف قبیلوں کے باہمی اختلافات مٹ کر ان میں مشترک حب الوطنی پیدا ہوگئی اسی طرح ایک ایسا زمانہ بھی آنیوالا ہے جب مختلف قوموں کے آپس کے جھگڑے ختم ہوکر قومی طرفداری کی بجائے انسانیت کے لئے محبت کے جذبات پیدا ہوجائینگے مگر افسوس ہے کہ یہ مبارک زمانہ ابھی نہیں آئیگا۔

الہلال (مصر)

پرانے زمانے کو لیجئے۔ اگر کوئی انڈیا آفس لائبریری واقع لنڈن کے ذخائر میں سے اُردو تصانیف کی فہرست اُٹھا کر دیکھے تو سنہ غدر سے پہلے ہندو مصنفین کی تعداد مسلمان مصنفین پر اُسی نسبت سے غالب ہے جو نسبت کہ دونوں کے اعدادِ مردم شماری میں ہم مدت سے دیکھ رہتے ہیں۔ کاش اگر مذہب کا بے تکا اور بے جا سوال زبان کے بارہ میں پیدا ہونا تھا تو سنہ غدر کے بعد سے نہ پیدا ہُوا ہوتا تاکہ ان تعصبات کی وجہ بھی بآسانی ہماری عقل میں آسکتی! آج ہم کیونکر یقین کریں کہ راجہ رام موہن رائے اور اُن سے پہلے راجہ مان سنگھ کے سے فارسی دان ہندوستان ہی کی خاکِ پاک سے اُٹھے تھے۔ امیر خسرو اور عبدالرحیم خانِ خانان انہی مسلمانوں میں سے تھے جن کی نسلیں آج ہندوستان کو اپنا وطن کہہ رہی ہیں۔ یہ دونوں گروہ نہ کسی خاص زبان کے طرفدار تھے نہ کسی متعصب مذہب کے۔ وہ ایک نئے مذہب کی طرح ایک دوسری ہی چیز کی تلاش میں تھے جو دو گروہوں کو قریب تر کرنے میں بار بار کامیاب ہوئی ہے۔ آپس کی غلط فہمیاں دُور کرنا تفرقوں کو مٹانا اور بھائی چارے کو ترقی دینا صرف روشن خیالی معاملہ فہمی اور رواداری ہی سے ممکن ہے!

صلح کل جس کا مسلک ہو اُسے ایک شئے کا دو ٹکڑوں میں زبردستی تقسیم کر دینا ظاہر ہے کہ زبردستی ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایسے آدمی کے گھر میں ظاہری اختلافات کی فہرست پہلے ہی ایک ناقابلِ برداشت ماتم خیز منظر پیش کر رہی ہے۔ اردو اور بھاشا اگر واقعی دو الگ الگ چیزیں ہیں ان میں سے کوئی بھی ہمارے دو گروہوں کے اختلافات کو پرورش کرنے کے لئے پیدا نہیں ہُوئی تھی۔ اُن دونوں میں لوہے اور مقناطیس کی تاثیر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ الغرض یہی نہیں کہ یہ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے بغلگیر کرا دی جائیں۔ بلکہ بغیر مزید ارتباط کے رہ ہی نہیں سکتیں۔ بشرطیکہ ہمارے تعصبات حال ہی کی رفتار سے گھٹتے رہیں۔

لوائے ہند کیمبرج یونیورسٹی (لنڈن)

حصۂ نظم

شاعر

درد کی مٹی سے ہوتی ہے سرشتِ شاعر کلفت و رنج و مصیبت ہے نوشتِ شاعر
غم کا اک لحظہ ہے صد عمرِ بہشتِ شاعر خون کی بوند سے شاداب ہے کشتِ شاعر
اپنی ہی آگ میں منظور اسے جل جانا ہے
شعلۂ گرمئ تاثیر کا پروانہ ہے

کوئی دنیا میں نہیں اس کا سا آزاد منش کوہ و صحرا میں پھرا کرتا ہے مستانہ روش
کھینچتی اپنی طرف اسکو ہے ہر شئے کی کشش ڈھونڈتا پھرتا ہے ہر چیز میں سامانِ تپش
خار کا چبھنا کبھی اس کو ہنسا دیتا ہے
اور کبھی گل کا تبسم بھی رلا دیتا ہے

اک تجلی گہِ صد طور ہے فطرت اس کی ساغرِ جم ہے مگر چشمِ بصیرت اس کی
ایک ہی شئے ہے مجاز اور حقیقت اسکی سارے عالم کا خلاصہ ہے طبیعت اسکی
اس میں ہر رنگ سماتا ہے نمایاں ہوکر
شانِ مستور نظر آتی ہے عریاں ہوکر

وہ جو اک دل شدۂ لذتِ نظارہ ہے کبھی جنگل میں کبھی کوہ میں آوارہ ہے
اہلِ دنیا کی نگاہوں میں تو ناکارہ ہے منبعِ درد ہے جذبات کا فوارہ ہے
ایک آئینہ ہے نیرنگئ عالم کے لئے
ایک پیمانہ ہے تقسیمِ مئے غم کے لئے

گو بظاہر ہمہ تن طالعِ ناساز ہے وہ اور گنبد میں پریشانئ آواز ہے وہ
شاہدِ حسن کا پر زمزمہ پرواز ہے وہ ہمنفس تاروں کا اور چاند کا ہمراز ہے وہ

مے لذت سے جو مدہوش وہ ہو جاتا ہے
آپ بھی وادیٔ نظارہ میں کھو جاتا ہے

ساغرِ فکر سے لیتا ہے وہ مستی اپنی — سوچ کو جانتا ہے بادہ پرستی اپنی
دور دُنیا سے بناتا ہے وہ بستی اپنی — دل میں کرتا ہے بپا محفلِ ہستی اپنی

عالمِ وجد میں مخمور پڑا رہتا ہے
لہجۂ زمزمہ میں کہتا ہے جو کہتا ہے

ساز سے اسکے کبھی زمزمہ خانہ ہے جہاں — جاوداں ایک مُسرّت کا ترانہ ہے جہاں
اور کبھی حسرت و عبرت کا فسانہ ہے جہاں — زندگی خواب ہے اور محض بہانہ ہے جہاں

بات میں خلد کو دوزخ میں جلا دیتا ہے
بات میں ذرّے سے خورشید بنا دیتا ہے

گو وہ ساحل کی طرح بحرِ جہاں میں ہے خموش — دُور سے بیٹھا ہُوا سنتا ہے موجوں کا خروش
دل جگر اسکا ہے سینائے نوا کا آغوش — گیت اسکے ہیں زمانے کے لئے بانگِ سروش

دل میں کرتا نہیں وہ الفتِ دُنیا پیدا
جام کو توڑتا ہے تاکہ ہو مینا پیدا

وہ سفینہ کو نہیں ڈھونڈتا ساحل کیلئے — ورنہ مرہونِ خضر ہوتا ہے منزل کیلئے
ہے جو زندہ تو فقط زندگیٔ دل کے لئے — خود پگھل جاتا ہے وہ گرمیٔ محفل کے لئے

بر لبِ زمزمۂ مہر و وفا ہو جانا
اس کی فطرت ہے اسی دُھن میں فنا ہو جانا

مُسلم بی اے

جذباتِ عالیہ

محروم

باعثِ انبساط ہو آمدِ نو بہار کیا
رنگِ چمن کھائیگا سینۂ داغدار کیا؟

مستِ طرب ہے چھیڑ کر نغمۂ نو بہار کیا؟
اب کے نہ ہو گی دلشکن تجھ سے گل اے ہزار کیا؟

عہد پہ اعتماد کیوں؟ وعدے کا اعتبار کیا؟
رکھیئے امید کس لئے؟ کیجئے انتظار کیا؟

گنبدِ گردباد ہے سر بفلک ہر اک طرف
دشتِ جنوں میں رہ گئی قیس کی یادگار کیا؟

تلخ ہے زیست کس لئے کیجئے تلخ تر اسے
خندۂ گزشتہ کو روئیے بار بار کیا؟

شام وصال سے ہوں کیوں محوِ فریبِ آرزو
یاد نہیں رہی ہمیں صبحِ وداعِ یار کیا؟

آپ ہی مٹ مٹا کے ہم خاکِ رہِ فنا ہوئے
اور مٹائیگا ہمیں چرخِ ستم شعار کیا

طبعِ سخنوری تِلک کانِ گہر سے کم نہیں
سامنے شعرِ تر کے ہے گوہرِ آبدار کیا؟

وقار الاعظم شرف

دیر و حرم کو دل کا نمونہ بنا دیا
کس نے یہ رازِ عشق کا پردہ اٹھا دیا

ہم نے سبھی جواب نکیرین کو دیئے
اپنا پتا دیا نہ تمہارا پتا دیا۔

بجلی سی دل میں دوڑ گئی انکو دیکھ کر
مردہ پڑا ہوا تھا اٹھا کر بٹھا دیا

اب انکو میرے حال پر آنے لگا ہے رحم
تقدیر نے بگاڑ کے مجھکو بنا دیا

تیری تلاش نے مجھے کھویا جہان سے
گمراہیوں میں ڈال کے رستے لگا دیا

اے عندلیب ایک گلوں کی بہار کیا
اس نے ہزار رنگ سے جلوہ دکھا دیا

قبر عدو پہ ہنسنے کی صورت کہاں سے لائیں
وہ آپ تو ہنسے تھے مجھے بھی ہنسا دیا

صیاد کچھ خبر بھی ہے تجھکو بسنت کی
پھولوں نے بلبلوں کو ہنسی میں اڑا دیا

اے شمع دل کا درد تو ہم سے بیان کر
کمبخت تیری بے سخنی نے جلا دیا

دل بیچنے گئے تھے حسینوں میں کل شرف
دامن کسی نے ہاتھ کسی نے بڑھا دیا

احسن مارہروی

ہوائے کوئے قاتل میں بھی ہے انداز نازل کا
کہ ہر ذرہ دکھاتا ہے تماشا رقصِ بسمل کا

عجب نیرنگِ الفت ہے کہ برپا جشن و ماتم ہے
ادھر پائے ہوئے دل کا ادھر کھوئے ہوئے دل کا

ترا دامن تو کہتا ہے امنِ محشر تک اچھلیگا
کہ قاتل خون ہے یہ در کسر کا خون بسمل کا

ہوئی ہے لغزشِ شوق استقامت کی بنا قائم
سکونِ زندگی پابند ہے بیتابیِ دل کا

نشانِ قتل بھی میری طرح مٹنا جو ممکن تھا
کفن کے واسطے دامانِ خون آلودہ قاتل کا

لگا کر آئینے چاروں طرف تنہا وہ بیٹھے ہیں
نیا عالم دکھایا اک خود آرائی نے محفل کا

شرف ہے خاکساروں کی بدولت تاجداروں کو
گہر نے سرفرازی پائی منہ دیکھا جو ساحل کا

کہیں ہوتی ہے احسن انتہا راہِ محبت کی؟
فقط تسکینِ خاطر کے لئے ٹھہرہ ہے منزل کا

اثر صہبائی

دل یاد میں کس کی جو نغمہ سرا ہوا
ہر ذرہ کائنات کا رنگیں نوا ہوا

کیوں جگمگا رہی ہے مری محفلِ خیال
تاروں پہ عکس حسن ہے کس کا پڑا ہوا

قربان تیری شانِ کریمی کے اے خدا
بے دیکھے ایک دل ہے سو وہ بھی بجھا ہوا

جس دل میں موجزن تھی کبھی ہر نئی آرزو
آخر کو رفتہ رفتہ وہ بے مدعا ہوا

بربادیِ اثر پہ ہیں سب لوگ خندہ زن
سوچا نہ کچھ کسی نے کہ آخر یہ کیا ہوا

تقریظات

صلائے عام - دار السلطنت دہلی کا وہ مشہور و معتقدر ماہوار ادبی رسالہ جو کبھی زیر ادارت سیر ناصر علیخاں بہادر شائع ہوا کرتا تھا، ادبی سرد بازاری کے ہاتھوں کچھ دن "وقفۂ زندگی" میں بسر کر کے پھر اسی طمطراق سے رونق بخش نظارہ ہوا ہے۔ پہلے نمبر کے تمام مضامین (سوائے "کوہ کندن و موش بر آوردن" کے) رسالہ کی شان کے مطابق ہیں۔ قابل اڈیٹر کی کوثر سے دُھلی ہوئی زبان میں دلکش نوٹ مضامین کو چار چاند لگا رہے ہیں، معنوی لربائیوں کے ساتھ اسکی باصرہ نوازی نے اسے مجموعۂ خوبی بنا دیا ہے۔ "کوہ کندن و موش بر آوردن" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اڈیٹر صاحب بھی اسے پسند نہیں فرماتے، چنانچہ انہوں نے اپنے نوٹ میں دبی زبان سے غیر محسوس طور پر اس کا اعتراف بھی کیا ہے، سالانہ قیمت چھ روپے ہے، رسالہ کے مضمون نگار بھی قیمت سے بری نہیں ہیں۔
دفتر صلائے عام دہلی محلہ فراشخانہ سے طلب کیا جائے،

ترقی - جناب ابو المکارم صدیقی کی اڈیٹری میں حیدر آباد دکن سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ چھے علمی و ادبی مضامین سے ترقی کا دامن خالی نہیں ہے، بعض مضامین بہت مفید و گرانپایہ بھی ہیں، "کلام غالب کی شرحیں" اس مضمون کی زبان ذرا تلخ ہے، عثمانیہ یونیورسٹی پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی تقریر بہت پُر معلومات اور کار آمد ہے، رسالہ ہونہار ہے، خدا اسے پروان چڑھائے۔ ۲۲ - ۲۶ تقطیع - لکھائی چھپائی خوب اور کاغذ ولایتی۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔
حیدر آباد دکن دفتر ترقی سے طلب کیجئے

انقلاب - مزدوری اور سرمایہ داری کی کشمکش ماسکو کی حدود سے نکل کر اب عالمگیری اختیار کر رہی ہے۔ بولشویکیت مختلف نام رکھ کر مختلف لباسوں میں جلوہ گر ہوا چاہتی ہے، "ہندوستان جسے مزدورستان کہنا بیجا نہ ہوگا اس کا کرۂ ہوائی بھی اس تاثر سے لبریز نظر آتا ہے" "انقلاب" کے نام سے اک روزانہ اخبار ہفتہ واری اور پندرہ روزہ منزلیں طے کرتا ہوا ماہوار رسالہ کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ اسکے اڈیٹر پروفیسر غلام حسین صاحب ایم اے جو مزدوری و سرمایہ داری کی جنگ میں سٹرلر کی غریب فوج کا ساتھ دے رہے ہیں اس رسالہ کو بہت قابلیت سے ترتیب دیتے ہیں۔ سوشلزم و لیبر پالیٹکس سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اسے ضرور خریدیں۔ "انقلاب" مزدوروں کی اصلاح اور انکے حقوق کا واحد نگراں ہے۔ قیمت سالانہ چار روپے فی پرچہ چھ آنہ
دفتر انقلاب لاہور سے طلب کیا جائے

فہرست مضامین بابت ماہ مئی ۱۹۲۳ء

جلد ۳ — حصۂ نثر — حصۂ نظم — نمبر ۵

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذبات عالیہ

جہاں نما

تاریخ قدیم کا اِک ورق۔ انسان پہلے پہل زمین پر کب نمودار ہوا۔ اسکے متعلق سینکڑوں مذہبی اور خیالی روایات تو موجود ہیں لیکن تاریخ نے اس بارے میں بجز چند عام بیانات کے اَور کچھ پیش نہیں کیا، اک زمانہ تھا کہ سائنسدان مذہبی قصّوں کے ہزار برس زندہ رہنے والے پیغمبروں پر ہنستے تھے اور سمجھتے تھے کہ انسان کو کرۂ ارض پر آئے صرف چند ہزار سال ہُوئے ہیں لیکن اب اُنکے خیالات میں شک و شبہ کی گنجائش پیدا ہوتی جاتی ہے اور یہ ظاہر ہونیوالا ہے کہ کسی پیشوا کے ہزار سال عُمر پانیکا مُدعا اک زمانہ یا تمدن خاص کی طرف اشارہ کرنا تھا، اکتیس برس ہُوئے کہ ڈاکٹر ڈوبوا نے جاوہ کے جزیرہ میں ایک انسانی کھوپڑی کے اوپر کا حصہ پایا جسکے متعلق اہل طبیعیات کا اِتفاق ہے کہ وہ کم ازکم پانچ لاکھ برس پُرانا ضرور ہے ۱۹۰۷ء میں بمقام ہائیڈل برگ کسی قدیم انسان کے نچلے جبڑے کی ہڈی ملی اور ۱۹۱۳ء میں پلٹڈن (انگلستان) میں کچھ ہڈیاں پائی گئیں۔ یہ جاوہ والے آدمی سے کچھ بعد کے لوگوں کی سمجھی گئیں۔

اب ڈاکٹر وُلف نے پٹاگونیا کے جنگلوں میں ایک انسانی کھوپری کے اجزا پائے ہیں۔ اسکے بارے میں خیال ہو رہا ہے کہ شائد یہ جاوہ والی کھوپری سے بھی پانچ لاکھ برس پہلے کی یادگار ہو۔ ایک امریکن ڈاکٹر کہتا ہے کہ اگر ایسا ثابت ہوگیا تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائیگی کہ انسان اول اول امریکہ کے براعظم میں نمودار ہُوا تھا۔

ان باتوں کو پڑھ کر شبہ ہونے لگتا ہے کہ جسے ہم دُنیا کا زمانۂ جہالت کہتے ہیں خدا جانے اُسمیں علم و ہنر کی کیسی کیسی شعاعیں نُور پاش تھیں کہ اب مستور ہوگئیں۔ خدا جانے ہم کتنے انجان ہیں جہاں تری ہے وہاں خشکی ہوگی۔ جہاں خشکی ہے وہاں تری ہوگی۔ پہاڑ سمندر کی تہ میں چھپ گئے اور سب سے زیادہ دیر میں پیدا ہونے والی زمینیں سربفلک کوہستان بن گئیں +

حال ہی میں پروفیسر سر آرتھر کیتھ نے سوڈانی نسلوں پر لکچر دیتے ہُوئے کہا کہ زمانۂ قدیم میں صحرائے اعظم اور عربستان اور منگولیا تک کے قطعات سرسبز و شاداب ملک تھے۔ یہی خطۂ زمین دراصل وہ جنت تھا جس سے انسان شدتِ تمازت کی وجہ سے نکل بھاگا + بابل اور مصر ایک نہایت قدیم تمدن

کی نشانیاں ہیں جو اس عظیم الشان خطۂ ارض میں ہزاروں برس تک پھولا پھلا۔ کبھی ہم طبعی نظریات کے ہیر پھیر میں رہتے تھے اب تاریخی تخیلات کی ادھیڑ بُن میں لگے رہتے ہیں ؎

ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

انقلاب منقلب۔ صحیح انقلاب وہی ہے جو ہر وقت منقلب ہو۔ یہ صفت رُوس کے انقلاب میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو جمہوریۂ رُوس کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اُس کے بجائے دُولِ متحدہ جمہوریہ کی بنا پڑی یعنی رُوس کا لفظ حذف کر دیا گیا۔ اے خدا یہ کس ستم رسیدہ ایرانی کی دُعا تو نے قبول کی تھی کہ رُوس کا نام بھی اب صفحۂ ہستی سے محو ہو گیا۔ اس حلقۂ جمہوریہ کی ہر دولت جمہوریہ کو اختیار رہے کہ جب چاہے حلقہ سے نکل جائے۔ اور جو اب اس حلقے سے باہر ہیں اُنکو حق حاصل ہے کہ جب چاہیں اس سیاسی انجمن کے رُکن بن جائیں۔ اشتراکیت کی عالمگیر جمہوریہ اب فقط رُوس کی حدود تک محدود نہیں رہی بلکہ دُنیا بھر کو دعوتِ شرکت دے رہی ہے کہ اے طبقۂ اسفل کے درماندہ لوگو! تمہارے لئے زندگی کی شاہراہ کھُل گئی ہے آؤ اور اپنا حِصّہ لے لو۔

دستاویز حکومت میں مرقوم ہے کہ سرمایہ داروں کی دُنیا نے ہزاروں برس تک قومیت کے تجربے کئے مگر ناکام رہی اُس نے قوموں کی آزادانہ نشو و نما کے ساتھ یہ بھی جاری رکھا کہ انسان کو انسان تباہ و برباد کیا کرے لیکن سوویٹ نے اب قومی تحکم کی بیخکنی کر دی ہے اور نوعِ انسان کیلئے برادرانہ معاونت کا اصول قائم کر دیا ہے۔

بہت سے اختیاراتِ حکومت ایسے ہیں جو اس اتحادِ سیاسی کی مرکزی کانگریس کے ہاتھ میں ہیں مثلاً بیرونی ممالک کو مراعات دینا، جنگ و صلح کا فیصلہ، خارجی معاملات، ریل تار اور ڈاکخانہ، تعلیم صحت اور مزدوری کے عام قوانین۔ کانگرس سال میں ایک مرتبہ منعقد ہوتی ہے اگرچہ مرکزی انتظامی کمیٹی بھی اُس کے انعقاد کا حکم نافذ کرسکتی ہے یا دو جمہوری حکومتیں مل کر اس کا مطالبہ کرسکتی ہیں۔ ایک دار السلطنت مخصوص نہیں بلکہ ہر حکومت کا دار السلطنت حق رکھتا ہے کہ وہاں کانگرس کا اجلاس ہو۔

قوانین میں پیچ و خم نہیں ہوتا بلکہ وہ صاف سیدھے ہوتے ہیں۔ ماسکو والوں نے تین ماہ میں تین ہزار سرکاری افسروں پر رشوت ستانی کے مقدمات چلائے۔ ان میں سے پانچ سو کو

رہا کر دیا گیا اور بیالیسؔ کو گولی سے مار دیا گیا۔ اُن کا خیال ہے کہ اس ظلم کا نتیجہ انصاف پسندی ہوگا۔ ابھی ہمیں سیاسی آزادی کے بہت سے سبق سیکھنے ہیں!

سید القوم خادمہم۔ اکثر حال پسندوں کا خیال ہے کہ دُنیائے اسلام ابھی تمامتر سوئی پڑی ہے یہ درست ہے کہ ابھی ہمارے یہاں زندگی کا نام خواب نہ سہی لیکن بیداری بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ لیکن اس سے کون انکار کریگا کہ اس خوابِ خرگوش میں گاہے گاہے ایسی تحریک کا احساس بھی ہوتا ہے جو خوابِ گراں کی مُہرِ سکوت کو جلد توڑنے والی ہے۔ احساس بڑی شئے ہے اس لئے کہ ہر شئے کا آغاز احساس ہی ہُوا کرتا ہے۔ اسلامی ممالک یکسر متحرک نظر آتے ہیں خواہ وہ آزاد ہوں یا صرف آزادی کے خواب ہی دیکھ رہے ہوں۔ بلکہ صدیوں کے بعد پہلی بار ہم بعض اوقات کوئی نہ کوئی ایسی آواز بھی سُن لیتے ہیں جس سے اسلام کی پہلی روش آئینہ ہو جاتی ہے۔ امیر امان اللہ خاں نے تھوڑی مدت ہُوئی اپنے مشرقی صوبہ جات کا دورہ کرتے ہُوئے ایک زبردست تقریر میں ارکین حکومت سے کہا کہ یہ مناسب نہیں کہ عمائد و رُوساکی آمد آمد میں چھوٹے افسروں اور عوام الناس کی زندگی دوبھر ہو جائے اور سرکاری کاموں اور دُنیوی کاروبار میں رخنہ اندازی ہو پھر کہا کہ "میں اور میرے ہمراہی بھی مقامی نظم و نسق کے پابند ہیں۔ اگر میرے خلاف کوئی دعوے دائر کیا جائے تو میں بخوشی قاضی کے سامنے حاضر ہونے کو تیار ہوں اور سمجھتا ہوں کہ قانون جیسے لوگوں پر ویسے ہی مجھ پر بھی حاوی ہے۔ میں تو افغانستان کا خادم ہوں!"

مانا کہ افغان ابھی میدانِ ترقی میں اور قوموں کی گرد کو بھی نہیں پہنچے لیکن جہاں سے ایسا آوازہ بلند ہُوا ہے وہ ملک بربریت اور جہالت کا دلدادہ نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کی تعلیمی ترقی۔ گذشتہ مردم شماری (۱۹۲۱ء) کے سلسلے میں تعلیمی اعداد کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ ہندوستان کی کُل آبادی اکتیس کروڑ نوے لاکھ سے زائد ہے۔ یعنی دس برس میں صرف بارہ فی صدی کا اضافہ ہُوا۔ کمی افزائش کا سب سے بڑا سبب ۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء کا وبائی انفلوانزا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں خواندہ مردوں کی تعداد ۱۲۹ فی ہزار تھی۔ ۱۹۱۱ء میں ۱۴۰۔ اور ۱۹۲۱ء میں ۱۶۱ فی ہزار تک پہنچ گئی۔ ۱۹۱۱ء میں مدارس و مکاتب میں تریسٹھ لاکھ سے زائد طلبا تھے ۱۹۲۱ء میں تقریباً پونے چوراسی لاکھ۔ بدقسمتی سے بہت سے لڑکوں کو اپنی روزی کمانیکی

فکر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ مدرسے کو جلد خیرباد کہہ دیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر خط لکھ پڑھ نہیں سکتے اور اس لئے محکمۂ مردم شماری والوں کے نزدیک ناخواندہ تصور کر لئے جاتے ہیں +

صوبہ وار دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ برماجہاں کے دیہات میں سکول کثرت سے ہیں۔ سب صوبوں سے بڑھ چڑھ کر ہے اور وہاں نصف سے زیادہ مرد لکھے پڑھے ہیں + بنگال اور مدراس میں پانچواں حصہ خواندہ ہیں اور بمبئی میں کچھ کم +

دس برس میں خواندہ عورتوں کی تعداد تیرہ ۱۳ فی ہزار سے ۲۳ فی ہزار تک بڑھ گئی ہے۔ وسطی صوبہ بہار اُڑیسہ راجپوتانہ کشمیر حیدر آباد اور شمالی ہند۔ ان علاقوں میں خواندہ عورتیں کم ہیں + بڑودہ میں ۲۰ فی ہزار سے ۴۴ فی ہزار تک ترقی ہو گئی اور میسور کوچن ٹراونکور میں حالت اور بھی تسلی بخش ہے چنانچہ ٹراونکور میں جہاں عیسائی کثرت سے ہیں ۱۸ فی صدی عورتیں پڑھی لکھی ہیں حیدر آباد میں ایک فی صدی سے بھی کم +

اب مذہب وار اندازہ کیجئے۔ عیسائی ۲۸۵ فی ہزار خواندہ ہیں یہ اوسط ہندوؤں کی نسبت چوگنی اور مسلمانوں کی نسبت پانچ گنی سے بھی زائد ہے + عورتوں میں عیسائی عورتیں ۲۱۰ فی ہزار پڑھی لکھی ہیں۔ ہندوؤں میں دس سال ہوئے ۵ فی ہزار تھیں اب ۱۶ فی ہزار ہیں اور مسلمانوں میں ۱۹۱۱ء میں ۴ فی ہزار تھیں اور ۱۹۲۱ء میں صرف ۹ فی ہزار + سکھ مرد عورتوں میں دس برس ہوئے ۷۱ فی ہزار خواندہ تھے اب ۸۶ فی ہزار ہیں یعنی خواندوں کی تعداد میں کمی ہو گئی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ سکھوں میں تعلیم کی کمی ہو رہی ہے + گذشتہ چند سالوں میں ہندو کثرت سے سکھوں کی قوم میں شامل ہو گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعدادِ تعلیم میں ظاہرا کمی واقع ہوئی + تعلیم میں نسبتاً مسلمان سب سے پیچھے ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مسلمان سوئے پڑے ہیں۔ وہ بیدار تو ہو گئے ہیں لیکن رفتارِ ترقی ابھی تسلی بخش نہیں!

د۔ ب

نسوانی دُنیا

ہز ہائنس بیگم بھوپال کے تعلیمی و معاشرتی کارناموں سے ہندوستان چھوڑ ساری دُنیا آگاہ ہوچکی ہے حال ہی میں آپ نے منشی اشیاء کی فروخت کو قانوناً ناجائز قرار دیکر قطعی طور پر بند کر دیا ہے۔ اس سے ریاست کو چار پانچ لاکھ سالانہ کا خسارہ ہوگا۔ آپکا خیال ہے کہ باشندوں کی عام بہبودی اور اخلاقی ترقی اس خسارے کو بہت جلد نفع کی صورت میں تبدیل کرسکتی ہے۔ نیز ریاست میں ایک نیا دستورِ حکومت قائم کیا گیا ہے جسکی رُو سے آبادی کے ایک تہائی سے زیادہ حصّے کو حقِ رائے حاصل ہوگا۔ علاوہ بریں ایک انتظامی مجلس وضع کیجائیگی جسکی صدر ہز ہائنس ہونگی۔

برما کی نسوانی کانفرنس نے تجویز کی ہے کہ عورتیں بھی کونسل کی ممبری کیلئے ساعی ہوں۔ وہ قانون کا مطالعہ شروع کریں اور زیادہ جواہرات نہ خریدیں بلکہ اپنا روپیہ قومی کاموں میں صرف کریں +

راجکوٹ کی ریاست میں (جو بمبئی کے شمال میں واقع ہے) ۲۷،۲۰۹ اشخاص کو حقِ رائے دیا گیا ہے جن میں سے ۱۳،۳۰۰ عورتیں ہیں +

ممالکِ متحدہ کی مجلسِ نمائندگان میں ایک نسوانی رُکن نے اس امر کے متعلق مسودۂ قانون پیش کیا ہے کہ شادی کیلئے درخواست کرنیوالوں کے جسم کا طبّی امتحان و معائنہ کیا جائے +

فنستان کے انتخابات میں ۱۹ عورتیں رُکنِ مجلس منتخب ہوئی ہیں +

ایک انگریزی پروفیسر نے مارچ کے شروع میں لندن میں لکچر دیتے ہوئے بیان کیا کہ یونیورسٹی میں ڈگری لینے کا ہمیشہ یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ڈگری یافتہ عورتیں شادی کرنے سے گریز کرنے لگتی ہیں چنانچہ ۱۲،۶۰۷ نسوانی طلباء میں سے جو آکسفورڈ سے کامیاب ہو کر نکلیں صرف ۶۵۷ نے شادی کی +

ٹوکیو میں ایک اعلیٰ پایۂ کی سیاسی کلب (دگکوشن کلب) ہے جس میں چند عورتوں کو حقِ رُکنیت حاصل ہے اُسکی ایک رُکن مس کواموتو نے اک دُوسری رُکن مس کُباشی کو قابلِ الزام ٹھیرایا ہے کہ وہ کلب کے سیاسی جلسوں میں زرق برق پوشاک پہنے مُنہ پر سفیدہ اور لبوں پر غازہ لگائے اس طرح شامل ہوتی ہے گویا وہ کوئی شادی بیاہ کا موقع ہے +

افسوس ہے کہ اخلاق سوزی کا یہ مرض ہندوستان کی بعض خواتین کو بھی لاحق ہوگیا ہے "اے جواناں! بگذارید کہ غیرت برود"

ح ب

ہمایوں

جلد ۳　　مئی ۱۹۲۳ء　　نمبر ۵

جنگل میں ایک شام

جنگل میں ایک شام میں گیا۔ ابھی وہ ساعت نہ تھی کہ سورج ڈوب چکا ہو اور جنگل میں گھپ اندھیرا چھا گیا ہو اور تھکا ماندہ مسافر ڈر رہا ہو کہ نہ جانے اس گنجان مقام میں اُسکے لئے کیا کچھ چھپا ہوا ہے۔

ابھی شام نہ ہوئی تھی لیکن گھنے درختوں میں شام پڑ چکی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح روشنی کو ڈھونڈوں میں ادھر اُدھر گھومنے لگا یہانتک کہ ایک گھومتی ہوئی سڑک پر پہنچا جو خود اس تاریک مقام سے کسی روشن فضا کی طرف جاتی معلوم ہوتی تھی اور اپنی اس آرزو سے نورانی ہو رہی تھی۔ ایک بھولا ہوا مصرعہ مجھے یاد آگیا کہ شائد کسی نے ایسے ہی قطعۂ زمین میں رہ کر لکھا تھا۔

"کہیں دھوپ ہے کہیں سایہ۔ مورکھ جو للچایا"

دیکھو یہ دھوپ اور یہ سایہ بھی کیسی آنی جانی چیزیں ہیں کسی کو قیام نہیں۔ کوئی ایسی ہستی ایسی نہیں ہے جسکی تقدیر ان میں سے ایک یا دوسرے کے ساتھ ہمیشہ کیلئے وابستہ ہوگئی ہو۔ بیسیوں وہ ہیں جو عمر بھر بنے بنائے رستوں پر چلتے ہیں، اُنکے پاؤں کانٹوں کی خلش سے نا آشنا نہیں ہوتے، اُنکی راہ خس و خاشاک سے پاک رہتی ہے لیکن اُنہیں نہیں معلوم کہ اس جنگل اور ان راستوں کا انجام کہاں ہے اور انکے بعد کیا کچھ ہے؟ پھر سینکڑوں وہ ہیں جو برسوں اس گھنے اندھیرے جنگل میں کسی راہ یا پگڈنڈی کی تلاش میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔ کبھی حشرات الارض سے پالا پڑتا ہے کبھی نکیلے کانٹوں سے واسطہ۔ اُنہیں نہیں معلوم کہ تاریکیاں کب ختم ہونگی؟ یہ لوگ سب کے سب جلد جان لینگے کہ دُنیا کی زندگی ہمیشگی نہیں اور تاریکیاں تو سب روشنی میں فنا ہو جاتی ہیں۔ وہ

جو اِن سب کا خالق و مالک ہے، ان سب کے دُکھ سُکھ سے واقف ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ سُکھی سُکھ کو اپنا داتا سمجھ لے نہ یہ کہ دُکھی صابر و شاکر بھی ہو تو چلّا اُٹھے کہ خدا کی مدد آخر کبھی ملیگی بھی؟ کبھی رنج و غم سے کسی کو اپنے پہلو میں جگہ پانیکا حقدار بنا دیتا ہے کبھی لُطف و مُسرّت کے ساتھ کسی کو اپنے سے دُور پھینک دیتا ہے۔ وہ قہرِ ربّانی سے بعید رہ کر سمجھتا ہے کہ بجز میرے کوئی میری زندگی کے بنانے بگاڑنے والا نہیں یہانتک کہ مآل کار اُسے آدباتا ہے کہ اپنے آپکو دھوکا نہ دے!

اب شام ہونیکو تھی۔ مغرب کی سمت فضائے آسمان مٹنے والے دن کی روشنیوں سے معمور تھی اور سڑک پر کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا روشنی کی فانی لہریں ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہی ہیں۔ اتنے میں ایک مسافر کو دیکھا کہ ایک گٹھا کندھے پر اُٹھائے ہوئے جارہا ہے۔ دن ڈھل چکا ہے شام کی گھڑیاں قریب ہیں، اب وقت ہے کہ وہ اپنے گھر کی راہ لے۔ دل نے کہا کہ ایسے ہی جب تیری زندگی کی شام اپنا سائبان پھیلائے جب جوانی کی کہانی بڑھاپے کے جھٹ پٹے میں ختم ہونیکو ہو تو بھی اپنا زادِ راہ لیکر منزلِ مقصود کی طرف چلدینا!

تو کیا انسان کا مقدر یہی ہے کہ اُس آخری شام کا انتظار کیا کرے جس پر زندگی کا آخری دن ختم ہوتا ہے اور اُن تمام شاموں کو فقط اضمحلال ہی میں کھودے جو روز بروز اپنی تاریکی کے ساتھ آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں؟ نہیں! نہیں!! زندگی کی ہر شام اپنے دن کا ایک زرّیں پیام ہے آنیوالی رات کو نیند موت کی بہن ہے، جسکی نامعلوم تاریکی میں ہزاروں خوشنما بھید چھپے پڑے ہیں۔ صبح دن کا بچپن ہے دوپہر اُسکا شباب اور شام اُسکی پیری۔ غروبِ آفتاب موت کی گھڑیاں ہیں اور رات اُن تاریکیوں کو اپنے پہلو میں چھپائے ہوئے ہے جنہیں صرف خدائے لایزال کا نور روشن کرسکتا ہے خالقِ کائنات نے اس تاریک و روشن دُنیا میں ہمارے ہر دن اور ہر رات کو زندگی اور موت کی تصویر بنادیا ہے!

آنکھیں نہیں جو اِس نظارے کو دیکھیں ورنہ ہر روز کیا کچھ ہے کہ ہم نہیں دیکھ سکتے! صبح پیری میں بھی بچپن کا لُطف دیتی ہے۔ دن اپنے پھیلاؤ میں کس قدر وسیع ہے اور کتنے کاروبار کو سرانجام دیتا ہے۔ ہم ہر روز کتنا علم و ہنر سیکھ سکتے ہیں اپنے ہمجنسوں کیلئے خود غرضی سے دُور رہ کر کیا کیا کچھ کرسکتے ہیں؟ دُنیا کو امن کی بستی بناسکتے ہیں کیونکہ حُسنِ عمل کے ساتھ اسکو زینت دے سکتے ہیں! کیا کیا کچھ کرسکتے ہیں لیکن کرتے بھی ہیں تو کتنا کم! شام کیسا سُہانا وقت ہے کیسی شیریں و زرّیں ساعت ہے! روز و شب کا ملاپ ہے محنت و راحت باہم ملتے ہیں کام آرام میں محو ہوجاتا ہے! دن کے کاروبار موقوف ہیں پھر وہ کیا ہے جو ابھی ہمیں کرنا باقی ہے؟ ہم اکثر دن کے کاموں کو اپنے دل و دماغ میں گردش دیتے ہیں اور کبھی بے بنیاد مسرّت میں غرق ہوجاتے ہیں، کبھی رنج و تشویش سے اپنے اعصاب کیلئے سامانِ عذاب پیدا کردیتے ہیں۔

کیا اگر دن بھر ہم سے لغزشیں ہی ہوا کی ہیں تو یہ وہ وقت نہیں کہ ہم اپنی کمزوریوں کے ساتھ اُس قوی و حکیم کی درگاہ میں دست بستہ حاضر ہوں؟ کیونکہ شام ہی وہ گھڑی ہے جب سکون و استراحت کے پھُول آسمان سے برستے ہیں اور زمین والوں کو اپنی رنگینیوں سے مسرور و شاداب کردیتے ہیں!!

د۔ب

ہندوستانی زبان

اس دُنیائے دارالاسباب اور جہان بیت العلل میں جب انسان نے حیوانیت کے ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد انسانیت میں قدم رکھا تو اس نے جتھابندی اور اجتماعی زندگی کی ضرورت محسوس کی بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ احساس ہی حیوانیت محض سے اسکے افتراق و امتیاز کا باعث ہوا بعض انواع وحوش و طیور کی جماعت سما طرز ماندوبود پر اجتماعی زندگی کا اطلاق نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ انکا طبعی فعل اور جبلی عمل ہے جتھابندی اور اجتماعی زندگی کے لئے اعضائے قبیلہ افراد گروہ اور ارکان جماعت کا ایک دوسرے کے ارادوں اور خواہشوں سے واقف ہونا لازمی ہے۔ اس واقفیت کے حصول کا صرف ایک ہی کامل ذریعہ ہے اور وہ زبان ہے اجتماعی زندگی کی غرض و غایت ہے دوسری مخلوقات کے ساتھ جہد للحیات میں انسان کی فتح و کامیابی قوانین قدرت و نوامیس فطرت پر اس کا عبور اور انسانی مفاد بہتری اور ترقی کے لئے ان کا استعمال۔ اجتماعی زندگی کا مدار ہے ہمدردی مشاورت اور معاونت پر۔ اور مشاورت اور معاونت منحصر ہے باہمی خیالات و محسوسات کے معلوم ہونے پر اور دوسروں کے خیالات و محسوسات کے کماحقہ معلوم کرنیکا فقط ایک ہی وسیلہ ہے اور وہ زبان ہے غرض یہ ادنےٰ غور معلوم ہوگا کہ تنازع للبقامیں انسان کی اصلی کفیل اور اسکی نوعی زندگی اور مدنیت کی اول ضامن زبان ہے۔

۲۔ قوم و ملت کی ترکیب عموماً پانچ عناصر سے ہوسکتی ہے اتحاد زبان، اتحاد اغراض سیاسی و معاشی، اتحاد مذہب اور اتحاد نسل اور اتحاد روایات تاریخی۔ مگر قومیت کے ان اساسی اجزا میں سچ پوچھئے تو اصلی کارکن اور عامل صرف زبان ہی ہے۔ کیونکہ افراد قوم میں سیاسی معاشی مذہبی اور اتحاد نسل کے خیالات اور تاریخی روایات کے اشاعت و تبلیغ کا ذریعہ اور ان خیالات اور روایات کے متعلق یکسوئی و یکرنگی پیدا کرنیکا وسیلہ عام زبان کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ مذہب اور سیاسی و معاشی اغراض کا اتحاد انکے اصول و فوائد کے علم کے بغیر ممکن نہیں۔ اس علم اور اسکے ساتھ دوسرے تمام انسانی علوم کی حامل و خزینہ دار زبان ہی ہے سچ تو یہ ہے کہ کسی انسانی گروہ کے

جس پر قوم کا اطلاق ہو سکے قیام کا بغیر ایک عام زبان کے خیال ہی نہیں ہو سکتا۔ اتحاد نسل
درحقیقت قومیت پیدا کرنے کے لئے ضروری نہیں۔ آج دنیا میں کوئی متمدن قوم ایسی نہیں
ہے جو اتحاد نسل رکھتی ہو یا اسکی مدعی ہو۔ ہاں عام تاریخی روایات نے اتحاد نسل کا اعتقاد
کسی کسی قوم میں پیدا کر دیا ہے اتحاد زبان اور اتحاد اغراض سیاسی و معاشی کی مجموعی قوت اتحاد
مذہب کے عنصر کو بھی غیر ضروری قرار دے سکتی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی نئی امریکن قومیت
بغیر اتحاد مذہب کے پیدا ہوئی ہے اور عہد جاہلیت میں عرب باوجود اختلاف مذہب کے ایک
قوم کہلاتے تھے تاریخ ایسی قوم کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے جس کے اجزا ترکیبی میں ایک سے
زیادہ زبانیں شامل ہوں۔ ہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اتحاد زبان اور اتحاد اغراض سیاسی و معاشی
نے افتراق نسل اور اختلاف مذہب کے باوجود ایک قومیت کو پیدا کیا۔ جیسے قدیم زمانے میں
رومی قومیت کی توسیع اٹلی کے دوسری اقوام پر۔ اور موجودہ عہد میں ریاستہائے متحدہ امریکہ
کی مخلوط النسل اور مختلف المذاہب قومیت۔ یہ صحیح ہے کہ اتحاد مذہب سے ایک نئی قومیت
کے پیدا کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور قومیت کا قوام بہت جلد اور آسانی سے تیار ہو سکتا ہے
مگر اس کا وجود اس قوام کی تیاری کے لئے لابدی نہیں ہے۔ جیسے انگریز قوم کہ اتحاد مذہب کے
اثر سے اسکے مختلف النسل اور مختلف الالسنہ اجزا ایک عام قومیت میں بہت جلد جذب
ہو گئے مگر انگریزی قومیت کی بنا اتحاد زبان اور اتحاد اغراض سیاسی و معاشی پر رکھی گئی ہے
جہاں زبان کا کامل اتحاد نہ ہو سکا وہاں مذہبی سیاسی و معاشی اغراض کی یگانگت کے باوجود
مکمل قومیت پیدا نہ ہو سکی اس کی اچھی مثال سابق شہنشاہی روسی قومیت ہے روس کی شہنشاہیت
کے فنا ہونے پر ملک روس میں مختلف قومی سلطنتیں قایم ہو گئیں جیسے بالشویک روس
اوکرین استھونیا وغیرہ اسکی وجہ منجملہ اور وجوہات کے یہ بھی ہے کہ ان علاقوں اور قوموں کی زبانیں
فنا نہ ہونے پائی تھیں۔ پول قومیت تو سراسر زبان ہی کی وجہ سے آج دنیا میں قایم ہے۔ ورنہ
جرمنوں اور روسیوں نے ہر ممکن طریقہ سے اسکے فنا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ قومیت کی
اصلی بانی زبان ہے زبان کی پیدائش کیونکر ہوئی ہو گی اوپر بتلایا جا چکا ہے انسانی گروہوں اور
جماعتوں کا سنگ بنیاد خاندان ہی ہو سکتے ہیں ایک ہی خاندان یا ایک محدود رقبہ کے اندر

رہنے والے اور ضروریات زندگی کے لئے روزانہ باہم ملنے والے متعدد خاندانوں میں جو در اصل ایک ہی خاندان کی شاخیں ہونگی تبادلہ خیالات مشاورت اور معاونت کے لئے جب زبان پیدا ہوئی ہو گی تب اسکے واضعین کو ضرور خیال رہا ہوگا کہ وہ ایک ہی نسل سے ہیں اور ایسا خیال واقعات پر مبنی تھا بھی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قومیت کے لئے اتحاد نسل یا کم از کم ہم نسلی کا اعتقاد ضروری ہے مگر یہ عقیدہ نفس انسانی کا خود ساختہ فریب ہے کیونکہ دنیا کے مختلف متمدن قوموں کے تدریجی ترکیب و تقویم کی تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک بھی قوم اتحاد نسل کو قایم نہ رکھ سکی تاریخ بتلاتی ہے کہ ہمیشہ زبردست جماعتوں نے کمزور جماعتوں کو اپنا محکوم و غلام بنالیا ہے اور بالآخر ان کو اپنے میں جذب کر لیا ہے پھر نسل کی اصالت کہاں باقی رہی دنیا کی متمدن قومیں تمامتر مختلف النسل اجزا ہی سے مرکب اور ممزوج ہوئی ہیں جیسے انگریز امریکن مصری ایطالوی عثمانی ترک وغیرہ چونکہ زبان حاکم و غالب قوم ہی کی قایم رہتی ہے اس لئے وہ مرکب جماعت اس غالب جماعت کے نام سے پکاری جاتی ہے غرض ماننا پڑیگا کہ قومیت کی اصلی بانی اور اس کی سچی مشخص زبان ہی ہے۔

بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہم مذہبی قومی خیالات پر غالب نہ ہو سکی بلکہ قومی یگانگت کے خیال نے مذہبی اتفاق کو بے اثر کر دیا جیسے عیسائی عربوں نے بعض وقت دولت روبیہ مشرقیہ کے خلاف جو انکی ہم مذہب تھی مسلم عربوں کی طرفداری کی ہے مصری عیسائیوں نے رومی عیسائیوں کے خلاف اسلامیوں کی مدد کی ہے یہاں سبب امداد ہم قومی نہیں بلکہ سیاسی فواید کا یقین تھا ترکوں اور عربوں کی ناموافقت اسلام کے عہد زریں میں فتنہ شعوبی وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں مختصر یہ کہ قومیت کے لئے نہ اتحاد نسل کی ضرورت ہے اور نہ اتحاد مذہب کی۔ اتحاد زبان سے قومیت پیدا ہوتی ہے اور سیاسی و معاشی اغراض و مقاصد کے اتحاد سے اسکی تکمیل ہوتی ہے۔ بشرطیکہ یہ اتحاد ایک کافی عرصہ تک قایم رہے اور کوئی دوسرے مخالف اور تفریقی اثرات نہ پیدا ہوں۔

بانئ اسلام کے وہ مشہور الفاظ جو آنحضرت صلعم نے یہود و مشرکین مدینہ و حوالی مدینہ کے ساتھ عہدنامہ میں استعمال کئے تھے کہ آؤ ہم اور تم مل کر ایک قوم بن جائیں اس نظریہ کا کہ قومیت

کے لئے ہم مذہبی ضروری نہیں ایک زبردست ثبوت ہے۔

۳۔ نوع انسانی کی گروہوں جماعتوں جرگوں اور قوموں میں تقسیم و تفریق کے اسباب ماقبل التاریخ عہد میں خواہ کچھ بھی کیوں نہ رہے ہوں مگر اب تو ان کی شناخت و تمیز کے فقط دو ہی معیار ہیں۔ اختلاف زبان اور اختلاف ساخت جسمانی۔ نوع انسانی کی اس تقسیم و انشعاب نے انسانیت کو ہمیشہ نقصان پہنچایا ہے اور پہنچا رہی ہے۔ اپنے دور وحشت میں جبکہ انسانی قانون بقائے اصلح کے ماتحت کائنات کی حکومت کے لئے دوسری مخلوقات سے برسرِ پیکار اور مصروف و مار تھا اس وقت اس نے نوعی اتفاق اور صنعتی اتساق کی ضرورت سمجھی اور اسکی برکت سے کماحقہ فایدہ اُٹھایا۔ قدیم و جدید تمام تمدن اس اتفاق و اتساق کے عملی نتائج و آثار ہیں مگر افسوس ہے کہ دوسری مخلوقات کو مغلوب و محکوم کرلینے کے بعد انسان نے اپنی ہی نوع پر تسلط و استیلا کی کوشش شروع کی اور دنیا کی تمام تاریخ اس ناپاک کوشش اور اس کے ناپاک ترحصول کی داستان ہے۔ اس خانہ جنگی نے جس کا سلسلہ موجودہ دور تہذیب و شائستگی میں بھی بند نہیں ہوا ہے انسانیت کی ارتقا میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں کیونکہ وہ طاقت جو جارحانہ و مدافعانہ اپنی نوعی حفاظت و ترقی کے لئے استعمال ہوسکتی تھی مجادلہ و تنازع میں صرف ہونے لگی۔

۴۔ انسان کی ابتدائی اجتماعی زندگی کا سنگ بنیاد زبان ہی تھی۔ اب نوع انسانی کی تقسیم و انشعاب کی ذمہ دار اختلاف ساخت جسمانی کے بعد جس میں رنگ بھی شامل ہے اختلافِ زبان ہی ہے۔ اختلاف ساخت جسمانی کا ازالہ قریب قریب ناممکن ہے۔ جب تک ارضی اور موسموں کی موجودہ حالت کرہ زمین کی مختلف سطحی ہیئت اور ان قدرتی اسباب و عوامل کے تابع انسان کی گوناگونی اور متفاوت الاثر کیفیت قایم رہیگی تب تک انسانی جسم کی ساخت و بناوٹ کے اختلاف کا مٹنا مشکل ہے بعد مسافت مشکلات رحلت تکالیف سیاحت جو قدیم و متوسط عہود میں بلکہ قریب زمانہ تک مختلف انسانی جماعتوں کے اختلاط و ارتباط میں حائل و مانع تھیں انکو اب انسان نے برق کی امداد سے جلادیا اور بخار کی تائید سے دھواں بناکر اڑادیا ہے۔ اور آج ایک دو دس بیس افراد نہیں بلکہ ایک سالم جماعت دوسری سالم جماعت سے بالتمام مرافقت و موانست پیدا کرسکتی ہے۔ کثرت اختلاط اور تکرار ارتباط کا نتیجہ یہی نہیں

کہ مختلف قوموں کے درمیان مسالمت مرافقت اور موانست پیدا ہوگی بلکہ ایک کافی عرصہ کے بعد بین الازدواجی تعلقات قایم ہو جائیں گے جو بتدریج اتحاد زبان اور زاں بعد اتحاد قومیت کا پیش خیمہ ثابت ہونگے۔

نوع انسانی کی موجودہ لسانی وصوری تفریق وتقسیم کے اثرات کو زائل یا کم کرکے آپس کی قومی اختلافات کو مٹانا اور اسکے ابتدائی توحد دیکرنگی پیدا کرنے کی کوشش کرنا انسانیت کی بہترین خدمت اور انسان کا اعلیٰ ترین عمل ہوگا توحد و یکرنگی سے مقصود ہے کہ باہمی خانہ جنگی کا استیصال اور تمام قوائے انسانی کا ارتقائے انسانیت کے لئے استعمال برق و بخار و نور و حرارت نے اپنے گوناگوں اور کثیر المظاہر خواص وصفات کی مقبوضانہ حیثیت اور مفتوحانہ حالت میں انسان کے لئے وقت اور فاصلہ کے تمام حجابات وحائلات کو تقریباً رفع کردیا ہے اور عام اختلاط وارتباط کے لئے بیحد آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ایک عام زبان کے اختیار کرنے سے اس اختلاط وارتباط کے لازمی نتائج وفوائد بہت جلد حاصل ہو سکتے ہیں۔ مگر دنیا کے تمام اقوام وملل کے لئے ایک عام زبان کا اختیار کرنا فی الحال دائرہ امکان سے باہر نظر آتا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کرۂ زمین کے مختلف حصّوں میں جو بے شمار غیر مکمل زبانیں بولی جاتی ہیں انکی تعداد کم کرکے چند کامل زبانیں رائج کی جائیں۔ اور اس طرح بجائے لاتعداد کم زور قوموں کے صرف چند طاقتور اور خود مختار قومیں بنائی جائیں۔ آئندہ جنگوں کے موقوف کرنے کا اس سے معقول تر دوسرا کوئی بندوبست نہیں ہو سکتا۔ جنگ لازمی نتیجہ ہے۔ طاقتور قوموں کے جوع ارضی اور کمزور قوموں کو اپنے فائدہ کے لئے محکوم ومطیع بنانے کی ظالمانہ خواہش کا۔ اس خواہش کا انسداد جذبات عدل وانصاف ہمدردی سے نہیں ہو سکتا اس ناجائز خواہش کو صرف خوف ہی قابو میں رکھ سکتا ہے شکست پانے اور نقصان اُٹھانے کا خوف اور یہ خوف حریف مقابل کے جارحانہ و مدافعانہ قوت اور حربی طاقت سے ہی پیدا ہوتا ہے کمزور قوموں کا وجود ہی جنگ کا محرک ہے کمزور قوموں کو دوسری طاقتور قوموں میں بتدریج مصالحانہ ذرائع سے جذب کرنا جنگ کے امکانات کو زائل کرنا ہے۔ ان مصالحانہ ذرائع میں سب سے زبردست ذریعہ تعمیم زبان ہے۔

کسی مُلک اور اسکے باشندوں میں وہی زبان عام طور پر رائج ہو سکتی ہے جو اس کے

ایک کافی حصہ کی مادری زبان ہے اور اس ملک کے مختلف علاقوں میں بولی یا سمجھی جاتی ہے اس کے سوا وہی زبان مختلف قوموں کی عام زبان ہو سکتی ہے جو انکی قومی روایات مذہبی خیالات اور خصوصی احساسات کے ادا کرنے کی قابلیت رکھتی ہے۔

۵۔ ازمنۂ ماضیہ میں زبان کا اتحاد مختلف امتوں اور قوموں کے جذبۂ انسانیت خواہی اور مسالمانہ و مصالحانہ رجحانات پر مبنی نہ تھا۔ اور نہ انکے میل ملاپ اور باہمی رضا و رغبت کی پیداوار تھا۔ بلکہ اسکے وجود کی بنا زیادہ تر فاتحانہ اور غالب قوت پر رہی ہے۔ مگر کرۂ زمین پر ایک ملک ایسا بھی ہے جہاں ایک عام زبان بغیر کسی سلطنت یا جماعت کی خاص کوشش کے پیدا ہو چکی ہے اور اس طرح گویا خود قدرت نے ایک نادر موقع اتحاد زبان کے ذریعہ ایک کامل قومیت کے بنانے کا دیا ہے میری مراد ہندوستان اور اردو زبان سے ہے۔

ہندوستان صدیوں سے مختلف النسل مختلف المذاہب اور مختلف السنہ انسانی جماعتوں کا مسکن ہے خوش قسمتی سے یہاں کے باشندوں میں انگریزی راج کی بدولت اغراض سیاسی و معاشی کا اتحاد پیدا ہو گیا ہے اور ایک عام زبان اردو بھی پیدا ہو چکی ہے ایک عام قومیت کی تکمیل کے لئے اتحاد زبان کی کمی رہ گئی ہے جس کا بہ تعجیل پورا کرنا ہی خواہان ملک اور محبان وطن کا فرض ہے۔

۶۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو ہندوستان کے باشندوں اور پورے ملک کی عام و قومی زبان ہونے کی صحیح صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ مختلف الالسنہ جماعتوں کی عام زبان ہونے کی اہلیت صرف اسی زبان میں ہوتی ہے جو ان مختلف جماعتوں کے قومی روایات مذہبی خیالات اور خصوصی احساسات کو آسانی سے ادا کر سکتی ہے۔ یہ قابلیت اردو میں بمقابلہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے بدرجہ احسن موجود ہے۔

اردو ثمرہ ہے ہندوستان کے مختلف النسل مختلف المذاہب اور مختلف الالسنہ جماعتوں کے ارتباط و امتزاج لسانی کا جسکا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ زبان عموماً اس کے بولنے والوں کی ذہنی اخلاقی و روحانی درجات کی مظہر اور انکی تہذیب و شائستگی کی کاشف ہوتی ہے اس اصول کے ماتحت اردو زبان بھی اپنے ماخذ زبانوں کے بولنے والوں کے ارتقائے

دماغی و روحانی اور انکے مختلف مدارج تمدن کی حالت ہے۔ اس کا ثبوت ہے اُردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ کا وجود اور استعمال۔ اور الفاظ کیا ہیں خیالات و محسوسات مشخصہ۔ اور اُردو میں جدید مذہبی فرقوں کے عقائد و دستورالعمل زندگی کی تدوین۔ یہ جدید مذہبی فرقے یا بالفاظ دیگر علیحدہ مذاہب دراصل قدیم مذاہب سے مقتبس و ماخوذ ہیں جو نتیجہ ہے ان مذاہب کے پیروؤں کے اختلاط و ارتباط کے غائر مطالعہ کا۔

اُردو میں ایرانیوں ترکوں عربوں حبشیوں اور مختلف اقوام ہنود کے قومی و مذہبی تخیلات یا انکے آثار و علائم بصورت اصلی یا تبدیل ہیئت موجود ہیں۔ اسلام کے مذہبی علوم اُردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ عیسائیت و یہودیت کے متعلق بوجہ دعاۃ و مبلغین عیسائیت کے علمی و عملی سرگرمیوں کے اردو میں کافی معلومات مل سکتے ہیں۔ آریہ سماج۔ دیو سماج اور دوسرے جدید ہندو فرقوں کے مجاہدانہ اور مبلغانہ مساعی اور علمی کوششوں کی بدولت اور صوفیائے کرام کے طفیل فلسفہ ویدانت اور ہندوستان کے دیگر سلاسل فلسفہ اور ہندو و بدھ مذاہب کے متعلق اُردو میں کافی مواد پیدا ہو گیا ہے۔ کسی دوسری ہندوستانی زبان میں اسلام و عیسائیت کے متعلق اس قدر معلومات فراہم نہیں ہوئے ہیں۔ علوم جدیدہ و فنون حدیثہ کی ترجمانی میں بنگالی کے بعد اردو کسی دوسری ہندوستانی زبان سے پیچھے نہیں۔ اُمید ہے کہ خسرو دکن کی دور اندیشانہ فیاضی اور نتیجہ خیز علم دوستی کے صدقہ میں جس نے جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کی حسین و جمیل صورت اختیار کی ہے اُردو بہت جلد بنگالی کو پیچھے چھوڑ دے گی ہندوستان کے ایک بڑے حصہ میں مروجہ مالی و ملکی اصطلاحات و مخصوص الفاظ کی لغات تمامتر فارسی اور عربی سے ماخوذ ہے۔ ہندوستان کی قدیم و مقدس زبان سنسکرت کے سوا اُردو ہندوستان کے باہر کی دو زندہ اور قدیم زبانوں یعنی عربی اور فارسی کے جو دنیا کے قدیم ترین متمدن قوموں اور انکی سرزمینوں کی وارث ہیں علمی ترقیوں اور مشغلوں سے مستفید ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے دوسری ہندوستانی زبانوں کے لئے یہ راہ استفادہ مسدود ہے۔

اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ اُردو کی پیدائش ہندوستان میں مختلف قوموں کے صدیوں کے میل جول اور فرقوں کے ربط و ضبط سے ہوئی ہے اور اس لئے وہ کسی خاص قوم سے منسوب

نہیں کیجا سکتی۔ اپنی پیدائش کے تین چار صدیوں تک وہ گھریلو اور بازاری بول چال کا درجہ رکھتی تھی۔ سرکار انگریزی کی دستگیری اور بالائی ہندو دکن کے تعلیمیافتہ باشندوں کی تفریحانہ علمی مشغلوں اور مقالانہ مذاق شاعری نے اسکو زبانوں کی صف میں جگہ دلوائی۔ مندرجہ ذیل واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو ہندوستانی مسلمانوں کی قومی یا خصوصی زبان نہیں ہے۔

(۱)۔ اردو آزاد اسلامی ہند کی دفتری زبان نہ تھی۔

(۲)۔ انگریزی سلطنت کے استحکام اور سرکار انگریزی کے اُردو کو اپنے ممالک محروسہ کے ایک بڑے حصّہ کی دفتری زبان قرار دینے کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہندوستان کی مسلمانی ریاستوں کی زبان فارسی رہی ہے۔

(۳)۔ انگریزی حکومت اور حکّام کی توجہ سے اُردو میں علمی شان پیدا ہو جانے کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں نے گویا بطور صدائے احتجاج فارسی میں تصنیفات کی ہیں حالانکہ ان تصنیفات کے اول مخاطب انکے اردو بولنے والے ہموطن ہیں۔ ایک دو نسل آگے کے مسلمان اہل قلم اُردو میں لکھنا کسر شان سمجھتے تھے۔ اس کا اس عہد کی تصنیفات میں اکثر اظہار ہوا ہے۔ خانگی خط و کتابت بھی فارسی میں کیجاتی تھی۔

(۴)۔ مسلمانوں کی دینی تعلیم ابھی تک فارسی عربی میں ہوتی ہے عربی تو ناگزیر ہے۔ کیونکہ وہ اسلام کی مذہبی زبان ہے مگر فارسی تو غیر زبان ہے۔

اُردو کو مسلمانوں کی مخصوصی زبان سمجھنا تاریخ کو جھٹلانا ہے اور اسکے نشو و نما میں غیر مسلم یا ہندو اصحاب علم و ارباب قلم نے جو زبردست حصّہ لیا ہے اُسکو بالکل نظر انداز کرنا ہے اُردو کی پیدائش مختلف ہندوستانی اقوام کے میل جول سے ہوئی اور اس کی ترقی و اشاعت میں ہندو مسلمان۔ سکھ۔ عیسائی ہر مذہب کے پیرؤں نے حصہ لیا ہے۔ اردو کا وجود علم الاقوام و علم الالسنہ کے اس نادر مسئلہ کا ثبوت ہے کہ مختلف النسل مختلف المذاہب اور مختلف الالسنہ جماعتوں کے دوستانہ میل جول اور برادرانہ ربط و ضبط سے اور بغیر فاتحانہ تقدم و ترجیح اور حاکمانہ مساعی کے ایک نئی عام زبان پیدا ہو کر اتحاد لسانی کی محرک ہو سکتی ہے صحیح معنوں میں کل ہندوستان کی عام زبان ہونے کا حق صرف اُردو ہی کو پہنچتا ہے۔ باقی تمام مروجہ

زبانیں مختلف صوبوں کی زبانیں ہیں۔ اُردو کی مخلوط اللسانی بنیاد اور اسکی روز افزوں عمومیت سے انکار کرنا نہ صرف واقعات کی تکذیب کرنا ہے بلکہ نو پیدا ہندوستانی قومیت کی تکمیل و توسیع کے راستہ میں روڑے اٹکانا ہے۔

۷۔ اب رہا رسم الخط کا اختلاف۔ آخر ہندوستانی زبانوں کے رسم الخط کے سامی الاصل ہونیکا بھی ایک نظریہ ہے جو اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو ابھی تک معرکتہ الآرا ہے۔ اشوک اعظم کے بعض کتبے سامی رسم الخط میں پائے جاتے ہیں جو کافی ثبوت ہیں۔ اس واقعہ کا کہ ہندؤں کے عہد زریں میں بھی ہندوستان کی بعض قوموں میں سامی رسم الخط مروج تھا۔ اُردو کا سامی الاصل رسم الخط بر اعظم ہائے ایشیا۔ افریقہ اور یورپ کے وسیع علاقوں میں مستعمل ہے بلکہ امریکہ میں بھی جہاں عربی گو حبشیوں اور شامی عیسائیوں کی خاص تعداد آباد ہے۔ دنیا کی کل اسلامی اقوام میں عربی یا اردو رسم الخط رواج پار ہا ہے۔ عربی اور اُردو حروف کی کتابت میں بالکل ہی خفیف فرق ہے۔ عربی حروف کا واقف اُردو حروف اچھی طرح پہچان سکتا ہے۔ آج دُنیا کی کوئی قوم اور کرہ زمین کا کوئی ملک دوسری اقوام اور دوسرے مُلکوں سے قطعی علیحدگی اور بیگانگت کی حالت میں نہیں رہ سکتا لامحالہ دوسری قوموں اور مُلکوں سے تجارتی معاشی وسیاسی تعلقات قایم کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر کوئی قوم اور کوئی مُلک اپنی خود پسندی اور سیر حاصلی سے گوشۂ تنہائی کو پسند بھی کرے تو بین الاقوامی تعلقات کی آفت سے نہیں بچ سکتا۔" ورنہ ستانی بہ ستم میرسد" کا مصداق ہوگا۔ بین الاقوامی تعلقات صحیح قومی زندگی کے لئے لازمی ہیں عہدِ حاضرہ کے سیاسی واقعات وملی سانحات کی رفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی یا اُردو رسم الخط والی اقوام کے لئے ایک جدید شاندار مستقبل طلوع ہونے والا ہے بلکہ طلوع ہو چکا ہے ہندوستانی مسلمانوں کو ان اقوام سے اتحاد مذہبی حاصل ہے۔ اس اتحاد کے اثر و نفوذ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے بھی مناسب ہے کہ ان اقوام سے برادرانہ تعلقات پیدا اور مستحکم کئے جائیں رسم الخط کا اتحاد ان تعلقات کو پائدار اور مضبوط کریگا۔ لہذا ہندوستان کا ناگری رسم الخط کو اختیار کر کے جہاں کہ اس رسم الخط کو بھی عمومیت حاصل نہیں ہے ہمسایہ ممالک اور اقوام سے علمی علیحدگی اور قطعی استثنائیت کی حالت پیدا کرلینے کے بجائے زیادہ مناسب ہے کہ ہمسایہ اقوام کے رسم الخط کی برادری میں شامل ہو جائے۔ بنگالی تلنگی تامل

وغیرہ زبانوں کے بولنے والوں کو ناگری حروف کا سیکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اردو حروف سیکھنا۔

۸۔ اُردو کی عام مقبولیت اور ہر دلعزیزی اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ بغیر مسلمانوں یا کسی منظم جماعت کی ساعی کے ہندوستان کے غیر اُردو بولنے والوں میں بتدریج پھیل رہی ہے مختلف حصص ہند کے سیاحوں سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ غرض بمقابلہ ہندوستان کے دوسری زبانوں کے اُردو کُل ہندوستان کی عام و قومی زبان ہونیکی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے اور زیادہ آسانی سے اسکی اشاعت ہوسکتی ہے۔ چونکہ انگریزی راج کی بدولت ہندوستان کی کُل اقوام میں اغراض سیاسی و معاشی کا اتحاد پیدا ہوگیا ہے اُردو کی اشاعت و ترقی سے کامل اتحاد لسانی حاصل کرنیکی باقاعدہ کوشش ہونی چاہیئے۔ تاکہ جدید ہندوستانی قومیت کی تکمیل ہو جائے۔

اُردو کو کُل ہندوستان کی عام و قومی زبان بنانے اور اسکی ترقی و اشاعت کے لئے مندرجہ ذیل نظامِ عمل مفید و کار آمد ہوگا۔

۱۔ ہندوستان کی کُل زبانوں میں اُردو آموز رسالے تیار کرنا تاکہ ہر شخص اپنی ہی زبان میں اُردو سیکھ سکے۔

۲۔ اُردو کے حروف تہجی اور کتابت میں ضروری اصلاح کرنا۔ جیسے ہ کے ساتھ دوسرے حروف کی ضم شدہ آواز کی کتابت۔ معروف و مجہول حروف علت کی کتابت کی تفریق وغیرہ

۳۔ اردو میں ٹائپ رائٹر اور شارٹ ہینڈ جاری کرنا۔

۴۔ اُردو میں ٹائپ کا رواج دینا۔

۵۔ اُردو میں قومی ڈراما تیار کرنا۔ ہندوستان کے ہر قوم کی شاندار ماضی کے سبق آموز واقعات اور قابل تتبع سانحات کے ناول اور ناٹک اُردو میں لکھنا اور ان ناٹکوں کا کھیل کرانا

۶۔ ہندوستان کے عظمائے رجال کے سوانحات عمری تلاش کر کے عام فہم اُردو میں شائع کرنا۔ خاصکر ایسے بزرگوں کی سیرتوں کی ضرورت ہے جنہوں نے اپنے اقوال و اعمال سے ہندو مسلمانوں یا ذاتوں اور فرقوں کے اختلافات کم کرنیکی مبارک کوشش کی ہے اور نفس انسانی کی شرافت اور تقدس کی تعلیم دی ہے۔ جیسے اکبر۔ دارا ملکِ عنبر دادو۔ بابا نانک کبیر داس وغیرہ

۷۔ ان مشاہیر کے حریت آموز۔ ایثار زا حب وطن خیز اعمال واقوال کو سلیس اُردو اور دلکش دھنوں میں نظم کرنا تاکہ ہر کس وناکس انکو ہر جگہہ گا بجا سکے۔ اس طرح کہ ہماری سوسائٹی کا ہر طبقہ ان کے کارناموں سے واقف ہو جائے۔

۸۔ قومی گیت اور لوریاں بنانا۔

۹۔ کامل لغات اور انسائیکلو پیڈیا تیار کرنا۔ ضرب المثل اور محاورات جمع کرنا۔

۱۰۔ اُردو زبان میں شروع سے لے کر ابتک جو نثر و نظم کی کتابیں لکھی گئی ہوں انکو جمع کرنا۔ خالص اُردو کتابوں کا ایک بڑا مرکزی کتب خانہ قایم کرنا جسکی شاخیں بتدریج تمام شہروں اور قصبوں میں پھیلائی جاسکیں پرانی کتابوں میں سے مفید کتابوں کو چھاپ کر شائع کرنا۔

۱۱۔ مختلف صوبجات ہندوستان کے اردو ٹکسٹ بکس کی اصلاح کرنا از روئے زبان اور از روئے مضامین۔ اور اُردو میں تمام علوم و فنون کی ابتدائی کتابیں لکھنا اور شائع کرنا۔

۱۲۔ تمام اردو مصنفین و مؤلفین کو ایک رشتۂ معاونت و رفاقت میں منسلک کرنا۔ اسکی بڑی ضرورت ہے۔ اہل قلم گویا قومی دماغ کے اجزاء ہوتے ہیں۔ ان اجزاء کا انتشار ظاہر ہے کہ دماغ کو اپنے وظیفہ طبعی کے ادا کرنے سے روک دیگا۔ جب دماغ ہی برابر کام نہ کریگا تو انسان انسان کیسے رہ سکتا ہے۔

۹۔ اس نظامِ عمل کے سرانجام دینے کے لئے میں ایک تشکیل بنام اردو ایکڈیمی کی تجویز پیش کرتا ہوں۔ اس تشکیل کی اول غرض یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے اُردودان اصحاب علم و ارباب قلم کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے انہیں تبادلۂ خیالات اور باہمی استفادہ کا موقعہ دیا جائے اور اُردو مصنفین و مؤلفین کی ہمت افزائی کیجائے بذریعہ علمی مشورہ مالی امداد اور اعزازی خطابات کے۔ ایکڈیمی کا مستقر ہمارے مردانِ سخن اور پہلوانانِ قلم کے لئے ملجا و ماوے کا کام دیگا۔ جہاں تصنیف و تالیف اور اسکی نشر و اشاعت کے لئے ہر طرح کا سامان مادی و غیر مادی مہیا اور تیار رہیگا۔ ایکڈیمی کا مستقر و صدر مقام کل ملک کیلئے علمی و ادبی مرکز بن جائیگا جہاں سے ہماری نو پیدا قومیت کے ارتقا و تکمیل کا کام ہمارے رُدسائے تحریر و تقریر کے ہاتھوں انجام کو پہنچیگا دنیا میں کوئی بھی متمدن قوم نہ ایسی گذری ہے۔ اور نہ

ایسی موجود ہے جو ایک یا ایک سے زیادہ علمی و ادبی مرکز نہ رکھتی ہو۔ قومیت کی ترقی اور اسکے مخصوص تمدن و تہذیب کی تشریح توضیح و محافظت کے لئے ایسے مرکز کی سخت ضرورت ہے۔ صرف یونیورسٹیاں ہی ایسے مراکز کے قائم مقام نہیں ہوسکتیں کیونکہ انکا اول مقصد تعلّم و تعلیم ہے اور غیر ماہرین فن اور عام صاحبان دماغ [illegible] کو انکے ہاں بار نہیں مل سکتا یونیورسٹی اگر مرکز ہے بھی تو بہت چھوٹے پیمانے پر۔ اور ہندوستان کی غیر قومی یونیورسٹیاں تو مرکزیت کا دعوے بھی نہیں کرسکتیں۔ کسی قوم کے نشوونما کے لئے علمی و ادبی مرکز کی اہمیت کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ زوال بغداد سے مُسلمانوں کا علمی تنزل شروع ہوا جو آخر کار سیاسی تنزل کا بھی باعث ہُوا۔

۱۰- ایکڈیمی کے شرکا کے چار اقسام ہونگے۔

(۱)۔ رسالہ ایکڈیمی کے خریدار رسالہ کی قیمت میں چندہ بھی شامل رہیگا۔

(۲)۔ ارکان۔

(۳)۔ رفقا۔ انکو رسالہ مفت ملیگا۔

(۴)۔ سرپرست جو ۵۰ سے لیکر ایکسو روپیہ سالانہ دیں۔

خریدار تو کوئی بھی ہوسکتا ہے رکنیت کی شرائط حسب ذیل ہونگی۔

(۱) کلیہ جامعہ عثمانیہ کا ہر طیلسانی

(۲)۔ ہر ایسا گریجوایٹ جس کی دوسری زبان اُردو فارسی یا عربی رہی ہو۔

(۳)۔ ہر سند یافتہ اور صاحب دستار مولوی اور اُردو دان پنڈت۔

(۴)۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے علوم مشرقیہ فارسی و عربی کا ہر سند یافتہ۔

(۵)۔ ہر اُردو اخبار نویس اس میں موقت الشیوع رسالوں کے رُوسائے تحریر بھی شامل ہیں۔

(۶)۔ ہر صاحب دیوان شاعر۔

(۷)۔ ہر ایسا مصنف مؤلف یا مترجم جس نے کوئی اہم یا مفید کتاب تصنیف تالیف یا ترجمہ کی ہو۔

(۸)۔ ہر وہ شخص جس کا دو ارکان کی تحریک و تائید پر جلسہ عام میں انتخاب کیا جائے

رُکنیت کے حقوق و فوائد حسب ذیل ہونگے۔

(۱)۔ ایکڈیمی کا رسالہ مفت ملیگا۔

(۲)۔ ایکڈیمی کی تمام شائع کردہ کتابیں اصلی قیمت پر ملینگی۔

(۳)۔ اکیڈیمی کے جلسوں میں شرکت کا حق حاصل ہوگا۔

(۴)۔ حق رائے وصوت حاصل ہوگا۔

(۵)۔ اکیڈیمی کے کتب خانہ سے کتابیں اپنے خرچ پر مستعار لیجاسکینگی مقررہ پابندیوں کے ساتھ

(۶)۔ دفتر ایکڈیمی سے ہر طرح کا علمی مشورہ اور اعانت ملیگی۔

(۷)۔ اراکین اپنی مصنفات کی طباعت واشاعت میں ہر طرح کی امداد کے مستحق ہونگے۔

رکنیت کا چندہ مقرر ہوگا۔

رفقا کا انتخاب اراکین میں سے ہوگا خاص قابلیت اور غیر معمولی لیاقت کے اشخاص منتخب ہونگے۔ انکی تعداد ہندوستانیوں کے لئے ۱۰۰ ہوگی اور باہر والوں کے لئے ۲۵

رفاقت کا معیار اتنا بلند رہیگا کہ اکیڈیمی کا رفیق ہونا ہی غیر معمولی قابلیت کی دلیل ہوگی۔ رفقا کو بھی وہی حقوق وفرائض حاصل ہونگے جو اراکین کو ہونگے۔ صرف اتنا فرق رہیگا کہ رفقا سے کوئی چندہ نہیں لیا جائیگا اکیڈیمی کا نظم ونسق جماعت اراکین ورفقا سے متعلق رہیگا۔

اکیڈیمی حیدرآباد دکن۔ لاہور۔ دہلی۔ لکھنو یا پٹنہ کسی ایک جگہ قایم کیجاسکتی ہے

محمد عبدالعزیز
تحصیلدار
امریر ضلع ناگپور (ممالک متوسط)

علامۂ اقبال

اعتراف کمال پر طعنہائے دلخراش

نوشتۂ احضاد حسین۔ ایم۔ اے (علیگ)

غریب شہرے سخنہائے (نا) گفتنی دارد

علامۂ اقبال کے آفتاب کمال کی کرنیں ہندوستانی مسلمانوں کے جھونپڑوں پر اگر ضیا پاشی کرتی تھیں تو چنداں مقام تعجب نہ تھا۔ اگر دُکھے ہوُئے دل۔ زخمی جگر۔ پریشان دماغ اُنکے کلام میں سامانِ آلودگی۔ مرہم مندمل اور سرمایۂ سکون مہیا پاتے تھے تو کسی کو حیرت نہ تھی۔ ایشیا کے عرفاں پاش نغمے اگر صاف وستھری زبان اور بلند و نادر استعاروں کے حجاب میں ہمارے کانوں کی سمع نوازی کرتے تھے تو حق بحق دار رسید کا مصداق تھا مگر اللہ اللہ! وہ قصر استبداد جسکی سنگینی اور عدم رفاقت پر ہندوستان کی ننھی سی دُنیا آتش زیر پا ہے اور جسکے متعلق اب کلمۂ خیر بہت ہی کم سُننے میں آتا ہے علامۂ اقبال کی سحر آفرینی اور روحانی جذب سے متزلزل ہے۔

امسال کی فہرست خطابات کے اُس حصّہ سے ہمیں سروکار نہیں جو اُن حضرات سے متعلق ہے جنکی گرامی صفات ہستیاں حکام کے بنگلوں پر نور کے تڑکے سے پیشتر پہنچ جاتی ہیں یا جن کے مبارک ہاتھوں نے سینکڑوں گنہگاروں" کو کیفر کردار کو پہنچا کر تمغۂ صلاحیت حاصل کیا۔ ہمیں نہ کسی کی جبہ سائی سے مطلب ہے نہ کسی کے نصفت شعاری سے شکوہ۔ عیسیٰ بدین خود در ہے موسیٰ بدین خود۔ ہمارے پیش نظر تو ہندوستان کا وہ سرمایۂ ناز شاعر۔ وہ روشن دماغ فلسفی۔ وہ بلند رتبہ صوفی اور وہ متوکل علی الیہ۔ اور فقیر منش درویش ہے جو اگرچہ کلاہ تتری رکھتا ہے مگر درویش صفتی میں ان کوتاہ آستین (دراز دست) دلق پوشوں سے کم نہیں۔ نہیں نہیں جس کا تمام سرمایۂ عبادت اُسکا خلوص اور حسن نیت ہے اور بس۔ ہم اُس شخص کے سلسلہ میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔

مُلک کے اخبارات اور بعض انجمنوں میں ایک شور برپا ہے کہ "علامہ سے سرہو گئے اقبال"

پنجاب کے وہ فتنہ زا۔ خوردہ گیر اخبارات جو ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں کھوکھلی کرنے پر کمر بستہ ہیں غوغا مچا رہے ہیں کہ "مالوی تو سر نہ ہوئے مگر اقبال (گھر بیٹھے) نائیٹ بن بیٹھے"! انہیں حیرت ہوگی اور بالکل بجا کہ انسان شملہ و دہلی کی زمین کا گز بنے بغیر۔ وائیسرائے اور عامۃ الناس کے درمیانی آدمی کی حیثیت اختیار کرنے سے محترز رہ کر۔ گاہ باین شاخ اور گاہ نان اسکا کامیاب طرز عمل کے سوا کوئی اور بھی راہ ہے جو انسان کو محبوب و مطبوع خلائق بنا دیتی ہے۔ اسکا جواب صرف حافظ شیرازی دے سکتا ہے۔

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

یا یہ کہ

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حصول خطاب کوئی مستحسن امر ہے۔ یا یہ "سعی بے حاصل" کسی صورت میں بھی مشکور متصور ہو سکتی ہے۔ حاشا وکلا! مقصود تو صرف اس قدر ہے کہ اگر ایک صاحب کمال شخص ہے جسکے کمالات کا اعتراف پبلک مقبولیت اور ہر دلعزیزی سے کر سکتی ہے تو کیا حکومت کو (خواہ اُس میں کسی گروہ کے نقطۂ نظر کے موافق ابلیسیت کے عناصر بدرجہ اتم ہی کیوں نہ موجود ہوں) یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے اعتراف کا اظہار کر سکے۔ ایک سخن سنج اگر کسی شعر پر اپنی جنبش ابرو سے داد دے سکتا ہے تو ایک "ناشناس" کو بھی حق حاصل ہے کہ "واہ واہ" "کے آسمان رسا نعروں سے مجلس کو گرما دے۔ تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس کا مرتبہ ایک ہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک تخریبی ثابت ہو اور دوسرا تعمیری۔ پس جب پبلک کو (جس میں ایسے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو ایک ایک مصرع کی قیمت دونوں عالم معلوم ہو جانیکے بعد بھی ارزانی ہنوز کا نعرۂ مستانہ لگاتے ہیں اور ایسے باکرامت بزرگ بھی جو کسی گاؤں کی مغنیہ کے خروس بے ہنگام کو اقبال کے ترانوں پر ترجیح دیتے ہیں) یہ حق حاصل ہے کہ شمع و شاعر کی جنگ آزمائیوں کا بہر کیف مشاہدہ کرے۔ تصویر درد کو مادی و محسوس شکل میں دیکھے۔ اُس دلدوز آواز کو جسے نالۂ یتیم کہتے ہیں سنے اور اجتماعی حیثیت سے ایک شخص کو "قومی شاعر" بنا دے تو کیا ریڈنگ اور پیل شفیع اور ونسٹرٹن کو یہ حق نہیں کہ وہ بھی اس قبولیت کو اس چیز کی سند سے جسے وہ محبوب و معزز خیال

کرتے ہیں مکمل نہ کردیں۔ اگر حسن کی کشش ایسی ہو سکتی ہے کہ گورنر جھک جائیں تو کیا شعر (سحر) میں اتنا جادو نہیں کہ گورنر جنرل کو ہدیہ بدست دکھلا دے۔

بڑے بڑے جابر و سفاک بادشاہ گذرے ہیں مگر اقلیم سخن کے فرمانرداؤں کو انھوں نے ہمیشہ خراج تحسین دیا ہے۔ مانا کہ موجودہ سلطنت میں خطابات بیشتر اُنہیں حضرات کو ملتے ہیں جنکے دامن عمل ملوث ہوتے ہیں مگر کیا خرق عادت (خواہ وہ کتنی ہی مستحسن شکل میں ہو) عداوت کی مرادف گردانی جائیگی۔ ہمیشہ سے اور ہمیشہ سے نہیں تو اکثر اہل قلم اور خادمانِ ملت تعزز اور اعترافِ خدمات سے بے نیاز رہتے ہیں۔ نکتہ چیں گاہ گاہ نہیں بارہا اور اکثر اکثر حکومت کی بدمذاقی پر قلم دوات اور کاغذ کو خراب کرتے رہتے ہیں۔ یہ شکوہ سُنا جاتا ہے کہ حکومت صحیح اور موزوں آدمی کو خلعت سے عاری رکھتی ہے مگر اب جبکہ پہلی مرتبہ یہ بدعت (حسنہ) کیجاتی ہے۔ تو آپ اُس شخص کی ڈاڑھی نوچنے کے لئے تیار ہیں جس کا نہ قصور ہے اور نہ اس ارتکاب جرم میں کوئی ہات۔

مشرقی درباروں کو لے لیجئے۔ ذوق تو خاقانی ہند بنا دئے جاتے ہیں کہ وہ شہ کے مصاحب تھے اور غالب کہ ترجمان جذبات تھا وہ بوریہ نشیں مرزا نوشہ رہتا ہے۔ یہ انشا اللہ خاں انشاء تو لطیفہ گوئی کے طفیل میں سعادت علیخاں کی آنکھ کا تارا بنجاتے ہیں اس لئے کہ وہ تقرب شاہ کے جویا تھے اور غریب مصحفی کا گڈا بنایا جاتا ہے کیونکہ وہ رعایا سے زیادہ وابستہ تھے شیخ امام بخش ناسخ تو بسنت خان کی مداحی کے صلہ میں اتنے پرخور ہو سکتی ہیں کہ آموں سے ناندیں بھر لیتے ہیں۔ اور غریب آتش اپنی کملی میں مست ہے اس وجہ سے کہ اُس کی خودداری شاگردوں کے سامنے بھی دست سوال دراز نہیں کرنے دیتی۔ مگر دو سو برس کے راج کے بعد دربار فرنگ سے اس کلیہ میں استثنا ہوتا ہے اور عزلت نشیں اقبال کا بوریائے بے ریا ایک طلوع و غروب میں ایک نائٹ (سردار) کا قالین بن جاتا ہے۔ اُس کی شکستہ قلم اُسکی تیغ اور بیاض کے صفحات اُس کے خریطہ کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔

اقبال سے تقاضا ہے کہ تو خطاب کو واپس کردے۔ یہ وہی اقبال ہے جو نہ مسلم لیگ کی صدارت قبول کرتا ہے۔ نہ کسی یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ نہ کسی گورنمنٹ ہاؤس کی زیارت

کرتا ہے نہ کسی سرکاری ڈنر میں خوشی خوشی شرکت۔ نہ وہ قوم سے "قومی شاعر" کے لقب کا طلبگار نظر آیا نہ وہ "سر" کی بھیک مانگنے ایرانی حکومت کے قریب دیکھا گیا۔ ہاں تو وہی اقبال اگر "سر" ہوجاتا ہے تو یہ شوروشیون کیوں یہ نالہ وفغاں کس لئے۔ یہ حسن طلب یا تقاضائے جفا کس وجہ سے۔ اُس کے پاس تو جب بھی ایک ہی جواب تھا اور اب بھی ایک ہی جواب ہے۔

صالحان! خوردہ مگیرید کہ ما رندانیم

ہندو قوم کو دیکھو وہی ڈاکٹر پی۔ سی رائے جو کشکول گدائی صرف اس لئے لئے پھرتے ہیں کہ بنگال کے بھوکوں کو مرنے سے بچائیں۔ چرخہ کا پرچار کریں۔ مادیت کے خلاف پندو نصائح کریں حکومت سے بھی جب "سر" کا خطاب پاتے ہیں تب بھی اُسی طرح محمود و ممدوح رہتے ہیں۔ جگدیش چندر بوس جن کی ایجادات واختراعات نے چار دانگ عالم کو ہندوستانی کی ذہانت کا معتقد کرادیا اپنی قوم کے بھی سرتاج ہیں اور حکومت سے بھی "سر" کا خطاب پاتے ہیں سرچشمۂ علوم و تحقیق بھنڈارکر جن کی بدولت مشرقی علوم کی بجھتی ہُوئی شمع ہندوستان کی بدمذاقی کی صرصر سے بھی نہ بجھی اپنے کتب خانہ میں بیٹھے بیٹھے پبلک میں بھی مقبول ہُوئے اور حکومت نے بھی اعتراف کیا۔ یعنی اُنہیں بھی نائیٹ بنادیا۔ آہ آج وہی رسم بدنصیب مُسلمانوں کی قوم کے ایک رُکن کے ساتھ بھی ادا کیگئی مگر اتنی وسعت نظر۔ علو تخیل کہاں سے لائیں کہ سر محمّد اقبال کو اُس سلک میں منسلک نہ کریں جس کے بعض "موتیوں" نے بحر قوم فروشی۔ اور حکام پرستی کی تہ میں مدتوں بیٹھ کر اپنا درخشاں وجود حاصل کیا ہے۔ اقبال کی قوم میں ایسے افراد کہاں جو یہ سمجھ سکیں کہ اگر نان کوآپریشن کی مخالفت یا عدم تائید کے صلہ میں ملتا تو یہ خطاب میاں فضل حسین یا لالہ ہرکشن لعل کو ملتا۔ معلوم نہیں فہرست خطابات شایع ہونیکے بعد کتنے ملت فروش جنہوں نے اپنی قوم کے نوجوان افراد کے گلے کاٹے ہونگے کف افسوس مل رہے ہونگے ع

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست۔ ورنہ اقبال۔ ترجمانِ حقیقت۔ اقبال۔ بطلِ حریت اقبال۔ وہ اقبال جس نے ہمیں تڑپنے اور تلملانے کا طریقہ بتلایا۔ نوگرفتارانِ قفس کو رہائی کی راہیں بتلائیں وہ اقبال جو لندن کی سیر کو تو گیا مگر کس طرح؟ جانے سے پہلے نظام الدین (اولیا) کے مقبرہ پر متاع نیاز کی نذر چڑھاکر اور آنیکے بعد "تہذیب حجازی

کے مزار" پر آنسو بہاکر۔ وہ اقبال جو آپ کی مجلسوں میں شریک تو ہوا مگر کس لئے تاکہ آپ کے لئے دعا کرے کہ ؎

یارب دل مُسلم کو وہ زندہ تمنا دے جو رُوح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

ہاں ہاں وہ تمہاری صحبتوں میں شریک ہُوا تاکہ رو دئے اور رلوائے۔ اپنے سینہ کو صاف کرے اور تمہارے سینوں کو صاف کرائے۔ وہ کہتا رہا کہ

میں سارے چمن کو شبنمستان کرکے چھوڑونگا

اقبال!! اگر آج تجھ پر لوگ تہمت و افترا کی یورش کرتے ہیں۔ تیری دلشکنی پر آمادہ ہیں تو تُو مت گھبرا۔ تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

سر محمد اقبال! اگر نائیٹ ہڈ کا تمغہ تیرے سینہ پر آویزاں (ظاہر بینوں کو) نظر آرہا ہے تو مت سمجھ کہ ایسے لوگ اب باقی نہیں جو یہ نہ جانتے ہوں

ابھی اے ہمنفس رہنے دے شغل سینہ کاوی میں کہ میں داغِ جگر کو... نمایاں کرکے چھوڑونگا

عرفان پاش اقبال! اگر ساٹک بٹالوی تیرے اوپر طعنہ زن ہے تو تُو پرواہ نہ کر دیدۂ سعدی دل ہمراہ تست۔ قوم کی نظریں تو خواہ صرف ڈاکٹر رہے یا سر ہو جائے یکساں ہی رہیگا۔ یہ عارضی ہیجان۔ یہ ہنگامی جوش و خروش چند روزہ ہے۔ ان تیر اندازوں سے میں تو صرف اسقدر کہونگا ؎

ہے صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ

پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

اور تو یہ کہکر اُنہیں خاموش کر۔

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو

تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

مہاراجہ ہرش

ہندوستان قدیم کے چکرا ورتی مہاراجوں کے نام ہاتھوں کی اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ چندر گپت موریا غالباً اس مختصر سے سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور ہرش وردھن آخری۔

پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان ہن قوم کی بے پناہ تاخت و تاراج کا تختۂ مشق بن رہا تھا۔ ہن وسط ایشیا کے رہنے والے تھے اور منگول (مغل) قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ انکی خونریزی اور سفاکی کا یہ عالم تھا۔ کہ جہاں سے گذرتے انسانی خون سے زمین لالہ زار بن جاتی آباد اور پُر رونق شہر یکسر کھنڈروں کا ڈھیر رہ جاتے۔ اور شاداب و سرسبز علاقوں میں ویرانی اور تباہی کا دور دورہ ہوجاتا۔ کہتے ہیں کہ ان کے شانے فراخ تھے اور ناکیں چپٹی۔ آنکھیں چھوٹی۔ سیاہ اور سر میں دھنسی ہوئی اور چہرے ریش و بروت سے بالکل صاف۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صورت و سیرت کے اعتبار سے ہنوں اور ان مغلوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ جنہوں نے چنگیز اور اس کے جانشینوں کی سرکردگی میں ہندوستان کے پٹھان بادشاہوں کے زمانے میں اٹک اور جمنا کے درمیانی علاقوں کو قتل و غارتگری کی قیامت گاہ بنایا۔

اسلامی ہند کے مایۂ ناز شاعر امیر خسرو نے ایک مدت ان لوگوں میں بحالت اسیری بسر کی تھی۔ انہوں نے بھی اپنی مشہور مثنوی قران السعدین میں ایک مقام پر ضمناً ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے خط و خال اور شکل و شباہت کی ایک بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ مذکورۂ بالا خصائص کی ایک حد تک اس بیان سے بھی تائید ہوتی ہے۔

یہ وہی ہن ہیں۔ جن کا ایک سردار جو تھی صدی عیسوی میں اپنے ٹڈی دل لشکر کے ساتھ یورپ پر حملہ آور ہوا تھا اور سارے براعظم کو اپنے گھوڑوں کے پاؤں تلے روندتا ہوا مغرب تک نکل گیا تھا۔ اس دل ہلا دینے والے حملے کی تلخ یاد آج تک اہل یورپ کو خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ اور ان کے بچے بچے کے جسم پر اٹلا کے نام سے رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہی اٹلا ہے جسے تاریخ نے "لعنت ایزدی" کے خطاب سے یاد کیا ہے۔

غرضیکہ پانچویں صدی عیسوی میں اس وحشی قوم کے ایک قبیلے نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ اور سکند اگپتا کو پنجاب سے نکال کر اس کی مضبوط اور وسیع سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا۔ یہ لوگ غارتگری اور لوٹ مار کی شیطانی انتہا کے ساتھ ساتھ ملک گیری اور فرمانفرمائی کی حرص و ہوا سے بھی دیوانے ہو رہے تھے۔ لیکن نظم و نسق مملکت اور تدبیر و انضباط سلطنت کے امور سے بے بہرہ مطلق تھے۔ اس لئے سکند اگپتا کے اخراج کے بعد جب اس کی سلطنت ان کے قبضہ میں آئی تو ملک سے امن و امان یکسر موقوف ہو گیا اور جب تک یہ یہاں رہے۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار ہر سمت گرم رہا۔

پانچویں صدی کے آخر میں اس قوم کے ایک رئیس نے جس کا نام تورامن تھا۔ پنجاب راجپوتانہ۔ مالوہ اور وسط ہند میں ایک منضبط اور مستحکم سلطنت کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی۔ اور غالباً وہ اس کوشش میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوا۔ کیونکہ اس کے عہد کے سکے اور کتبے وسط ہند کے بہت سے مقامات سے بافراط دستیاب ہوئے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تورامن نے اپنے نام کے ساتھ مہاراجہ ادھیراج یعنی مہاراجوں کے مہاراجہ کا خطاب شامل کر لیا تھا۔

تورامن کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مہرگل ۵۱۰ء میں سریر ارائے سلطنت ہوا۔ مہرگل ظلم و ستم کا مجسمہ اور جبر و استبداد کا پیکر تھا۔ اس کے لئے سب سے بڑی مسرت اس بات میں تھی کہ اپنی غریب۔ مجبور اور بے دست و پا رعایا کا خون بہائے۔ چنانچہ اس کی بیرحمی اور خونریزی کی داستانیں مدت تک زبان زد خلائق رہیں۔ اور قدیم کتابوں میں ابتک اس قسم کے واقعات درج ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ چنگیز اور ہلاکو سے کسی طرح کم نہ تھا۔

ظلم و ستم حد سے گذرنے کے بعد خود اپنے مصدر و منشا کے لئے تباہی و بربادی کی فضائے مبرم بن جاتا ہے۔ یہ غالباً کائنات انسانی کی سب سے پرانی حقیقت ہے۔ جس کی شہادتیں دور قدیم سے لیکر دور حاضر تک ہر عہد سے یکساں مل سکتی ہیں۔ چنانچہ جب مہرگل کے ظلم و ستم بھی اپنی انتہا پر پہنچے تو قدرت نے راجہ بالادتیہ کے وجود کے اندر سے اس کی تباہی و بربادی کی تدبیر کی۔ بالادتیہ مگدھ میں گپتا خاندان کی رہی سہی عظمت کا محافظ تھا۔ اس نے راجہ یسودھرمن

کی مدد سے مہر گل پر چڑھائی کی۔ اور ملتان کے قریب کھڈوڑ کے مقام پر ۵۲۸ء میں اسے شکست فاش دی۔ مہر گل کی فوج کا بیشتر حصہ اسی جنگ میں کٹ گیا۔ ناچار ہر طرف سے مجبور ہو کر وہ بقیۃ السیف سپاہیوں کی معیت میں کشمیر کی سمت فرار ہو گیا۔ اور وہیں اس کا ۵۴۰ء میں انتقال ہُوا۔

مورخوں کا خیال ہے۔ کہ تورامن آتش پرست تھا۔ کیونکہ اسکے سکّوں پر سورج کی تصویر پائی جاتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ مہر گل نے ہندو مذہب اختیار کر لیا تھا۔ کیونکہ اس کے بہت سے سکوں پر لکھشمی دیوی کی تصویر ہے اور بہت سے سکوں پر سانڈ اور بشو کے ترسول کی۔ اس کا دارالسلطنت سکالا یا سیالکوٹ تھا۔ بدھ مذہب کی بعض کتابوں سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اسے بدھ مذہب سے بے حد عداوت تھی۔ اور وہ اس کے پیروؤں کو سخت اذیت دیتا تھا

کھڑوڑ کی شکست ہندوستان میں ہن قوم کی قوت و طاقت پر ایک مہلک ضرب تھی۔ وہ اس سے پورے طور پر سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ ان کے اصل مولد و ماوے یعنی وسط ایشیا میں ان پر انتہائی مصائب نازل ہو گئے۔ یعنی ایرانیوں اور ترکوں نے متحد ہو کر انہیں دریائے جیحوں کے کنارے پر گھیر لیا۔ اور ایک خونریز جنگ کے بعد انہیں کامل شکست دیکر ان کے ایک ایک آدمی کو چن چن کر مارا۔ اس قتل عام کے بعد ہن بالکل تباہ ہو گئے۔ اور ہندوستانی شاخ کو دوبارہ فروغ پانے کی جو اُمید تھی وہ بھی ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گئی۔ کیونکہ دریا کے بہاؤ کا زور منبع کے بل پر ہوتا ہے۔ اگر منبع بند ہو جائے تو پھر دریا کا اپنی حالت پر قائم رہنا قطعاً محال ہے اب تک انہیں یہ خیال تھا۔ کہ وسط ایشیا سے کمک پہنچ گئی تو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو پھر حاصل کر لینگے۔ لیکن وسط ایشیا کے ہن خود تباہ ہو گئے تو ہندوستان کے ہن بالکل بے یار و مددگار رہ گئے۔ اس پر یہاں کے راجوں اور فرمانفرماؤں کو اپنا دیرینہ انتقام لینے کا اچھا موقع مل گیا انہوں نے مل مل کر ان پر پے در پے حملے کئے اور انہیں کثیر تعداد میں موت کے گھاٹ اتار دیا جو باقی بچے انہوں نے ہندوؤں کا مذہب اور ہندوؤں کا تمدن اختیار کر لیا۔ اور اس طرح ہندوستانیوں میں جذب ہو گئے۔ کہ آج یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ ہندوستان کے کس قبیلے یا خاندان کی رگوں میں ان خونخوار سورماؤں کا خون موجزن ہے۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ کہ کھرڑ کی فتح اور وسط ایشیا میں ہنوں کی تباہی نے ہندوستانی مہاراجوں کے حوصلے بہت بڑھا دئے تھے۔ اس دور میں سب سے بڑا بہادر اور عظیم الشان راجہ وہی سمجھا جاتا تھا۔ جس کی بے پناہ تلوار کو بے یار و مددگار ہنوں کی خوں آشامی سے زیادہ عشق اور پیار ہوتا۔ جرح و قتل کے اس خونی دور میں سری کنٹھ کی چھوٹی سی ریاست کے فرمانروا پربھکار نے ہنوں کے مقابلے میں ہمت و شجاعت کے جوہر دکھا کر خوب نام پیدا کیا۔ اور دُور و نزدیک کے راجے اسے خاصی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ یہ راجہ سُورج دیوتا کا پرستار تھا۔ اور تھانیسر کا مشہور شہر جو کروکھیتر کی تاریخی رزمگاہ کے قریب واقع ہے۔ اس کا صدر مقام تھا۔ یہ بذاتِ خود بڑا نامور شخص تھا۔ لیکن اس کے کارناموں کا چراغ اس کے نامور تر فرزند اور جانشین ہرش وردھن کی عالمگیر شہرت کے آفتاب کی روشنی میں بے نور سا رہ گیا ہے۔ اور یہی ہرش وردھن ہمارے اس بیان کا زیب عنوان ہے۔

ہرش کا اصلی نام سلادتیہ تھا۔ وہ بہت بلند نصیب اور با اقبال شخص تھا۔ ۶۰۶ء میں سولہ یا سترہ سال کی عمر میں تختِ سلطنت پر متمکن ہُوا۔ اور اسی سال اس نے اپنا سمت جاری کیا۔ جو اب تک ہندوستان کے بہت سے حصّوں میں رائج ہے۔ تخت نشینی کے پانچ سال بعد اس نے ایک بہت بڑا جشن ترتیب دیا اور اپنا نام ہرش وردھن رکھا۔ چنانچہ تاریخ میں وہ اسی نام سے مشہور ہے۔

(ہرش کے دستخط کا نمونہ جو اس کے ایک سکے سے نقل کیا گیا)

ہرش شری مہاراجہ ادھیراج ماماسوا ہستو

کہتے ہیں۔ کہ ابتدا میں اسے بہت سے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ اس کے باپ کی ناگہانی موت کی وجہ سے اس کی ماں اپنے خاوند کے ساتھ ستی ہوگئی۔ اس کا بہنوئی گرہا درمن قنوج کا راجہ تھا۔ وہ پڑوس کے ایک راجہ کی کینہ توز تلوار کا شکار ہوگیا۔ اور

اس کی بیوہ یعنی ہرش کی چھوٹی بہن راجیاسری جان بچاکر وندھیاچل کے جنگلوں میں بھاگ گئی اس کے بعد ایک اور مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس کا بڑا بھائی اپنی بہن کا انتقام لیکر واپس آرہا تھا۔ کہ غور کے راجہ سسانکا نے دوستی اور محبت کے پردے میں اس کا کام تمام کردیا۔ ان پے درپے مصائب نے نوجوان شاہزادہ کے دل پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ اور غالباً اسی وجہ سے اس کا دل دنیا کے عیش و آرام سے بیزار ہوگیا۔ اور اس نے اپنی تمام عمر سلطنت کے نظم ونسق اور رعایا کی فلاح و بہبودی کے وسائل وذرائع پر غور وفکر کرنے اور انہیں معرض عمل میں لانے میں بسر کردی۔

ہرش کی عمر کا بیشتر حصہ جنگ وجدل میں صرف ہوا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے بہنوئی کے قاتل سے بدلہ لیا اور اسے شکست دیکر مالوے کا ملک اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اپنی بہن کو وسط ہند کے جنگلوں سے ڈھونڈھ کر بلوایا اور اسے ہر طرح سے تشفی اور تسلی دی اسکے بعد اس نے اشوک اور چندرگپت کی طرح تمام ہندوستان کو اپنے زیرنگین لانے کا تہیہ کیا۔ اور ساڑھے پانچ سال کے قلیل عرصہ میں اس کی یہ آرزو ایک حد تک پوری ہوگئی یعنی ملک کا بیشتر حصہ اس نے فتح کرلیا۔ ابتدا میں اس کے پاس پانچ سو جنگی ہاتھی۔ بیس ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادہ فوج تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تعداد ساٹھ ہزار ہاتھی اور ایک لاکھ سوار تک پہنچ گئی۔ غالباً ازمنہ قدیم کی تاریخ ایسی طاقتور فوج کے وجود کے تذکرے سے بالکل خاموش ہے۔ چینی سیاح ہیون سانگ لکھتا ہے کہ اس ہیبت پرور فوج کے ساتھ ہرش مشرق سے لیکر مغرب تک دھاوے کرتا اور جہاں جاتا۔ فتح وظفر کے پرچم اُڑاتا۔ اور متمرد اور متکبر راجاؤں کو حلقہ بگوش دولت بناتا۔ کئی سال تک نہ اس کے سواروں کو اطمینان سے بیٹھنا نصیب ہوا اور نہ ہاتھیوں کو دم لینے کی فرصت ملی۔ اگر شمال میں نیپال اور کامروپ (آسام) اس کی طاعت وانقیاد کے حلقے اپنی گردنوں میں ڈالے ہوئے تھے۔ تو جنوب میں ولبھی (گجرات) کا راجہ اسکا باجگزار تھا۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے۔ کہ پنجاب اور کشمیر کا علاقہ اس مہاراجہ کی مملکت میں شامل نہیں تھا۔

اس زمانہ میں چلوکیا نامی ایک اور ہندو سلطنت دکن میں قایم تھی۔ اس سلطنت کا راجہ پلک سین ثانی مہاراجہ ہرش کا ہمعصر تھا۔ شمالی ہندوستان کی تسخیر سے فارغ ہوکر ہرش نے اس کی قوت کو توڑنے کا ارادہ کیا۔ لاؤ لشکر لیکر اس پر حملہ آور ہوا۔ لیکن سخت ناکامی ہوئی

آخر صلح ہو گئی اور یہ قرار پایا کہ شمالی ہندوستان پر ہرش کا قبضہ و تصرف رہے اور جنوبی ہندوستان پر پُلاک سین حکمرانی کرے۔ اور دریائے نربدا ان دونوں سلطنتوں کی حد فاصل ہو۔ اپنے بائیس سالہ عہد حکومت میں صرف یہی ایک لڑائی تھی جس میں ہرش نے شکست کھائی۔ آخری ایام میں اسے کسی قدر اطمینان نصیب ہُوا۔ اور وہ اپنا وقت علوم و فنون کی ترقی۔ اور ترویج میں صرف کرنے لگا۔ دُور دُور کے علمائے فضلا اس کے دربار میں جمع ہو گئے اور اس کی علم پروری کے شُہرے سے دیار و امصار گونج اُٹھے۔ یہانتک کہ خاقان چین نے بھی اپنے ایلچی اس کے دربار میں بھیجنے کو موجب امتیاز جانا۔ لیکن اوائل عُمر کے مصائب اور چالیس سال کے جنگ و جدل نے اس کے توے ضعیف کر دیئے تھے اور اس کی جسمانی صحت پر بہت بڑا اثر ڈالا تھا۔ آخر شمالی ہندوستان کا یہ زبردست تاجدار ابھی ساٹھ سال کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ۶۴۷ء نہنگ اجل کا شکار ہو گیا۔

مہاراجہ ہرش نے تھانیسر کی بجائے قنوج کے قدیم شہر کو اپنا دارالسلطنت بنانے کے لئے منتخب کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ہندوستان کا مشہور دولتمند اور خوبصورت ترین شہر بن گیا۔ جب ہیون سانگ اس کی سیر کے لئے آیا تو یہ قریباً چار میل لمبا اور ایک میل چوڑا تھا۔ خوبصورت عمارتیں۔ تالاب اور باغ شمار سے باہر تھے۔ پانچویں صدی میں اس شہر کے اندر بدھوں کے دو راہب خانے تھے لیکن ہرش کے زمانہ میں ان کی تعداد ایک سو تک پہنچ گئی۔ مگر یہ اور بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوؤں کے مندروں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ ہندو اور بدھ مذہب کے پیرو تعداد میں قریب قریب مساوی تھے۔ سولھویں صدی میں اس شہر کو شیر شاہ سوری نے بالکل تباہ کر دیا اور اب سوائے پتھروں کے ایک غیر مختتم ڈھیروں کے جو ریل کی سڑک بنانے کے کام آتے ہیں۔ کوئی ایسی عمارت نہیں جو اس شہر کی گذشتہ عظمت کا کچھ حال بتلا سکے۔

ہندوستان قدیم کے غالباً کسی راجہ یا مہاراجہ کے حالات ہمیں اس شرح و بسط کے ساتھ نہیں ملتے جیسا کہ ہرش کے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس مہاراجہ کے عہد کے متعلق سکوں اور کتبوں کے علاوہ دو مفصل اور نہایت معتبر کتابیں موجود ہیں۔ جو اس عہد کے واقعات پر پوری روشنی

ڈالتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو ہیون سانگ کا سفرنامہ ہے۔ جس کے مطالعہ سے اسکے دورِ حکومت کے حالات تمام وکمال معلوم ہوجاتے ہیں۔ دوسری ہرش چرتر یعنی مہاراجہ ہرش کی سوانح عمری جو اس کے درباری شاعر اور دوست بانا کی تصنیف ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مہاراجہ نہایت شان وشوکت والا فرمانروا تھا۔ دور دور کے راجے اس کے تابع فرمان تھے۔ اور اسے خراج دینا باعثِ عزت سمجھتے تھے۔ اشوک کی طرح اس کے عہد میں بھی ہر کس وناکس کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ مہاراجہ ہر مذہب وملت کے علما کی قدر کرتا اور انہیں فراخدلی کے ساتھ انعام واکرام دیتا۔

ہرش نہ صرف علم دوست تھا۔ بلکہ خود بھی ایک اعلیٰ پائے کا شاعر اور مصنف تھا۔ چنانچہ اس نے سنسکرت زبان کے قواعد کی ایک کتاب اور تین ناٹک بھی لکھے ہیں۔ جو ابتک موجود ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ناگانند بھی ایک ناٹک کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔

عالمگیر کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ اگر وہ ہندوستان کی ایسی وسیع سلطنت کی فرمانفرمائی کے بارسے سبکدوش رہتا تو ابوالفضل اور سعداللہ خاں کے پایہ کا ادیب وانشا پرداز ہوتا۔ اسی طرح مہاراجہ ہرش کے متعلق ہم بلاخوف تردید کرسکتے ہیں کہ اس کی جنگی فتوحات اور دوسرے کارہائے نمایاں کو لوگ بالکل بھول چکے ہیں۔ اور اگر اس کا نام ابتک زندہ ہے تو صرف اس لئے کہ وہ خود ایک اعلیٰ پایہ کا مصنف اور علم دوست تھا۔

علم دوستی کے علاوہ مہاراجہ ہرش کی طبیعت میں نیکی اور خداترسی بھی بیحد تھی۔ گھنٹوں گیان دھیان اور تپسیا میں لگا رہتا اور کبھی کوئی فعل خلاف رضائے الٰہی اس سے سرزد نہ ہوتا۔

ہیون سانگ لکھتا ہے۔ کہ اسے خیرات اور دان پن کا اس درجہ شوق ہوگیا تھا کہ کھانے اور سونے کا بھی خیال نہ رہتا۔ اس کا حکم تھا کہ جو شخص میری مملکت میں جیو ہتیا کریگا یا گوشت کھائیگا وہ جان سے مار دیا جائیگا۔

مہاراجہ ہرش کے مذہب کے متعلق مورخوں میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بعض غلطی سے اسے ہندو مذہب کا پیرو لکھتے ہیں اور بعض بدھ مذہب کا۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ ابتدا میں عام ہندوؤں کی طرح ہشو دیوتا کی پرستش کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی سورج دیوتا اور گوتم بدھ کی پوجا بھی کرلیتا۔ لیکن آخر میں وہ بدھ مذہب کا بہت راسخ الاعتقاد پیرو ہوگیا تھا۔ اور ہر وقت مہاراجہ اشوک کے

نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس جگہ غالباً یہ بیان کر دینا کچھ بیجا نہ ہوگا۔ کہ ہرش کے زمانہ میں بدھ مذہب رو بہ تنزل تھا۔ لوگوں کے قلوب اس سے بالکل پھر چکے تھے۔ اور وہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ہندوؤں کے دیوتاؤں کی پرستش کی طرف متوجہ ہوتے جاتے تھے۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ متھرا۔ پریاگ۔ بنارس۔ کوسی نگر۔ کپل دستو۔ اور دوسرے بیسیوں مقامات بدھ مذہب کے مرکز تھے۔ اور جدھر آنکھ اُٹھتی تھی بدھ ہی بدھ نظر آتے تھے۔ یا یہ عالم ہوگیا کہ انکے راہب خانے اور مقابر ویران اور بے آباد پڑے تھے۔ یا جنگلوں کے نیچے دب گئے تھے۔ اور ان میں ایک متنفس بھی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو بدھ کی تعلیمات کا پابند ہوتا۔ ہیون سانگ۔ بدھ مذہب کا والہ وشیدا ہیون سانگ جب خود گوتم بدھ کے وطن مالوف میں اس قسم کے حوصلہ شکن مناظر دیکھتا تھا تو اس کے دل پر ایک سانپ سا لوٹ جاتا ہے اور اس کی آنکھیں بے اختیار خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنے سفرنامے میں کئی بار بدھ مذہب کے زوال اور ہندو مذہب کے عروج کا ذکر کرنے سے نہیں چوکتا۔

ہیون سانگ نے مہاراجہ ہرش کے عہد کی ایک نہایت دلچسپ رسم کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ اس مہاراجہ کا دستور تھا کہ اپنی حکومت کے ہر پانچویں سال پریاگ (الہ آباد) کے مقام پر ایک بہت بڑا میلہ لگاتا۔ جہاں باجگذار راجاؤں اور عوام الناس کے سامنے اپنے تمام خزائن اور زر و جواہرات یہانتک کہ تاج بھی ہر مذہب و ملت کے فقیروں اور سادھوؤں کو دیدیتا اور اپنے پاس سوائے معمولی کپڑوں کے اور کچھ نہ رکھتا۔ میلے کے پہلے روز گوتم بدھ کی مورتی کا جلوس نکالا جاتا اور اس کی پرستش ہوتی۔ دوسرے روز سُورج دیوتا کی تیسرے روز شو دیوتا کی۔ پریاگ کا میلہ جس میں ہیون سانگ شامل ہُوا ۶۴۳ء میں لگا۔ اور یہ اپنی قسم کا چھٹا میلہ تھا۔

ہرش قدیم ہندوستان کا آخری چکرا ورتی مہاراجہ تھا۔ اسکی وفات کے بعد قابل جانشینوں کے فقدان کی وجہ سے سلطنت میں ضعف آگیا۔ اور باجگذار راجوں نے ہرش کی وسیع سلطنت کے حصے بخرے کر لئے۔ اسکے بعد پرتھوی راج کے زمانے تک کسی کو بھی ایک وسیع اور مستحکم سلطنت کے قیام کی توفیق نہ ہُوئی ٭

سید عبد القادر
پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

خلفائے راشدین

عمر ابن الخطابؓ۔ کنیت ابوحفص۔ لقب فاروق[1]۔ از قبیلہ بنی عدی۔
وضع قطع۔ قد آپکا اتنا لمبا تھا کہ مجمع کے اندر جہاں کھڑے ہوتے آپکا سر سب سے اونچا دکھائی دیتا تھا۔ جوانی کے دنوں میں آپ کو کشتی لڑنے کا شوق تھا جس کے سبب سے انکا بدن مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ گھوڑا کیسا ہی شریر کیوں نہ ہو اس پر بے دھڑک سوار ہو جاتے۔ رنگ گندمی تھا۔ پیشانی فراخ تھی ڈاڑھی کو مہندی سے رنگا کرتے تھے۔ مزاج آپکا سخت اور تند تھا۔ مگر دل میں کدورت نہیں رکھتے تھے
مُسلمان ہونے سے پہلے آپ اور ابوجہل اسلام کے سخت مخالف تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت عمر اپنی بہن حفصہ کے مکان پر گئے۔ جب دروازہ پر پہنچے تو انکو تلاوتِ قران کی آواز آئی۔ سنتے ہی آپ طیش میں آ گئے۔ اور مکان کے اندر گھستے ہی بہن اور بہنوئی دونوں کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا بیچاری حفصہ کی اُنگلی میں زخم آیا اور وہ رونے لگی۔ یہ دیکھ کر آپکا دل فوراً نرم ہو گیا اور اُس سے پوچھا کہ تو کیا پڑھ رہی تھی۔ اس نے سورۃ "طٰہٰ" پڑھ کر سُنائی۔ اسکے سُننے سے آپکے دل پر ایسا اثر ہُوا کہ آپ سیدھے پیغمبرؐ کے مکان پر گئے اور اسلام قبول کر لیا۔
اسکے پیشتر پیغمبرؐ اسلام قریش کی سختیوں کی وجہ سے خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے نہیں جاتے تھے بلکہ اپنے مکان کے اندر نومسلموں کو جمع کر کے فرائض دینی ادا کیا کرتے تھے۔
حضرت عمرؓ مُسلمان ہو کر سب مُسلمانوں کو اپنے ساتھ لے گئے اور خانہ کعبہ میں علانیہ طور پر نماز پڑھی۔ اسکے بعد آپ اشاعت اور حمایتِ دین میں بلیغ کوشش فرماتے رہے جسکے سبب سے پیغمبرؐ آپکی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ یہانتک کہ ازواج النبی کے مابین اگر جھگڑا ہوتا تو یہی جاکر فیصلہ کرتے اور اُنکو طلاق تک کی دھمکیاں دے آتے۔
اس زمانہ میں بہت کم لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اور خلیفہ عمر صحابہ میں سے

---

[1] فرق اللہ بہ بین الحق والباطل

ان متعدد[1] اشخاص میں تھے جو اس نعمتِ عظمےٰ سے مستفیض ہُوئے تھے۔ اسی امتیاز کے سبب سے آپ خلیفہ ابوبکرؓ کے دبیر بنائے گئے تھے۔ اپنی قوم میں آپکی اس قدر عزت اور قدر تھی کہ جہاں کہیں سفارت بھیجنی ہوتی تھی تو انہیں کو بھیجا جاتا تھا۔

آپ کو شراب سے ازحد نفرت تھی۔ کہتے ہیں تحریمِ خمر کے بارہ میں جو آیاتِ[2] قرآن نازل ہُوئی ہیں وہ آپ کی درخواست سے نازل ہُوئی ہیں۔

اہل وعیال سے خدانے آپکو مالا مال کیا تھا۔ جاہلیت کے ایام میں آپکی تین[3] بیویاں تھیں۔ مسلمان ہوکر اُن تینوں کو چھوڑ دیا اور دوسری[4] مسلمان بیویوں کے ساتھ شادی کی۔ مسلمان بیویوں میں سے آپکے ۸ لڑکے تھے جن میں سے ۳ کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ اور تین لڑکیاں تھیں۔ جن میں سے ایک لڑکی کا نام حفصہ تھا جس کی شادی پیغمبرؐ کے ساتھ ہُوئی۔

طرزِ رہایش آپکا نہایت سیدھا سادہا تھا۔ کپڑے ہمیشہ موٹے اور اونی پہنا کرتے۔ آپکی قمیص میں پانچ سات جگہ پر پیوند ضرور لگے ہوتے تھے اور پیوند بھی کہیں چمڑہ کا۔ کہیں سوت کا کہیں اون کا۔ جوتا کھجور کے پتوں کا پہنا کرتے۔ کھانے کو اونٹ کا اُبلا ہُوا گوشت۔ جو کی روٹی اور کھجوریں کھاتے۔ دودھ گھی اور مرغن اشیا کو فضول خرچی سمجھکر کبھی منہ نہ لگاتے۔ کھاتے وقت غریب مسلمانوں کو اپنے ساتھ بٹھالیتے اور مسجد کی سیڑھیوں پر یا اور جہاں کہیں دل چاہا بیٹھ کر کھانا کھالیتے۔ آپ کی عادت تھی کہ کھانے کے بعد مسجد کے ایک کونہ میں بوریا بچھاکر سوجایا کرتے۔

خلیفہ بننے کے بعد بھی آپ نے طرزِ معاش نہیں بدلا۔ لوگ انکو اکثر عمر یا عمر ابن الخطاب کہہ کر پکارتے۔ اگر کوئی خلیفہ یا خلیفۃ الرسول کہکر پکارتا تو کہتے کہ اتنا لمبا نام لینے کی کیا ضرورت ہے؟ تم مومن ہو

---

[1] علیؓ۔ عمر ابن الخطاب۔ طلحہ ابن عبداللہ۔ عثمان۔ یزید و معاویہ و ابوسفیان۔ حاطب ابن عمرو۔ علا بن الحضرمی — عبداللہ بن سعد۔ حویطب بن عبدالعزیٰ۔

[2] "لا تقربوا الصلوٰۃ و انتم سکاریٰ" (قرآن مجید)
انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان۔ فاجتنبوہ لعلکم تفلحون ۵ (قرآن مجید)

[3] زینب۔ ملکہ۔ قرینہ۔ [4] ام حکیم۔ جمیلہ۔ ام کلثوم بنت علی۔ عاتکہ۔ ان چار مسلمان بیویوں کے علاوہ آپکی دو اور بیویاں تھیں ام کلثوم بنت ابوبکر۔ ام ابان۔ ان دونوں کو بدمزاج ہونیکی وجہ سے دوسری بیویوں سے علیحدہ رکھا کرتے تھے۔

میں تمہارا امیر ہوں۔ مجھے امیرالمومنین کہا کرو یا فقط عمر کہو خلیفہ بن کر مجھ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگئی۔

انصاف اور سیاست۔ آپ مدینہ کے بازاروں میں درّہ ہاتھ میں لئے پھرا کرتے اور جس مسلمان کو اسلامی احکام اوامرونواہی میں قاصر پاتے اسکو وہیں پر کھڑے کھڑے ٹھوک دیتے۔

راتوں کو گلی کوچوں میں گشت لگاتے اور چپکے چپکے سنتے کہ لوگ انکی حکومت کے بارہ میں کیا چرچا کرتے ہیں۔ چور گٹھ کٹے۔ راہزن۔ شرابخور اور بدکاروں کے آپ جانی دشمن تھے آپکی زبان اور درہ سے غریب امیر۔ حاکم محکوم۔ جو کوئی سزاوار ہو۔ باران رحمت کی طرح یکساں ترشح حاصل کرتے تھے۔

آپ منصف مزاج پرلے درجہ کے تھے۔ اور آپکا انصاف ایسا سخت گیر ہوتا تھا کہ اس میں نہ توکسی قسم کی رعایت ہوتی اور نہ اُسکے اندر رحم کی گنجائش ہوتی؛

خالدؓ ابن ولید۔ اسلام کا ایک بہت بھاری جنرل گذرا ہے۔

پہلے زمانہ میں اور انکے بعد ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں خالد نے مرتدوں کو شکستیں دے کر اور انکو قتل کرکے بغاوت کے سانپ کو کچل دیا تھا۔ اور عربستان کو رِدّۃ اور سرکشی کے خس وخاشاک سے پاک وصاف کردیا تھا۔

اسکے بعد اس نے عراق عرب میں نمایاں فتوحات حاصل کیں اور شام میں یرموک کے مقام پر رومیوں کو شکست فاش دی۔

ان کارنمایاں کے سبب سے خالد کا نام مسلمانوں کے اندر زبان زد خاص وعام ہوگیا تھا۔ اور دشمنوں کے دلوں میں بھی انکے رعب کا سکہ بیٹھ گیا تھا۔ مُسلمان درحقیقت خالد کو سیف اللہ سمجھتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ کفر اور شرک کو صفحہ ہستی سے دُور کرنیکی غرض سے خدا نے خالد کو پیدا کیا ہے۔ اس وجہ سے خالد مسلمانوں میں ہردلعزیز ہوگئے تھے اور ہر کوئی اُنکو عزت اور توقیر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

سجاحۃ الکذابؔ[1] کی مہم سے فارغ ہوکر خالد نے مالک بن نویرا کے اوپر چڑھائی کی اور مالک کے حالات دریافت کرنے کے لئے ابوقتادہ کو جاسوسی کرنے کی غرض سے مالک کے قبیلہ میں بھیجا

---

[1] طبری

مگر جاسوس کے خبر لانے سے پہلے ہی مالک کے ساتھ لڑائی ہوگئی اور مالک مارا گیا اور اسکی جوان بیوہ کو خالد نے اپنے حرم میں داخل کر لیا۔

جب ابو قتادہ واپس آئے تو انہوں نے رپورٹ دی کہ مالک تو مسلمان تھا اور صلوٰۃ اور زکوٰۃ دونوں کا پابند تھا۔ جب ابو قتادہ کو معلوم ہُوا کہ مالک مارا جاچکا ہے اور اسکی بیوی کے ساتھ خالد نے شادی بھی کرلی ہے تو وہ خالد سے ازحد بگڑا اور مدینہ جاکر شکایت کی کہ خالد نے ایک مسلمان کو قتل کرکے اسکی بیوی کے ساتھ شادی کرلی ہے[1]۔

اس زمانہ میں خلیفہ ابوبکرؓ تھے۔

جب حضرت عمرؓ نے یہ قصہ سُنا تو وہ سخت ناراض ہُوئے اور ابوبکرؓ سے کہہ کر خالد کو جوابدہی اور سزا کے لئے طلب کروایا۔

خالد بہت ہوشیار آدمی تھے۔ جب مدینہ میں پہنچے تو انہوں نے یہ حکمت کی کہ پہلے جاکر بلال کو ملے۔ بلال ابوبکر کے حاجب تھے۔ انکو دو اشرفیاں نذر دیکر کہا۔ خلیفہ کے ساتھ ایسے وقت میری ملاقات کروادو جس وقت عمر وہاں موجود نہ ہوں انہوں نے ایسا ہی کیا۔

دوسرے دن خالد خلیفہ کو ملنے گئے۔ باہر عمر کھڑے تھے۔ خالد کو دیکھتے ہی بُرا بھلا کہنا شروع کیا اور اسکے گریبان میں ہاتھ ڈال کر گھسیٹتے ہُوئے خلیفہ کے کمرہ کی طرف لے گئے۔ دروازہ پر بلال کھڑے تھے۔ انہوں نے دونوں کو روکا اور کہا کہ مجھکو خلیفہ کو پہلے اطلاع کرلینے دو۔

بعد میں باہر آکر کہا کہ خلیفہ نے خالد کو یاد کیا ہے۔ عمر بھی خالد کے ہمراہ اندر گھسنے کو تھے کہ بلال نے روکا اور کہا کہ خلیفہ نے صرف خالد کو بلایا ہے۔

---

[1] ابوقتادہؓ کو مالک ابن نویرا کے متعلق مغالطہ ہُوا ہے۔ مالک ابنِ نویرا مرتدین کے لشکر کی قیادت کرتا ہُوا مارا گیا۔ مرتدوں کا سپہ سالار مسلمان کبھی نہیں ہوسکتا۔ حضرت خالدؓ جیسے جلیل القدر صحابی سے ایسی توقع کبھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی مسلمان کو اسلئے قتل کردیں تاکہ اُسکی بیوہ پر تصرف کا موقعہ ملے۔ انکی معزولی کی اصلی وجہ یہ ہے کہ انکی بیکران فتوحات سے عام مسلمان یہ سمجھنے لگے تھے کہ اسلامی فتوحات کا باعث صرف خالدؓ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اسی خدشہ کا اظہار کرتے ہوئے خلیفۂ اولؓ سے فرمایا کہ تم خالدؓ کو معزول کردو کیونکہ عوام خالدؓ ہی کو فتوحاتِ اسلامی کا سبب سمجھنے لگے ہیں حالانکہ خدائے تعالیٰ اسلام کی مدد فرمارہا ہے۔

جائنٹ ایڈیٹر۔

خالد جب ابوبکر کے سامنے کھڑے ہوئے تو ابوبکر نے اُن سے پوچھا۔

قتلت مسلماً و عرست بامرتہ؟ کیا یہ سچ ہے کہ تو نے ایک مسلمان کو قتل کر کے اسکی بیوی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ خالد نے جواب دیا:۔

انشدک باللہ ہل سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول خالد ابن ولید سیف اللہ فی الارض" تمہیں کیا یاد نہیں کہ پیغمبرؐ جب زندہ تھے تو کہا کرتے تھے کہ خالد ابن ولید دنیا میں شمشیرِ خدا ہے ابوبکرؓ نے کہا واللہ نعم۔ بخدا مجھے یاد ہے۔ تو پھر خالد نے کہا۔

فلم یکن اللہ لیعرف سیفہ لایقتل کافراً ومنافقاً۔ تو کیا ممکن ہے کہ کافر اور منافق کے سوا خدا اپنی تلوار کو کسی اور کے اوپر چلائے۔

یہ سُن کر ابوبکر نے کہا صدقت۔ انصرف من ذالک الی عملک۔ تو نے سچ کہا جا اپنا کام کر یہ دیکھ کر عمر بہت جھنجھلائے۔ انکو پورا یقین تھا کہ خالد خلیفہ کو فریب دے کر بچ گیا ہے۔ اس بات کو عمر نے اپنے دل میں رکھا۔

خلیفہ ہوتے ہی سب سے پہلے اُنھوں نے خالد کی معزولی کا فرمان جاری کیا۔ ابوعبیدہ نے انکی نسبت بہت سفارش کی کہ یرموک کی فتح خالد کے ہاتھوں ہوئی اگر وہ نہ ہوتا تو یہ فتح مسلمانوں کو نصیب نہ ہوتی مگر عمر نے ایک نہ سُنی بلکہ اور چند الزام لگا کر معزولی کے علاوہ کئی ہزار درم اس پر جرمانہ کیا۔

عمرو ابن العاص۔ فاتح مصر اور وہاں کے والی تھے۔

روایت کی جاتی ہے کہ ایک قبطی نے عمر ابن الخطاب کے پاس جا کر شکایت کی کہ تمہاری سلطنت میں بہت ظلم ہو رہا ہے۔ خلیفہ نے اُس سے کیفیت پوچھی۔

قبطی نے کہا کہ ایک روز عمرو ابن العاص رسالہ کا معائنہ کر رہا تھا اور اس کا لڑکا محمد اسکے ہمراہ تھا۔ جب وہ میرے قریب پہنچا۔ اسکے بیٹے کو میرا گھوڑا پسند آیا اور کہنے لگا کہ یہ گھوڑا تو نے کہاں سے لیا۔ یہ گھوڑا تو میرا ہے۔ میں نے کہا کہ واللہ یہ گھوڑا میرا ہے اِسپر محمد نے مجھے مار کر نکال دیا اور میرا گھوڑا مجھ سے چھین لیا۔ !! یہ

یہ سُن کر خلیفہ نے محمد اور عمرو ابن العاص کو مدینہ حاضر ہونے کا فرمان بھیجا۔ جب وہ دونوں

حاضر ہوئے تو خلیفہ نے قبطی کو دُرّہ دیکر کہا کہ جس طرح اس نے تمہیں مارا ہے اسی طرح تم بھی اس کو مارو۔ قبطی نے محمد کو مارنے کے بعد چند کوڑے عمرو ابن العاص کو بھی رسید کئے۔ وہ پکار اُٹھا کہ جس نے مارا تھا اسکو تو سزا دی گئی مجھکو بے گناہ کیوں مارا جاتا ہے۔ خلیفہ نے کہا۔ اس لئے کہ تم آئندہ آزاد مسلمانوں سے اپنی بندگی نہ کرواؤ۔ !!![1]

مغیرہ بن شعبہ۔ ایک اور اسلامی مدبر اور فوجی افسر گذرا ہے۔

یہ شخص بصرہ کا حاکم تھا۔ حضرت عمر جب شام کا دورہ کر رہے تھے تو انکو خبر پہنچی کہ مغیرہ بدچلنی کرتا ہوا پکڑا گیا ہے۔ آپ نے مغیرہ کے نام فوراً معزولی کا حکم[2] روانہ کیا۔ اور ابو موسی الاشعری کو اس کی جگہ والی مقرر کر دیا۔

مفصلہ بالا تین مثالیں اس بات کو ثابت کرنے کے لئے پیش کی گئی ہیں کہ انصاف کرتے وقت خلیفہ کو اس بات کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ مجرم بڑا آدمی ہے یا چھوٹا ہے۔

دیانت داری۔ آپکو اپنے فرایضِ منصبی کا اس قدر خیال تھا کہ ہمیشہ کہا کرتے کہ جو شخص مسلمانوں کا امیر ہے وہ درحقیقت انکا خادم ہے۔

اپنے خرچ کے مصارف کے لئے فقط ۵ ہزار درم[3] سالانہ بیت المال میں سے لیا کرتے وہ بھی بہت اصرار کے بعد ورنہ بہت عرصہ تک تو بغیر کسی عوضانہ کے خلافت کا کام سرانجام دیتے رہے کئی دفعہ ایسا اتفاق بھی ہو جاتا کہ تنخواہ ملنے سے پہلے آپ نفقہ صرف کر بیٹھتے تو ایسی حالت میں جا کر آپ امین بیت المال سے قرضہ مانگ لاتے اور جب وظیفہ ملتا تو اسکو ادا کر دیتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت عمر نے قیصر روم کی طرف ایک ایلچی روانہ کیا۔ حضرت عمر کی بیوی نے ملکۂ روم کے لئے خوشبودار تیل کی ایک بوتل اس کے ہاتھ بطور ہدیہ بھیجی۔

جب ایلچی قسطنطنیہ سے واپس آیا تو ملکۂ روم کی طرف سے خلیفہ کی بیوی کے لئے بہت سے ریشمی کپڑے اور جواہرات لایا۔ عمر کی بیوی نے اپنی عمر بھر میں کبھی ایسی قیمتی چیزیں نہیں دیکھی تھیں۔ دیکھ کر حیران ہو گئی اور انکو مکان کے صحن میں پھیلا کر اپنی سہیلیوں کو دکھا رہی تھی کہ اتنے میں حضرت عمر تشریف لائے۔ زرق برق کپڑوں کو صحن میں بچھا ہوا دیکھ کر بیوی سے

---

[1] طبری [2] تاریخ تمدن اسلام [3] ایک درم تقریباً ساڑھے تین آنہ کا ہوتا ہے۔

پوچھا کہ یہ چیزیں تمہیں کہاں سے ملیں۔ اس نے کہا کہ قیصر روم کی بیوی نے مجھے ہدیہ بھیجا ہے۔
یہ سنتے ہی آپ تمام زیورات اور کپڑوں کو اُٹھا کر مسجد میں لے گئے اور مسلمانوں کو بلا کر پوچھا کہ اس مال کے بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے۔؟
سب نے یکزبان ہوکر کہا کہ چونکہ ملکۂ روم نے یہ چیزیں تمہاری بیوی کے لئے بھیجی ہیں یہ اُنکا ہی مال ہے دوسرے کسی مسلمان کا اس میں حق نہیں۔
خلیفہ عمرؓ نے کہا کہ ایلچی جو یہاں سے گیا تھا وہ امیر المومنین کا بھیجا ہوا تھا۔ اور جس اونٹ پر سوار ہوکر گیا وہ بھی امیر المومنین کا تھا۔ لہٰذا جو مال وہ قسطنطنیہ سے اُٹھا کر لایا وہ مال بھی امیر المومنین کا ہے۔ یہ کہکر تمام کپڑے اور زیورات وہیں نیلام کر دئے اور تمام روپیہ بیت المال میں داخل کیا فقط ایک دینار اس میں سے اپنی بیوی کو تیل کی قیمت کے عوض میں دیا جو اس نے ملکۂ روم کو بھیجا تھا۔
جس طور پر آپ زاہدانہ اور سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے اسی طرح کے آپکو گورنر بھی پسند تھے ایک دفعہ آپ ابو عبیدہ والیٔ شام کے گھر گئے تو دیکھا کہ ایک کونہ میں لگام ہے اور پالانِ شتر پڑی ہوئی ہے ایک طرف تلوار اور برچھی رکھی ہے اور ایک کوزہ اور رکابی کے سوا مکان میں اور کچھ اثاث البیت نہیں۔ خلیفہ نے ابو عبیدہ سے کہا کہ تیرا مال اسباب فقط اتنا ہی ہے اور تو شام کا حاکم ہے!!

خلافت عمر ابن الخطاب۔ جب ابو بکر بستر مرگ پر بیمار تھے اور انہیں زندگی کی اُمید نہ رہی تو انہوں نے عثمان اور عبدالرحمٰن بن عوف سے خلافت کے بارہ میں مشورہ کیا۔ اور پوچھا کہ عُمر کے بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے۔ دونوں نے کہا کہ اور تو سب کچھ اچھا ہے۔ فقط اس کا مزاج بہت سخت ہے اس لئے ہمیں اندیشہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں پر ظلم کریگا۔
اس کے بعد ابو بکر نے انصار اور مہاجرین کو جمع کر کے کہا کہ اگر میں کسی ایسے شخص کو اپنا جانشیں بناؤں جو میرا رشتہ دار نہیں تو تمکو منظور ہوگا۔ سب نے جواب دیا کہ ہاں۔ اسکے

سلہ سید احمد ابن السید زینی دحلان

بعد آپ نے عمر کو نامزد کیا۔ طلحہ بن عبداللہ نے عمر کی سخت مزاجی کے سبب سے اعتراض کیا۔ ابوبکر نے کہا کہ اس امر میں میرا دل صاف ہے اور میں خدا کو جواب دینے کو تیار ہوں کہ مسلمانوں میں سے بہترین اور لائق ترین شخص کو میں نے خلیفہ تجویز کیا ہے۔

اسکے بعد عثمان کو بلاکر استخلاف کا فرمان[1] لکھوا دیا۔

سب سے پہلے علی نے اور اسکے بعد سب حاضرین نے عمر ابن الخطاب کے ہاتھ پر بیعت کی اور ابوبکر نے ہاتھ اٹھا کر دعا[2] مانگی۔

کرنل بھولا ناتھ

ایک بار حضرت عمرؓ بازار میں تشریف لے جارہے تھے ایک شخص نے کہا کہ عمر! کیا حاملوں کے لئے چند قواعد مقرر کرنے سے تم عذابِ الٰہی سے بچ سکتے ہو؟ کیا تم کو خبر نہیں کہ عیاض بن غنم حاکم مصر باریک کپڑے پہننا اور اسکے دروازہ پر دربان رہتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے محمد بن سلمہ کو حکم دیا کہ عیاض کو جس حالت میں ہولے آؤ۔ یہ گئے تو دیکھا کہ دروازہ پر دربان بھی موجود ہے اور وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ عیاض اسی حالت مدینہ لائے گئے۔ حضرت عمرؓ نے انکا باریک قمیص اتروا کر بالوں کا پہنایا۔ اور بکریوں کا ایک گلہ منگا کر حکم دیا کہ ان کو جنگل میں لیجاکر چراؤ۔ عیاض کو مجال انکار تو تھی نہیں مگر بار بار کہتے تھے کہ اس سے تو مر جانا بہتر ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تجھکو اس سے عار کیوں ہے۔ تیرے باپ کا نام غنم اسی وجہ سے پڑا تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتا تھا۔

دین و دنیا

---

[1] بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ھذا ما عھد ابوبکر بن ابی قحافۃ فی آخر عھدہ بالدنیا خارجاً منھا وعند اول عھدہ بالآخرۃ داخلاً فیہ حیث یومن الکافر و یوقن الفاجر و یصدق الکاذب۔ استخلفت علیکم بعدی عمر ابن الخطاب۔ اسمعوا و اطیعوا (فتوحات اسلامی)

[2] اللھم انی لم ارید بذلک الا اصلاحھم و خفت الفتنۃ علیھم۔ وفعلت بما انت اعلم بہ و اجتھدت لھم رای فولیت خیرھم و اقواھم و احرصھم ما یرشد ھم وقد حضرنی فی امرک ما حضرنی فاخلفنی فیھم فھم عبادک ونواصیھم بیدک اللھم اصلح ولاتہ واجعلہ من خلفاء الراشدین واصلح لہ رعیۃ۔

مذہب

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں جتنے مذاہب ہیں انکی بنیاد نہایت نیک نیتی سے ڈالی گئی ہے اور گو جہل نے کچھ بیہودہ رسم ورواج کو مذاہب میں داخل کرکے انکی اصلی حقیقت روپوش کردی ہے۔ تاہم اس کا الزام بانئ مذاہب پر عائد نہیں ہو سکتا۔ وہ سب یقینی بنی نوع انسان کے محسن تھے۔ اور اُن سب کی تعظیم کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ ہندوستان کو بالخصوص مذہب کا سودائی کہا جاتا ہے۔ اور اس کے جہل کو عموماً اس کا سبب قرار دیتے ہیں۔ ہم اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہینگے۔ کہ مذاہب کے پردوں میں گناہ کبیرہ ہوتے ہیں سینکڑوں بندگان خدا کا خون ہوتا ہے۔ ہزاروں حق تلفیاں عمل میں آئی ہیں۔ اور اس کی ذمہ واری بڑی حد تک اندھی تقلید اور جہل مرکب پر ہے۔ ورنہ مذہب تو امن عامّہ اور اخلاق حمیدہ کی تعلیم دیتا ہے ہندوستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس نے مذہب کے دائرۂ عمل کو محض دینی فرایض تک محدود کر رکھا ہے۔ اور دنیادی امور میں اسکے پیرؤں کا رَوَیہ بالکل برعکس ہے۔ جس کے دل میں بندگان خدا کی محبت نہ ہوگی وہ خدا کی محبت کا کیونکر دعوےٰ کرسکتا ہے جو برق۔ ہوا۔ پانی اور دیگر عطیات ربی سے پورا استفادہ حاصل نہ کرسکے وہ خالق کا ناشکرگزار ہے۔ اور اس کی عظمت اس کے دل میں پوری نہیں پیدا ہوسکتی۔ جب مذہبی تعلیم کا دُنیادی امور میں ہمارے دل پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اور ہم اپنے اخلاق اور دیگر خصائل میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھتے۔ جب ہم اپنے نفس امّارہ پر قابو نہیں پا سکتے۔ جب اپنی خواہشاتِ حیوانی کو فرو نہیں کرسکتے۔ تو دیندار ہونا درکنار انسان بننا ہی مشکل ہے۔ جب مذہبی احساس کے باوجود ہمارا یہ حال ہو۔ تو اگر ہمیں کوئی مذہب کا سودائی کہے۔ تو کیا بیجا ہے۔

ہم محض مذہب کے نام پر عاشق ہیں۔ ورنہ فی الحقیقت ہمارا کوئی فعل اس کے مطابق نہیں۔ مذہب کی روسے بنی نوع انسان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں۔ انکی تکمیل بالکل نہیں کیجاتی۔ دنیادی فرائض دین سے جُدا نہیں۔ اگر دین کے رموز بڑے سے بڑے عاقل کے

نزدیک ابھی تک رازِ سربستہ کے مرادف ہیں۔ تو دنیوی فرائض بچے پر بھی آشکار ہیں جرمی ٹیلر کا قول ہے کہ:-

"دنیاوی فرائض کے اصول اپولو کے نصائح کی طرح نہیں۔ جو ذومعنی اور دقیق ہوں۔ جن کے مطالب رازِ سربستہ کی طرح نہاں۔ جنکی نوعیت پُرفریب۔ اور جو قول سے فعل میں آتے وقت بالکل برعکس ہوں مگر دنیاوی فرائض کے متعلق اقوال خداوندی بابِ فردوس کی طرح کشادہ ماہ منور کی طرح روشن اور اپنی خوبیوں میں مہر جہانتاب کی طرح صحت بخش ہیں۔ یہ یقینی صحیح ہے۔ کہ جو شئے آنکھ سے اوجھل ہو۔ گو انسان کی عقل اسکے تجسس پر مجبور ہو۔ تاہم اگر اسکی پوری حقیقت معلوم نہ کرسکے تو مورد الزام نہیں البتہ اس حد تک اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ جہانتک اسکی حقیقت بیّن طور پر عقل میں آسکے"

ہستی باری تعالیٰ کے متعلق ہوکر کی جادونگاری ملاحظہ طلب ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"انسان کی محدود اور ناقص عقل کا اس اعلیٰ اور برتر ہستی کی مشیت اور حکمت کا سراغ لگانا خطرے سے خالی نہیں گو اس مالک حقیقی کی معرفت ہماری روح رواں اور اسکے متبرک نام کے اظہار میں ہماری حقیقی مسرت پنہاں ہے مگر پھر بھی اس ذاتِ مقدس کے متعلق ہماری سب سے بڑی قابلیت کا اظہار اسی میں ہے۔ کہ جو کچھ ہم اسے سمجھ رہے ہیں۔ وہ اس سے مبرّا ہے۔ یا یہ کہ وہ ہمارے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ اس کے متعلق ہمارا سکوت ہماری بہترین گویائی کا ثبوت ہے۔ جب ہم بلا اعتراف ہی اس کی ناقابل تشریح شان اور عظمت کے معترف ہیں۔ جو ہمارے احاطہ علم سے باہر ہے"

ہوکر نے ایک جگہ بچوں کی تربیت کے بارے میں اپنی یہ رائے دی ہے کہ "اُن کے دلوں میں خدائے عز اسمہ کی سچی محبت اور وقعت قائم کردی جائے۔ اس مسئلہ کو زیادہ وضاحت سے بیان نہ کیا جائے ابتداً اسی قدر کافی ہے۔ مبادا اس قدر جلد روحانیت کی تعلیم دینے سے یا تو بچہ کا دماغ باطل پرستی کے مادے سے پُر ہو جائیگا یا وہ باری تعالیٰ کی ہستی کو قیاس کرتے گھبرائیگا۔ اور میرے خیال میں تو یہی مناسب ہے۔ کہ لوگ خدا کی ہستی کے متعلق اس (اعتقاد) پر اکتفا کریں۔ اور اس مقدس ذات کے متعلق ضرورت سے زیادہ تجسس نہ کریں۔ جسکو سب نے بالاتفاق بیرون وہم قیاس مانا ہے۔ کیونکہ اکثر لوگوں کے تخیل میں وہ قوت اور لطافت نہیں ہوتی جسکی رہنمائی سے وہ حق و باطل میں تمیز کرسکیں۔ اس لئے اکثر توہمات اور بت پرستی کی ظلمت میں

آکر صفات خداوندی پر انسانی صفات کا اطلاق کرنے لگتے ہیں۔ یا (چونکہ اس سے زیادہ کچھ قیاس ہی نہیں کر سکتے) اس کی ہستی ہی کے منکر ہو جاتے ہیں"

دُنیا کے جملہ مذاہب نے ہستی باری تعالیٰ کو تسلیم کیا ہے۔ اور کوئی فلاسفر ایسا نہیں جس نے کسی نہ کسی طریقہ پر اس اعلیٰ اور برتر ذات کا اعتراف نہ کیا ہو۔ جو مذہب فطرت سے زیادہ نزدیک ہوگا۔ وہ بے شک زیادہ قابل وقعت ہوگا۔ مذاہب میں اصول حفظانِ صحت۔ علم الاخلاق۔ ترغیب شجاعت۔ حقوق نسوان۔ وغیرہ وغیرہ محض نظام دنیوی اور حیاتِ انسانی قایم رکھنے کیلئے مقرر کئے گئے ہیں۔ مذہبی رنگ میں انکی اہمیت اَور زیادہ ہو گئی ہے۔ اور ہر متنفس ان کی پابندی پر مجبور ہے۔ مگر افسوس ایسا نہیں ہوتا۔ عالم بے عمل جاہلِ مطلق سے زیادہ قابلِ ملامت ہے۔ آخر الذکر کو اپنے فرائض کا احساس نہیں۔ محض اس لئے کہ وہ اُن سے لاعلم ہے۔ اوّل الذکر کو احساس ہے۔ مگر پھر بھی طرز عمل برعکس ہے۔ یہ ایک ناقابل معافی تصور ہے۔ اگر ہم خدا کو حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔ تو یقیناً ہمارے دنیاوی اعمال میں لغزش نہیں آسکتی۔ اگر ہم واقعی موت کو برحق جانتے ہیں۔ تو بدی کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ مگر ہم نے مذہب کے دائرہ عمل کو بالکل محدود کر دیا ہے۔ ورنہ بقول لارڈ ایسبری :۔

"مذہب دینوی اشغال میں ہمارے چال چلن کا رہنما۔ ہماری حرکات و سکنات کا آئین ہے۔ آسودگی کے زمانہ میں ہمارا محافظ۔ ایام مصیبت میں موجب راحت ہنگام تفکر میں ہمارا معاون۔ خطرے میں پناہ اور رنج میں مشفق ہے"

فنش نے کیا خوب کہا ہے:۔

"مذہب محض اس مشغولیت کا نام نہیں۔ جو اوقات مقررہ پر لوگ ارکانِ دین ادا کرنے میں عمل میں لاتے ہیں بلکہ یہ ایک ایسی مستور روح ہے جو ہمارے خیالات اور افعال میں جاگزین ہو کر انکو اعلےٰ اور برتر بنا دیتی ہے"

ایک سچے مذہب میں ناقابل عمل باتیں نہیں ہو سکتیں۔ نہ بیرون قیاس مسائل کا طومار ہو سکتا ہے۔ اس کا حرف حرف انسانی فطرت کو لئے ہوگا۔ اور انسان جس طرح عقبیٰ کے نفع کے لئے اس کی پیروی کریگا۔ اسی طرح دنیاوی بہبودی بھی اس کی تقلید سے پیدا ہو گی۔

کیونکہ دنیا تو مزرعۂ آخرت ہی کا نام ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تقریر میں اہل یہود کو یوں مخاطب فرمایا تھا:-

"یہ حکم جو میں آج تمہارے روبرو بغرض تعمیل پیش کر رہا ہوں۔ نہ تو تم سے پوشیدہ ہے۔ نہ بیرون قیاس نہ بہشت میں ہے۔ کہ تم کہنے لگو۔ کون وہاں جائے اور اُسکو لائے نہ سمندر پار ہے کہ تم کہنے لگو۔ کون وہاں جائے تاکہ ہم اسکو سند لاکر عمل پیرا ہوں۔ مگر میرے حکم کے الفاظ تم سے بہت قریب ہیں۔ یعنی تمہاری زبان پر ہیں۔ تمہارے دل میں۔ کہ تم زیر عمل کر سکو۔"

مذہب کی بنا اعتقاد راسخ پر ہے۔ اور اگرچہ سلڈن نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ تاہم اس کا قول لطف سے خالی نہیں۔ وہ کہتا ہے:-

"لوگ محض فتنہ فساد مٹانے کے لئے ہم مذہب ہونے کا اعتراف کر لیتے ہیں ورنہ اعتقادات میں اسقدر اختلاف ہے۔ کہ دنیا میں تین شخص بھی ایسے نہ ملینگے جو تمام مذہبی امور میں ایک ہی اعتقاد رکھتے ہوں"

شک کو فلسفہ کی بنیاد تصوّر کیا جاتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ گلستانِ فطرت کے طلسم ایسے ہی ہیں۔ کہ انسان کو مبہوت بنا دیتے ہیں۔ مگر بعض چیزیں ایسی ہیں۔ جن کا ہمارے دل کو کافی احساس ہے مگر زبان سے ادا نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ زبان دلی خیالات کے اظہار کرنے کا ایک ناقص آلہ ہے۔ سینٹ آگسٹائین نے اپنے دوست سے کہا تھا کہ:-

"اگر تم مجھ سے وقت کی تعریف پوچھو تو نہیں بتا سکتا۔ اگر نہ پوچھو۔ تو کہونگا۔ کہ جانتا ضرور ہوں"

یہی حالت ہستئ خدا اور بعض احکامات خداوندی کی ہے۔ جن کی پوری حقیقت انسان پر منکشف نہیں ہو سکتی۔

غلام حیدر

حیاتِ ثانی

پروفیسر منصور احمد کا نام ہندوستان کے علاوہ ممالکِ غیر مثل جاپان، امریکہ و فرانس تک مشہور تھا۔ ہپناٹیزم، مسمریزم، خرقِ عادات اور اسی قسم کے جملہ علوم میں اُس کا مطالعہ وسیع اور مشق اس بلا کی تھی کہ لوگ اُسکو ایک مافوق العادت ہستی تصوّر کرتے تھے۔ ایک مخصوص حلقہ میں وہ ساحر اور جادوگر سمجھا جاتا تھا۔ بڑے پیچیدہ و کہنہ امراض کو صرف ہاتھ سے چھُوکر زائل کر دیتا، بُری سے بُری عادت کو صرف ایک تنبیہ سے توبہ کرانا، سینکڑوں میل کے فاصلہ سے دو انسانوں کو باہم گفتگو کرا دینا، پوشیدہ امور کا اظہار کرنا، قلبی حالات و انکشافات اُس کے روزمرہ کے معمول تھے۔ پروفیسر کے علم و کمال کا ہر جگہ چرچا اور ایک عالم میں اسکی دھوم مچی ہُوئی تھی۔

حاجتمندوں کی ایک بھیڑ ہر وقت آپ کے مکان کے سامنے حاضر رہتی تھی، جو شخص بھی کوئی خواہش لیکر آتا جوابِ صحیح لیکر پلٹتا تھا۔ مگر سب سے بڑی قباحت یہ تھی۔ کہ پروفیسر صاحب عدیم الفرصت تھے۔ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ مطالعۂ فطرتِ انسانی پر صرف کرتے تھے، مہینہ بھر میں صرف ۱۵ دن کام کرتے اور بقیہ ایام کسی نامعلوم مقام پر جاکر رہائش رکھتے تھے۔ تاکہ کثرتِ کار و مطالعہ کی شدت کے بعد طبیعت میں آرام و سکون پیدا ہو سکے۔ کام کے پندرہ دن میں ایک منٹ کی فرصت بھی مشکل تھی۔ یہی باعث تھا کہ سوالات کرنے والوں کے لئے کم از کم فیس ۱۵ روپیہ رکھی تھی، بعض سے ہزار پانچسو بھی لئے جاتے تھے۔ پھر بھی صبح سے لیکر شام تک برابر کام کرنا پڑتا تھا۔ آپکے سکرٹری مسٹر ظہور احمد کا بیان ہے کہ آپکی ہفتہ بھر کی آمدنی۔ دو لاکھ پانچ ہزار روپیہ کے درمیان تھی۔

پروفیسر صاحب کا طلسم گھر وادی بندر بمبئی کے سامنے اُسی چھ لاکھ روپیہ کی رقم خطیر سے تیار کیا گیا تھا جو امریکہ کی ہپناٹزم لیگ کی طرف سے پروفیسر موصوف کو ایک مضمون "رُوح کے تبدیل اجسام" پر پڑھنے اور چند عملی تجربات دکھلانے کے معاوضہ میں پیش کی گئی تھی۔ اس

عمارت کا نقشہ ایک لایق آسٹرین انجینیر نے تیار کیا تھا اور اس میں اُن تمام ضرورتوں کا بخوبی لحاظ رکھا گیا تھا جو ایک ماہر ہپناٹیزم کی جان ہوتے ہیں، اِس مکان کے دو راستے تھے، ایک سامنے کے بازار کی طرف سے اور دوسرا پُشت کے بازار کی طرف سے تھا۔ مکان دو حصوں میں منقسم تھا، نصف حصہ جس میں پورے اٹھارہ کمرے تھے پروفیسر صاحب کے مطب، دار المطالعہ، دار التجربہ و پرائیویٹ رہائش کے کام میں آتے تھے اور بقیہ نصف حصّہ ایک پارسی لیڈی نے کرایہ پر لے رکھا تھا۔

۲۶ نومبر ۱۹۰۵ء چار بجے شام کا وقت تھا، پروفیسر منصور احمد اپنی ملاقات کے کمرہ میں بیٹھے ہُوئے تھے، سُرخ و سپید مضبوط چہرا۔ بڑی کشادہ بلند پیشانی، سر کا وسطی حِصّہ مُنڈا ہُوا، اور بقیہ سر میں لمبے لمبے بال جو سر کے چاروں طرف کانوں کے نیچے گردن تک پھیلے ہوئے تھے، بالوں میں بڑے بڑے گھونگر، سیدھی بلند عقابی ناک بڑی بڑی تیز و تند آنکھیں۔ ٹھوڑی لمبی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، ڈاڑھی مُنڈی ہُوئی، چوڑا چکلا سینہ، تمام اعضا مضبوط، پوری تندرستی، اگرچہ عمر پنتالیس سال کے قریب تھی لیکن چہرہ پر ابھی تک شباب کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اس وقت آپکے بالمقابل ایک عجیب الخلقت مخلوق پستہ قامت جاپانی بیٹھا ہُوا تھا، یہ چار ساڑھے چار فٹ اونچا ہپناٹیزم کا پروفیسر ڈاکٹر نکولا تھا۔

ملحقہ کمرہ میں سیکرٹری بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا اور دونوں پروفیسروں کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا جو صبح سے کسی لاینحل مسٔلہ پر بحث و تمحیص میں مصروف تھے اور اس عرصہ میں بھوک پیاس بھی اُنکی توجہ کو اپنی طرف راغب کرنے میں ناکام تھی۔ کبھی عالم سرگوشی میں باتیں ہونے لگتیں کبھی جوش و خروش سے تمام کمرہ کو سر پر اُٹھا لیتے تھے، دوران گفتگو میں پروفیسر منصور احمد نے زور سے ایک مکّا میز پر مار کر کہا۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں، موت بدلی جا سکتی ہے، میں مر بھی سکتا ہوں، اور زندہ بھی ہو سکتا ہوں .... لیکن وہ موت جو آخری موت ہے اور جسکو خدائی موت کہتے ہیں اُس پر فتح پانا محال۔ مشکل۔ ناممکن ....

سیکرٹری کا جسم مانند بید کے کانپنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ تمام مکان بھونچال

کے صدمات سے لرزرہا ہے درودیوار کانپ رہے ہیں، ہزاروں روحیں اسکے اردگرد حلقہ کئے کھڑی ہیں۔ عین اس اضطراب وخوف کے عالم میں سیکرٹری کی توجہ اُس گھنٹی کی آواز کی طرف رجوع ہوگئی جوکسی نووارد کی آمد کی اطلاع بڑے زور سے کررہی تھی۔ سیکرٹری نے دروازہ کھولا اور مسٹر مقبول حسن کوکمرہ کے اندر لے آیا۔ دونوں نے تپاک سے ہاتھ ملائے۔

سیکرٹری:۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ تشریف لے آئے۔ میں تنہائی میں خوف کھارہا تھا۔

مقبول حسن۔ تنہائی میں خوف کس سے۔ اور پھر پروفیسر کے مکان میں۔

سیکرٹری۔ آج صبح سے ایک بالشتئے آدمی سے موت، روح، زندگی، مرد، عورت، طاقت، وغیرہ کے ناموں کی گردان ہورہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب کی قوتیں ترقی پکڑکر موت و زندگی پربھی اثر ڈالنے والی ہیں۔

مقبول حسن۔ اوراس سے آپکو خوف کھانے کی ضرورت، وہ ایک محقق ہیں، جوسوچتے ہیں کر دکھاتے ہیں، خیر میری اطلاع اندر کردیجئے۔

اطلاع کرنے پر مسٹر مقبول حسن فی الفور اندر طلب کرلئے گئے۔

پروفیسر منصور احمد:۔ (تعارف کراتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب! یہ میرے عزیز ترین دوست مسٹر مقبول حسن ہیں۔ جوگلوب تھیٹریکل کمپنی کے مالک ہیں، جب میں کثرت کار سے تھک جاتا ہوں تومیری دلچسپی کا مرکز صرف آپکی ذات ہُوا کرتی ہے۔

اور آپ جاپان کے مشہور عالم ہپناٹیزم ڈاکٹر نکولا آف ٹوکیو ہیں،

اس پر دونوں اصحاب نے باہم ہاتھ ملائے اور رسمی مزاج پرسی ہُوئی۔

ڈاکٹر نکولا۔ (گفتگو کے سلسلہ کو جاری رکھنے کی غرض سے) تھیٹر بھی اپنی ایک جداگانہ زندگی اور علیحدہ دورِحیات رکھتا ہے۔ آپ لوگوں کو جذباتِ انسانی کی نقل اُتارنے کی بہترین مشق حاصل ہے۔ شاید ہمارا جھگڑا طے کرنے میں آپکی رائے مفید ثابت ہوسکے۔

مقبول حسن۔ شوق سے فرمائیے، جوکچھ مجھے معلوم ہوگا اُسکے بتلانے میں مجھے دریغ نہیں۔

پروفیسر۔ تصفیہ طلب یہ مسئلہ ہے کہ اس دنیا میں عورت خوش ہے یا مرد؟

مقبول حسن۔ ہمارا تجربہ توصرف اس قدر ہے کہ مرد سے پوچھئے تو وہ کہیگا کہ عورت خوش ہے

اور عورت سے معلوم کیجئے تو وہ یہی کہیگی کہ مرد اچھا ہے۔ یعنی انسان کسی حالت پر قناعت نہیں کرتا۔
پروفیسر۔ لیکن جو انسان دونوں حالتوں سے لذت چشیدہ ہو، اسکی رائے تو ضرور قابلِ تسلیم ہوگی؟
دونوں۔ (ایک زباں ہوکر) بے شک۔
پروفیسر۔ (گھبراکر) اچھا میں اس قسم کے انسان کو کچھ عرصہ کے بعد شہادت دینے کے لئے پیدا کر دکھاؤنگا۔"

اسکے بعد گفتگو کا رُخ پھر پلٹا، نئے نئے ڈراموں، ہندوستان کی سٹیج کی موجودہ حالت، وغیرہ پر خوب گپ شپ ہوتی رہی، اسی گفتگو کے دَوران میں مقبول حسن نے پروفیسر صاحب کو ایک تازہ واقع بتلایا کہ اُسکی ملاقات ایک تعلیمیافتہ خوبصورت، جوان عورت زر نگار سے ہوئی ہے۔ زر نگار پارسی مذہب سے تعلق رکھتی اور آزادانہ ملتی رہتی ہے۔ اس پر پروفیسر صاحب نے کہا کہ وہی زر نگار تو نہیں جو ہمارے مکان کے نصف حصّہ میں رہتی ہے۔ عورت مہذب و شائستہ اور تعلیمیافتہ معلوم ہوتی ہے، خوبصورتی میں کبھی بمبئی میں اپنا جواب نہیں رکھتی،
ڈاکٹر نکولا۔ کیا وہ تھیٹر میں ایکٹ کریگی؟
مقبول حسن۔ اس معاملہ پر ابھی اُس کے ساتھ گفتگو نہیں ہوئی۔ چونکہ ہندوستان میں سٹیج کی حالت اچھی نہیں اس لئے ممکن ہے کہ وہ سٹیج پر آنا پسند نہ کرے۔
پروفیسر اور وہ مقبول حسن جیسے جوانِ رعنا پر ضرور مائل بھی ہوگئی ہوگی۔
مقبول حسن۔ ہاں۔ دل کو دل سے راہ ہے۔ میں پہلی نظر ہی میں گھائل ہوگیا ہوں، اُسکا دل پھیرنے میں شاید آپکی مدد لینی پڑے۔

اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی کہ سیکرٹری ایک تار لئے ہوئے کمرہ میں داخل ہوا۔
پروفیسر۔ یہ کس کا تار ہے؟
سیکرٹری۔ حضور مہاراجہ پرتاب چند والئے بلراج گڑھ کی طرف سے آیا ہے۔ آپ ہندوستان میں درجہ اول کے مہاراجگان میں سے ہیں۔ کینسر کا مرض ہے اور آپ کو علاج کے لئے بلوایا ہے۔ اس تار سے پیشتر میں اخبارات میں پڑھ چکا ہوں کہ ڈاکٹروں نے مرض کو لاعلاج تبلاتے

ہوئے صرف اپریشن کا مشورہ دیا تھا جو خطرہ سے خالی نہیں۔
پروفیسر۔ جواب لکھ دیجئے کہ میں وہاں نہیں جا سکتا۔ اگر اُنکو علاج کی خواہش ہے تو بمبئی میں خود تشریف لے آئیں۔
سیکرٹری۔ اخبارات میں اس مسئلہ پر آپ کے خلاف چہ میگوئیاں ہونگی۔ مالی نقصان کے علاوہ بدنامی بھی ہوگی۔
پروفیسر۔ مجھے یہ سب باتیں منظور ہیں۔ میں مقامی مریضوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔
سیکرٹری نے سر تسلیم خم کیا اور اپنے کمرہ میں واپس چلا آیا۔
لیکن اُس کا خیال صحیح ثابت ہُوا، دوسرے دن تمام اخبارات میں پروفیسر صاحب کے روکھے پھیکے جواب پر خوب لے دے ہُوئی بعض نے پروفیسر صاحب کو بُرا بھلا کہا۔ بعض نے اسکو درست ثابت کرنے کے لئے دلائل لکھے کہ ایک مریض کو دُکھ دینا سینکڑوں مریضوں کو رنج پہنچانے سے بہتر ہے۔

کہتے ہیں کہ محبت موت کی طرح سے آتی ہے اور ناگہانی آتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو مقبول حسن کی وارفتگی اور جوش محبت بالکل اچانک اور پہلی نظر کا نتیجہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ زرنگار بہ لحاظ شکل وصورت کے بمبئی میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ تعلیمیافتہ تھی، مہذب تھی، دولتمند تھی، شیریں گفتار وخوش مزاج تھی لیکن اتنی جلدی محبت میں گرفتار ہو جانا۔ اور ایسا گرفتار ہو جانا حیرت انگیز تھا۔ اُن کی ملاقات لب ساحل ایک شام غروبِ آفتاب کے وقت ہُوئی تھی یہ اتفاقیہ ملاقات چند گھنٹوں تک جاری رہی تھی اسکے بعد جب دوسری دفعہ ملاقات بازدید کے لئے مقبول حسن زرنگار کے مکان پر گیا تو اُسکو غیر حاضر پایا، اُسکے ملازمین سے معلوم ہُوا کہ وہ چند یوم کے لئے کہیں باہر چلی گئی ہے۔
یہ جُدائی کی گھڑیاں۔ یہ وقفہ مقبول حسن کے لئے سخت تکلیف دہ تھا۔ وہ بے چین تھا مضطرب تھا، تھیٹر کی چہل پہل، خلقت کا ازدھام، ایکٹروں کے پارٹ، اور ڈرامہ کے گانے اُس کی توجہ کو اپنی طرف جذب کرنے سے قاصر تھے، البتہ عشق ومحبت کے راگ اُسکے

لئے سرمایۂ حیات تھے، طبیعت کے بہلاؤ کے لئے ایک مشغلہ تھے لیکن اُنکو سنتے ہی دل بھر آتا، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے، سینہ سے آہ سرد نکلتی تھی، چند یوم کے بعد زرنگار پھر مقبول حسن کو تھیٹر میں ملی اُس نے بتلایا کہ وہ سورت کے ایک پارسی خاندان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ کچھ دنوں کے لئے بمبئی رہتی ہے اور کچھ عرصہ سورت میں قیام رکھتی ہے، اور یہ کہ اُس کے ماں باپ ایک جگہ زبردستی شادی کرنا چاہتے ہیں جو اُسے مرغوب نہیں، پھر اُس نے خود ہی درخواست کی کہ ہمیں جلدی شادی کرلینی چاہیئے یہ شادی کچھ عرصہ تک ہم خفیہ ہی رکھینگے پھر کوئی اچھا سا موقع دیکھ کر والدین کو اطلاع دیدونگی۔ البتہ میرا بمبئی میں آنا جانا صرف اسی طریقہ سے ہوگا جو پیشتر سے مقرر ہے۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قدر جلد فیصلہ کن گفتگو سے مقبول حسن کو کس قدر مسرت ہوئی، دوسرے دن زرنگار کے مسلمان ہونیکے بعد اُنکا نکاح پڑھا گیا۔

مقبول حسن وجیہ تھا، حسین تھا، مردانہ رعب داب رکھتا تھا، دولتمند تھا، اس پر آزادانہ زندگی بسر کرنیکا عادی تھا، مالکان تھیٹر کی رنگیلی زندگی آپ جانتے ہی ہیں، سیاہ پارسی فیشن کا لمبا کوٹ، سونے کے موٹے موٹے بارہ بٹن یا سونے کی زنجیر اور طلائی گھڑی، زنجیر میں طلائی سکے لٹک رہے تھے، سفید کالر، بند گلے کا کوٹ، سر پر سمور کی افغانی طرز کی ٹوپی، خوبصورت مونچھیں، سُرخ سفید کشادہ گول چہرہ، بلند قامت، بڑی بڑی رسیلی آنکھیں جن میں کسی قدر سرخی جھلکتی تھی، عورتیں دیکھنیں تو اُنکی توجہ کو جذب کرنیکی تاثیر رکھتا تھا، ابھی شادی بھی نہ ہوئی تھی، اخلاق اچھے تھے، لیکن پھر بھی وہ فرشتہ نہ تھا انسان تھا۔ البتہ زرنگار کے ملاپ اور اس فوری شادی سے اُسکی زندگی بدل گئی، گنہگاری، اوباشی وعیاشی کے خطرات ٹل گئے، وہ تمام خبیث طاقتیں جو اُسکے گردو پیش منڈلا رہی تھیں، یکسر فنا ہوگئیں، اب وہ کسی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا، زرنگار کیا ملی عصمت و پاکدامنی کی اکسیر ہاتھ لگ گئی، مقبول حسن اکثر پروفیسر سے اپنی چہیتی بیوی کے خفیہ نکاح اور زبردست محبت کا ذکر کیا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ تمہاری کرایہ دار زرنگار میرے جسم و جان بلکہ روح کی مالک ہے۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ تمہاری ملاقات سے پس و پیش کیوں کرتی ہے۔ اس معاملہ میں اسکو بڑی ضد ہے۔ پروفیسر نے مسکرا کر کہا کہ وہ عفت وعصمت اور شرم وحیا رکھتی ہے تم اُسکو ایسی بے شرمی پر مجبور نہ کیا کرو۔ اُس نے تمہاری خاطر اپنا مذہب اور والدین تک کو چھوڑ

دیا ہے۔ تمہیں اُسکی خواہشات اور جذبات کا لحاظ کرنا چاہیئے۔ میری دلی خواہش تھی کہ تم جو میرے عزیز دوست ہو تھیٹر کی پُرخطر زندگی میں اپنی جوانی، خوبصورتی اور پاکدامنی کو بٹہ نہ لگالو۔ خدا کا شکر ہے کہ میری مراد برآئی اور اب میں تمہارے مستقبل کی طرف سے بالکل بے فکر ہوں۔

مقبول حسن پر پروفیسر کی محبت کا پہلے ہی زبردست اثر تھا۔ اب اُس کی پُرنم مقناطیسی آنکھوں سے ایک جذب ایک وجدانی کیفیت ایک شعاع نور، ایک تسلسل۔ ایک مدوجزر نکلتے دیکھ کر مقبول حسن کا دل سینہ میں دھڑکنے لگا۔ اُس نے بے اختیار ہوکر پروفیسر کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر ایک بوسہ دیا۔ جسکے بعد کمرہ میں کچھ عرصہ تک کامل خاموشی طاری رہی۔ اور بالآخر اس سکوت کو مقبول حسن کی آواز نے توڑا۔

مقبول حسن۔ مردوں میں، پروفیسر صاحب، میں آپکو سب سے عزیز رکھتا ہوں، عورتوں میں زرنگار کے سوا مجھے کسی سے اُلفت نہیں، ایسے دو دوستوں کے حلقہ میں اگر میں انسان فرشتہ بن کر اپنی زندگی بسر کروں تو مجھے اس سے کون روکنے والا ہے۔ لیکن حسرت یہ ہے کہ ہم تینوں اکٹھے کبھی نہیں ہوتے۔

پروفیسر یہ سُن کر مُسکرایا۔ اور اس مسکراہٹ میں ایک مسرت اور اطمینان کی جھلک ملی ہُوئی تھی، مگر ساتھ ہی اُسکی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بھی گر رہے تھے۔

بالآخر مہاراجہ پرتاب چند بمبئی میں علاج کی غرض سے تشریف لائے، اخبارات نے آپکی تصویر اور سوانح حیات شائع کرتے وقت پروفیسر صاحب کی تصویر اور حالات بھی لکھے، چند روز زیر علاج رہنے پر مہاراجہ صاحب کو صحت کلی حاصل ہُوئی اور اُنہوں نے غسل صحت کیا۔ مہاراجہ صاحب نے پروفیسر صاحب سے معاوضہ کے متعلق بات چیت کی لیکن پروفیسر صاحب نے انکار کر دیا۔ مگر بہت اصرار و تکرار کے بعد آپ نے کہا کہ جو کچھ آپ بطور انعام دینا چاہتے ہوں وہ میرے عزیز دوست مقبول حسن پروپرائٹر دی گلوب تھیٹریکل کمپنی کو بھجدیجئے۔ چنانچہ اُسی روز تین لاکھ روپیہ کا چک مسٹر مقبول حسن کو ملا۔ جسے وہ دیکھ کر سخت حیران ہُوا اور سیدھا استفسار حال کے لئے پروفیسر صاحب کے پاس پہنچا۔

پروفیسر۔ یہ میری طرف سے زرنگار کی شادی کا جہیز ہے۔

مقبول حسن۔ گویا آپ کو ہر گھڑی میری ہی امداد و اعانت کا خیال رہتا ہے۔ میرے پاس کافی

روپیہ ہے اور مجھے زیادہ کی حاجت نہیں۔

پروفیسر۔ نہیں اسکو قبول کیجئے، ورنہ میری ناراضی کا باعث ہوگا۔

چارو ناچار مقبول حسن کو یہ چک قبول کرنا پڑا۔ وہ اس وقت مارے خوشی کے جامہ میں پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں دولت، خوبصورت بیوی، تندرستی اور بہترین اخلاق کا مالک ہے اس سوچ بچار میں وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچا کہ اس میں ایک اولاد کی ابھی کمی باقی ہے۔ چنانچہ ایک دن ہنسی مذاق میں مقبول حسن نے پروفیسر صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ کسی روح سے معلوم کر سکتے ہیں کہ میرے ہاں اولاد کب تک ہوگی؟

اس سوال کو سُن کر پروفیسر کا بارعب چہرہ، اور تیز و تند مجسم آنکھیں یکسر بدل گئیں، وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا، چہرہ پر موت کی سی زردی و سیاہی پھیل گئی، آنکھوں سے نور کافور ہو گیا۔ پروفیسر نے دونوں ہونٹ زور سے کاٹے اور ایک سرد آہ کھینچی۔ پھر دیوانوں کی طرح کمرہ میں جلدی جلدی ٹہلنے لگا۔ پھر ایک چکر کھا کر اپنی کرسی پر دھم سے گر پڑا۔

سیکرٹری کی مدد سے مقبول حسن پروفیسر صاحب کو ہوش میں لانیکی کوشش کرتے رہے جس میں کامیابی ہوگئی۔ اُس وقت جو الفاظ پروفیسر کی زبان سے نکلے وہ یہ تھے۔

"غلطی اور اُسکا خمیازہ، غلطی اور اُسکا خمیازہ، قربانی، دوستی، محبت، انسانیت میں سوچونگا، میں غور کرونگا،

پروفیسر کو بنخوبی ہوش آگیا تو اُس نے مقبول حسن سے کہا،

دوست، میں تمہارے سوال کا جواب سوچ سمجھ کر دونگا، تمکو معلوم نہیں، یہ معاملہ ذرا پیچیدہ تھا۔ لیکن میں خود ہی اسکے متعلق تمہیں جواب دونگا اور تم آئندہ کبھی مجھ سے یہ سوال نہ کرنا۔

پروفیسر صاحب کی اس سوال پر یہ حالت دیکھ کر مقبول حسن کے ہوش اُڑ گئے، وہ ملول و حزین گھر پہنچا۔ اور اس معاملہ پر جس قدر زیادہ غور کرتا تھا اُسی قدر اُسکو پیچیدہ پاتا تھا۔

زمانہ کو کسی پہلو آرام نہیں آتا، ہر گھڑی ایک نیا انقلاب ساتھ لاتا ہے، مقبول حسن و زرنگار کے تعلقاتِ زوجیت محبت اور عشق تک پہنچ چکے تھے، لیکن اس دورِ راحت و سکون میں ایک ٹیلیفون کی آواز بم کے گولے کی طرح سے گری جس نے مقبول حسن کی امید و امن کے قصر کو جلا کر راکھ کر دیا

زرنگار اسپتال میں بیہوش پڑی ہے۔ اسکی موٹر ایک موٹر سے ٹکرا گئی ہے، اُسکی حالت نازک ہے،" یہ خبر بجلی کی طرح سے مقبول حسن کے اثر حیات پر گری، اُسکے ہوش و حواس رخصت ہو گئے، کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، چہرہ پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے اُٹھا، اسکا جسم پتھر کی طرح سے وزنی اور بھاری بھرکم ہو گیا تھا۔ موت اُسکی آنکھوں کے سامنے پھر گئی تھی، وہ اُفتاں و خیزاں اسپتال میں پہنچا۔ معلوم ہُوا کہ اپریشن ہو رہا ہے۔

یہ انتظار کی گھڑیاں سخت مصیبت ناک تھیں۔ مقبول حسن بالکل مدہوش بیٹھا رہا۔ دو گھنٹہ کے بعد ڈاکٹر کی آواز سے چونک پڑا جو اُسکے شانے پر ہاتھ رکھے نرم آواز سے کہہ رہا تھا۔

زرنگار پر عمل جراحی کامیابی سے ہُوا ہے، اُسکے تمام اعضا اور جسم ضرر سے محفوظ رہیگا دماغ پر زیادہ صدمہ پہنچا تھا۔ اسکو کامل آرام کی ضرورت ہے کم از کم تین ہفتہ تک اُس سے تمہاری ملاقات ناممکن ہے۔ ورنہ اُنکی زندگی کو اس سے خطرہ ہوگا۔ سُنا مائی ڈیئر۔ صبر اور حوصلہ۔"

مقبول حسن بچوں کی طرح سے رونے لگا لیکن یہ رونا دھونا فضول تھا۔ قہر درویش بر جانِ درویش بادلِ ناخواستہ اُٹھا اور موٹر میں بیٹھ کر گھر کو سدھارا۔

ساڑھے تین ہفتہ گذر گئے۔ اسپتال کے انچارج نے مسٹر مقبول حسن کو ملاقات کی اجازت بخشی۔ مردہ کو زندہ کر دکھایا۔ وہ فوراً اسپتال میں پہنچا۔ اس وقت زرنگار کی حالت عجیب ہو رہی تھی اُسکے چہرہ پر وحشت و تفکرات کی جھلک عیاں تھی۔ مقبول حسن نے گھبرا کر طبیعت و مزاج کی کیفیت پوچھی۔

زرنگار۔ آج کیا تاریخ ہے؟

مقبول حسن۔ اٹھائیس۔

زرنگار۔ اور یہ حادثہ کس تاریخ کو ہُوا تھا؟

مقبول حسن۔ گذشتہ مہینہ کی تیس تاریخ کو۔

زرنگار۔ افسوس! کیا تم ان دنوں پروفیسر منصور احمد سے ملے ہو؟

مقبول حسن۔ وہ حسب معمول پندرہ دن کے لئے ایسے غائب ہُوئے کہ اس دفعہ ابھی تک

تشریف نہیں لائے۔ اُنکا سیکرٹری بھی حیران ہے، اور اہل بمبئی بھی اس غیر حاضری سے تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔

زرنگار۔ آہ! پروفیسر کو مرے پورے پندرہ دن ہو چکے ہیں۔

مقبول حسن۔ کیا بہکی بہکی باتیں کرتی ہو، تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ شاید ابھی اس صدمہ سے طبیعت پورے طور پر بحال نہیں ہوئی، کیا پروفیسر صاحب خواب میں اس جگہ تمکو ملے تھے۔

زرنگار۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ میں جس طرح کہتی ہوں اُسی طرح کرو، پروفیسر صاحب کے کمرہ میں جاکر اُنکی کرسی کے نیچے آپکو ایک بٹن فرش پر ملیگا۔ اُسکو دبانے سے ایک راستہ زمین دوز دکھائی دیگا۔ اس راستہ سے نیچے جائیے گا تو اندر ایک وسیع کمرہ پاؤگے جس سے سخت بدبو آرہی ہوگی اور اسی میں پروفیسر مرحوم کی لاش ہوگی جس کا کفن دفن کرنے کے بعد پھر مجھے ملوگے تو تمام واقعہ کی اصل کیفیت سناؤنگی۔

زرنگار کی باتوں سے مقبول حسن کو صداقت ٹپکتی نظر آئی۔ چنانچہ وہ اُسی وقت پروفیسر صاحب کے مکان پر پہنچا اور سیکرٹری کو ہمراہ لیکر مطابق نشانات کے لاش کو تلاش کرنے لگا، جوکچھ زرنگار نے کہا تھا وہ حرف بہ حرف درست نکلا۔ لاش کی حالت سخت خراب ہو رہی تھی، پولیس۔ اور ڈاکٹروں نے لاش کا معائنہ کیا اور موت کو طبعی قرار دیا۔ شام کے وقت بڑے تزک و احتشام سے جنازہ اُٹھایا گیا۔ بیس پچیس ہزار آدمی جنازہ کے ہمراہ تھے، شہر بھر میں ہڑتال ہوگئی، اخبارات نے اپنے کالم اس موت کے غم میں سیاہ کر دیئے تھے۔

مرحوم کے کاغذات دیکھنے پر وصیت نکلی جس سے معلوم ہوا کہ تمام جایداد قیمتی پچیس لاکھ روپیہ کی مالک زرنگار نامی ایک پارسی لیڈی ہے۔ اگر وہ زندہ نہ رہے تو اس روپیہ کا مالک مقبول حسن ہے۔ اسکے علاوہ ایک لاکھ روپیہ سیکرٹری اور دوسرے ملازمین کے لئے علیحدہ تھا۔

وصیت نامہ کو پڑھ کر مقبول حسن سخت متعجب ہوا، وہ تمام واقعات پر ایک غائر نگاہ ڈالتا تو سخت حیران ہوتا تھا۔ کیا زرنگار پروفیسر کی بیٹی ہے؟ یا اُسکو پروفیسر سے اور کوئی رشتہ ہے؟ کیا پروفیسر نے صرف مقبول حسن کو یہ فائدہ پہنچانے کی غرض سے وصیت کی تھی؟ زرنگار

کو بستر علالت پر کیسے معلوم ہُوا کہ پروفیسر مرچکا ہے؟ زرنگار و پروفیسر کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوئے پھر اُن پر ایسے راز کے معاملات پر کب گفتگو ہُوئی، ان تمام سوالات کا جواب دینے سے وہ خود بھی قاصر تھا اور پروفیسر صاحب کا سیکرٹری بھی لاعلمی کا اظہار کرتا تھا۔ مقبول حسن موٹر پر سوار ہوکر سیدھا زرنگار کی طرف جارہا تھا کہ اس غم و اندوہ کی گھڑی میں اُسکو پچیس لاکھ روپیہ کے مالک ہونے کی خوشخبری سُنادے۔ اسپتال میں پہنچتے ہی مقبول حسن نے کہا۔ کیا تمہیں مرحوم پروفیسر کی وصیت کا بھی علم ہے
زرنگار۔ ایک لاکھ ملازمین کے لئے لکھا ہوگا اور پچیس لاکھ میرے نام، اگر میں بھی مرجاؤں تو تم اس روپیہ کے مالک ہو، میں تمکو اس دولت کے مالک ہونیکی مبارکباد دیتی ہوں۔
مقبول حسن۔ یک نہ شد دو شد۔ تمکو ان تمام امور کا کیسے علم ہُوا
زرنگار۔ اگر تم قسم کھاؤ کہ اس راز کا ابھی افشا نہ کروگے؟ تو میں بتا سکتی ہوں۔
مقبول حسن۔ تمہارے سر کی قسم مجال ہے جو ایک لفظ بھی کبھی زبان پر آئے۔
زرنگار۔ تو سُنئے۔ پروفیسر صاحب مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں؟
مقبول حسن۔ زندہ ہیں! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ذرا خدا را تفصیل سے کہو
زرنگار۔ میں ایک ایسی عورت کا جسم ہوں جس کا نام چاند بائی تھا۔ میں ایک معزز پارسی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ کچھ عرصہ گذرا مجھے ایک بردہ فروش سورت سے اڑا کر بمبئی لایا اور یہاں فروخت کرنا چاہا۔ اتفاق سے پروفیسر صاحب کو تجربہ کے لئے ایک خوبصورت اور تندرست عورت کی تلاش تھی۔ اُنہوں نے مجھے خرید لیا۔ اسکے بعد اُنہوں نے میری روح نکال کر ایک مردہ پرندہ میں ڈال کر اُسکو اُڑا دیا۔ جیساکہ ہندوستان کے اکثر کامیاب جوگی اپنی روح طوطا مینا میں ڈال کر دکھاتے تھے تم نے اکبر وغیرہ کے عہد کے واقعات تاریخی کتب میں دیکھے ہونگے۔ میرے اس جسم کو آپ ایک ایسے کمرہ میں رکھتے تھے جو سائنٹیفک طریقوں سے بنایا گیا تھا۔ کمرہ میں کئی قسم کی ادویات اور خوشبوئیں رکھی جاتی تھیں۔ جس سے جسم پندرہ دن تک ہر قسم کی خرابیوں سے محفوظ رہتا تھا۔ پروفیسر صاحب پندرہ دن تک تو بطور پروفیسر کے مرد کی حیثیت میں کام کرتے تھے۔ اسکے بعد لوگوں کو کہتے کہ وہ گوشۂ تنہائی میں پریکٹس کرنے جاتے ہیں۔ اُس وقت آپ اس تہ خانہ میں آکر لیٹ جاتے اور اپنی روح اس جسم میں داخل کرتے جس کا نام اُنہوں نے زرنگار رکھ چھوڑا تھا۔ اور پندرہ

دن تک وہ برابر ایک عورت کی حیثیت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ کیا تمہیں میں صرف اُنہی دنوں میں نہ ملتی تھی جب کہ پروفیسر صاحب کنج تنہائی میں جاتے تھے؟

مقبول حسن۔ یہ صحیح ہے۔

زر نگار۔ اس وقت بھی میرے جسم میں پروفیسر کی روح موجود ہے اور جو کام پروفیسر صاحب کرتے تھے وہ میں بھی کرسکتی ہوں، صرف اس قدر فرق ہے کہ وہ مرد کی زندگی تھی یہ عورت کی ہے۔ پندرہ دن تک بطور زر نگار رہنے کے وہ پھر اُسی جگہ جاکر اپنی رُوح اپنے جسم میں داخل کرتے، اور زر نگار مُردہ سی بن کر لیٹ جاتی تھی۔ اب بھی اگر میں چاہوں تو کسی نوجوان آدمی کی روح نکالکر اُس میں حلول کرسکتی ہوں اور دُنیا میں یہ دوہری زندگی اچھی طرح سے انجام دے سکتی ہوں۔ تمکو یاد ہوگا کہ تمہارے اولاد کے سوال پر پروفیسر کی حالت کیسی دگرگوں ہُوئی تھی، اُسکا باعث یہی تھا کہ پروفیسر نے صرف یہی غلطی کھائی تھی کہ اُسکو یہ عمل کرتے وقت خیال نہ آیا کہ حاملہ ہو جانے کی صورت میں پندرہ دن تک جسم کو اس حالت میں چھوڑ دینے سے بچہ ضرور مرجائیگا

مقبول حسن۔ اچھا یہ بات تھی۔

زر نگار۔ پروفیسر کو تم سے بچپن سے محبت تھی، اُسکو دوستی کا پاس تھا۔ تمہاری بہتری کا ہمیشہ طالب تھا۔ اول اُس نے بذریعہ ہپناٹیزم تمہاری طبیعت کو درست بنایا۔ تم سے عاداتِ بد ترک کرادیں۔ پھر تمہارے لئے ایک خوبصورت بیوی مہیا کی، اور اب تمام دولت بھی تمہارے ہی لئے چھوڑ مرا ہے۔ گویا پروفیسر اپنی اس حیاتِ ثانی میں بھی تمہاری برابر امداد و اعانت کررہا ہے

مقبول حسن۔ دوستی و محبت کی یہ ایک ایسی مثال ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے لیکن کیا اب تم مردانہ زندگی کو بالکل ہی ترک کردو گی؟

زر نگار۔ بے شک۔ تم جانتے ہو کہ دُنیا میں سب سے شریف ترین جذبہ۔ جذبۂ محبت ہے۔ پاکیزگی میں کوئی چیز اس کی ہمسری و برابری نہیں کرسکتی۔ ہپناٹیزم بھی قوتِ خیال ہے۔ لیکن یہ بھی جذبۂ محبت ہی سے ترقی پکڑتی ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو دنیا میں محبت کرنیکا دعوٰی ہے۔ میں نے بہ حیثیت مرد کے اپنی بیوی سے ایک زمانہ میں بڑی محبت کی تھی، اور میرا خیال تھا کہ مجھ سے زیادہ دُنیا میں کوئی شخص بیوی سے محبت نہیں کرتا۔ اور ایک مدت

تک میں اس خیال پر قائم رہا۔ یہاں تک کہ میری بیوی فوت ہوگئی اور میں نے اسکی یاد میں دوسری شادی تک نہ کی۔ لیکن اپنی زندگی کے اس دوسرے دَور میں جو بہ حیثیت عورت کے میں نے بسر کی ہے اور میں نے تم سے رشتۂ محبت جوڑا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ مرد اُس محبت کا باوجود اس قدر دعوے کے ہزارواں حصّہ بھی اپنے سینہ میں نہیں رکھتے جس قدر عورت رکھتی ہے اس شریف جذبہ کی صحیح معنوں میں سوائے عورت کے اور کوئی بہترین مظہر نہیں۔ اس بار کو وہی خوبی وخوش اسلوبی سے اُٹھاتی ہے۔ اور میں اس محبت کے صحیح جذبات عالیہ کو کسی صورت میں ترک نہیں کرسکتی۔ محبت عورت کے لئے ہے اور عورت محبت کے لئے خدا نے محبت صرف عورت کے لئے پیدا کی تھی۔ ہپناٹیزم یا روحانی کششِ مقناطیسی کی آخری منزل محبت ہے، اور میں ماہر علم کششِ مقناطیسی ہوں۔ اور اس آخری منزل سے صرف اسی صورت میں بہرہ اندوز ہوسکتی ہوں، چنانچہ اس وقت مجھ میں پروفیسر سے بھی زیادہ قوتیں موجود ہیں۔ اور ان تمام باتوں کے باوجود پروفیسر اس حیات ثانی میں اپنے عزیزدوست کی خدمت میں برابر مصروف ہے۔ جو کچھ میں باتیں کررہی ہوں، تم نہیں سمجھ سکتے، کیونکہ تم مرد ہو، تم کو بھی دعوے محبت ہے۔ لیکن عورت کی محبت، یہ بہت بڑی محبت ہے۔ سنو۔ سنو۔ تم کو اپنے دعوے محبت کو عورت کے دعوئے محبت کے سامنے کبھی پیش نہ کرنا چاہیئے، اس جذبہ کو صرف میں ہی سمجھ سکتی ہوں۔

زرنگار باتیں کرتی جاتی تھی اور مقبول حسن حیرت سے اُس کا مُنہ دیکھ رہا تھا ؏

یوسف حسن

نیاز بحضورِ ناز

خداوند! اک لڑکھڑائی ہوئی زبان۔ اک تکلم کے زور سے قاصر گویائی۔ اگر تیرے لطف و احسان تیرے اکرام و عطایا کو حسن طلاقت کے ساتھ شمار نہیں کرا سکتی، تو کیا اے پردہ پوش مالک تو اُسکے اس اقرارِ عجز، تو اُسکے اِس اعترافِ قصور کو اپنی قبولیت و رضامندی کی چادر میں نہیں ڈھانپ سکتا؟

اے مالک! اک پاشکستہ و بے کیف قلم، ہاں اک ایسا قلم جو نیرنگِ جمال کی نت نئی کرشمہ آرائیوں کے بیان سے عاجز، اور اسکے اظہار کی قابلیت نہیں رکھتا وہ اگر تیری مہربانیوں کے نشرِ کامل سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ تو اے مسکین نواز! تو اسکی اس شرم، تو اُسکے اس رقیق انفعال کو اپنی بندہ پرور پسندیدگی سے سرفراز نہیں فرما سکتا!

اے تو وہ کہ جو شُستگیٔ زبان اور شگفتگیٔ بیان کی نسبتوں سے بلند اور طلسمِ ستائش و نیایش سے مُستغنی ہے!

اے وہ تو کہ جو گداز ترنم اور شوخیٔ تکلم سے بے نیاز اور مسرتِ مدح و تلخیٔ ذم سے بے پروا ہے مجھے بتا تو آخر تو کیا ہے؟

اے آقا! کاش کبھی تو مجھے تیرے حضور میں باریاب ہونا نصیب ہو جاتا اور میں اپنی ملکیت سے معمور طرزِ بیان سے تیرے لاہوتی ہونٹوں پر اک خفیف سا تبسم پیدا کر دینے میں کامیاب ہو جاتا!

آقا! مجھے آرزو یہی رہی کہ کسی طرح میں اپنی فرصتوں کا خلاصہ۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے قلم کی چند لکیریں، اپنی بندگی کے چند نقوش، تیرے حضور پیش کر دیتا!

مالک! میری لکنت یوں ہی پھول کترتی رہی،

میرا قلم یونہی بیکار و بے کیف جنبش کرتا رہا میری ساری عمر یونہی انتظار میں گم صم گذر گئی۔

اے آقا! کیا مطمئن ہو جاؤں کہ تو کبھی نہ کبھی ضرور آئیگا۔ اور میری یہ سب کچھ سُن لیگا!

کیا میں اپنے دن ان ہی انشا ہائے خوش میں بسر کر کے اپنی رات کو بھی تیری تعریف کے مشغلۂ لطیف میں کاٹ دوں، اور اپنے دھیان کو تیری ہی یاد کی آغوش میں تھکا تھکا کے چھوڑ دوں۔ اے مالک!!

خلیقی

شبِ ماہتاب

مہرِ جہاں فروز نے رُخ پہ جو لی نقابِ شام — بامِ سپہر پر ہُوا جلوہ فگن مہِ تمام
چشمۂ نور اُبل پڑا۔ دامنِ چرخِ پیر میں — مَوجِ ضیا نہیں ہے یہ جوش ہے جُوئے شِیر میں
تارِ شعاع نے عجب مژدۂ جانفزا دیا۔ — ذرّوں کو جگمگا دیا۔ دل کا کنول کِھلا دیا
دامنِ کوہ و دشت پر بچھ گیا فرش نور کا — چشمِ نظارہ باز میں۔ جلوہ ہے برقِ طور کا
زرّیں ہیں سقف و بام و در چمکے ہیں سب شجر حجر — جس طرف اُٹھ گئی نظر۔ رنگ طِلا ہے سربسر
پھیلی ہے روئے خاک پر سیمِ رقیق کی بساط — وقت ہے میکشی کا یہ ساعت گرمیٔ نشاط
سیرِ چمن کا لُطف ہے صحبتِ خاص کا مزا — تازہ مشامِ جاں بھی ہو۔ دل بھی ہو لذت آشنا
یا ہو کنارِ آبِ جُو۔ پانی میں عکسِ ماہ ہو — ساتھ ہو ماہرو کوئی۔ دونوں طرف نگاہ ہو
منظرِ جاں نواز ہے۔ چاندنی رات کا عجب — خُنکی ہے مَوجِ باد میں۔ دل میں ہے گرمیٔ طرب

موجوں میں اضطراب ہے جوش پہ سیلِ آب ہے
تیرے جمال میں کشش، اے مہِ جلوہ تاب ہے

ماہِ دو ہفتہ! تو کوئی چشمۂ نور خیز ہے — تیری شعاع جلوہ زا۔ موجِ سرور خیز ہے
روشنی بخش شش جہت گوہرِ شب چراغ ہے — یا تو شرابِ نور کا۔ زرّیں کوئی ایاغ ہے
تابشِ مہرِ نیمروز کتنی تھی اُف نظارہ سوز — تیری تجلیاں مگر کیسی ہیں باصرہ فروز
تاروں کی جلوہ پاشیاں کیوں نہ ہوں تیرے آگے ماند — اختر ضو فروش وہ۔ اور تو چودھویں کا چاند
حُسن میں بے بدل ہے تو اس میں کسے کلام ہے — خوبی و خوبصورتی رُخ پہ ترے تمام ہے
تیری نگاہ میں نہیں شاہ و گدا کا امتیاز — جلوہ نمائیاں تری سب کے لئے ہیں جاں نواز
ایک سا تیرا نور ہے دشت میں سبزہ زار میں — قصرِ گہر نگار میں۔ حجرۂ تنگ و تار میں

زخمیٔ خنجرِ الم گو ہے مرا دلِ طپاں — اے مہ نیم ماہ! تو شوق سے ہو نمک فشاں
لطف جراحت اور بھی خستہ و زار کو ملے — چاندنی رات میں کوئی سیر ہو تازہ گل کھلے

تیرے فروغِ حسن سے روکشِ روز رات ہے
آج تو تیرے سامنے جلوۂ مہر مات ہے

برق دہلوی۔ بی۔ اے۔

کوہ ایورسٹ سے خطاب

بے قافیہ

تو اوجِ عرش کا ہمسر ہے اے بلند پہاڑ! — کہ تیرے نام سے رفعت کو چار چاند لگے
تو مستجاب دعاؤں کا ایک زینہ ہے — کہ فرش و عرش میں تیرا وجود شامل ہے
گرفتِ فکر سے برتر ہے جب تری رفعت — محال ہے کسی انساں کا واں قدم جمنا
تو ہے وہ بستی جو حق کے قریب بستی ہے — مجھے بتا دے کہ قربِ حبیب کیا شئے ہے
مجھے بتا تو سہی۔ کیا کبھی وہ راتوں رات — تری بلندی پہ جلوہ فروز آ کے ہُوا
عجب نہیں جو تیری وادیوں میں رہتا ہو — کہ سیر چھپ کے کرے اُن سے اپنی قدرت کی
ہماری دید کا وہ ہم سے کم نہیں مشتاق — کہ آگ دونوں طرف عشق کی فروزاں ہے
وہ دیکھتا ہے پرندوں کو آشیانوں میں — گھروں میں وادیٔ دریا کے پاس آدم زاد
نشیب و دامنِ کہسار میں پرندے ہیں۔ — جو دام و دد ہیں وہ رہتے ہیں خاص گلوں میں
فضائے عرش پہ ہوتا ہے نور پاش کبھی — کبھی وہ فرش پہ چٹکا رہا ہے غنچوں کو
خدا نے تجھ کو بنایا ہے لامکاں کا بدل — وہ تیرے بام پہ آتا ہے ضو فشاں ہونے
دکھا دکھا تو سہی کوئی اس کا نقشِ قدم — جو تیرے سینۂ بلّور پر فروزاں ہو
جو تیری چوٹی کو اُس نے ضیا یہ بخشی ہے — ستم ہے اُس پہ اگر مائل خرام نہ ہو

خدا کی شان ہویدا ہے تیری رفعت سے
خدا کا عزم ہے مستور تیری ہیئت میں

مجال آدمی زادے کو ہو نہیں سکتی
کہ تیری چوٹی کی برفوں کو پائمال کرے

فرازِ چرخ پہ کیا آشنائے جلوہ ہے
تو دستبرد گنہ سے ہے بے دریغ آزاد

بتا بتا تو سہی چیز کیا ہے معصومی
رہیں تو کیونکہ رہیں خواہشوں سے بالاتر

ہے تیرے اوج سے شان و شکوہِ حق ظاہر
کہ تیرا نام ہی مشہور گوری[1] شنکر ہے

وتستہ پرشاد فدا بی۔ اے

جذبات عالیہ

گرامی

چشم مست سیہ مستے دل ہست سیہ کارے
دردے بجگر دارد بیمار ز بیمارے

از عشق بگو با من یا شیخ چہ میگوئی
ہر کارے و ہر مردے ہر مردے و ہر کارے

آں پردہ نشین در سیر آمد بسرِ بامے
دیوار بامیدے اُمیّد بدیوارے

از یکدگر اے اُستاد دل دُزد و دلآویز ست
رفتار ز گفتارے گفتار ز رفتارے

گفتم کہ نمی آئی آرے و نعم گوید
انکار در اقرارے اقرار در انکارے

اے عقل چہ تدبیرے اے ہوش چہ افسونے
شد رہزن ایمانم آں سادۂ پُر کارے

در بتکدہ رفت آں شیخ بیخود شد و نشناسد
زُنّار ز تسبیحی تسبیح ز زُنّارے

از چشم ہمہ دردم از گوش ہمہ داغم
چشمے ست سرراہے گوشے ست بدیوارے

تمہید و فا سنجان خار یست تہ پائے
اُمید ہوس کوشان گل بر سرِ دستارے

آنجا کہ بود قہرش ہر شہر بیابانے
آنجا کہ بود عفوش ہر ذرہ گنہگارے

بے پردہ بہم یکجان در پردہ نفاق اندیش
تسبیح ز تسبیحی زُنّار ز زُنّارے۔

ہاں جرم گرامی نیست جز کاہلی و پیری
دیرینہ غلامے را مفروش ببازارے

[1] مونٹ ایورسٹ کا ہندی نام ہے۔

حسرت موہانی

اگر شوق کی رہنمائی نہ ہوگی
تو اُن تک ہُوئی ہے رسائی نہ ہوگی

شبِ ہجر کیونکر کٹے گی جو یارب
تصوّر کی راحت فزائی نہ ہوگی

بغیر اُن کے دم بھر نہیں چین دلکو
کبھی اُن سے گویا جُدائی نہ ہوگی

پڑے گی نظر تیری کا ہیکو ہم پر
اگر برسر دلربائی نہ ہوگی

خرد کے لئے مایۂ فخر ہوگا
دیارِ جنون کی گدائی نہ ہوگی

رہے عشق سے رُوح مانوس ہوکر
اب اس دامِ غم سے رہائی نہ ہوگی

ترا وہم ہوگا، سرِ بزم ہم نے
کبھی آنکھ تجھ سے لڑائی نہ ہوگی

وہ بگڑے ہیں تو من بھی جائینگے آخر
لڑائی ہُوئی ہے صفائی نہ ہوگی؟

ستم کرکے ناحق وہ نادم ہیں حسرت
کہ ہم سے کبھی بے وفائی نہ ہوگی

شایق

بزم میں بیٹھے ہیں وہ شاملِ اعدا ہوکر
میں تماشا نہ بنوں محوِ تماشا ہوکر

کوئی بیٹھے تو سہی انجمن آرا ہوکر
خود ہی مِٹ جائینگے ہم محوِ تماشا ہوکر

اب وہ دشمن سے ملینگے نہ ملینگے مجھ سے
آرزو پوری ہُوئی خون تمنا ہوکر

حُسن کا دَور ہے اب آنے تو دو عشق کا دَور
قیس لیلیٰ کو نظر آئیگا لیلیٰ ہوکر

کس سے روشن ہے مری چشمِ تصوّر شبِ غم
رُک گئی سینے میں فریاد تمنا ہوکر

دل کے پردے میں ہے اک حسن کا عالم مستور
اک ذرّہ نے دکھایا مجھے دنیا ہوکر

کس کی فرقت میں یہ رویا ہوں کہ دل آنکھوں سے
بہ گیا اشکِ تمنا میں تمنا ہوکر

ٹوٹنے دو کہ نیا بنتا ہے آئینۂ دل
وقفِ بیدادِ بتِ آئینہ سیما ہوکر

رحم کر قیس پہ تابندہ ہوا اے اخترِ قیس
پرتوِ نقشِ خیالِ رخ لیلیٰ ہوکر

چھیڑ محفل میں نئے دور کی باتیں شائق!
ذکرِ امروز نہ کر شاعرِ فردا ہوکر